دلّی کی چند عجیب ہستیاں
اشرف صبوحی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشرف صبوحی دہلوی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

DILLI KI CHAND AJEEB HASTIAN
BY
ASHRAF SABOHI
(PRICE Rs.51/=)

تقسیم کار:

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

دوسری بار ۱۹۸۹ء | تعداد 750 | قیمت: =/51

برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

انتساب

میں اپنی اس کم مایہ ادبی کوشش کو محسنِ اُردو عالی جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق (ڈی۔ لٹ) مدظلہ العالی کے اسم گرامی پر معنون کرنے کا فخر حاصل کرتا ہوں جن کی مساعیِ جمیلہ نے اس پُر آشوب زمانے میں زبان اُردو کو عُروج و فوقیت بخشی ہے اور جن کی لازوال خدماتِ فائقہ ہمارے ملک کی "لنگوافرنیکا" (اُردو) کی تاریخ میں ہمیشہ عظمت و احترام کے جذبات کے ساتھ یادگار رہیں گی۔

اشرف صبوحی دہلوی

فہرست مضامین

بھائی ولّی — ایک تعارف

سات برس کے بچّے کی بساط ہی کیا، مگر ایک ہی دفعہ کے جانے سے پھوپھی کی شفقت نے کچھ ایسا اثر کیا کہ چُپ چاپ تن تنہا اُن کے گھر جانے کی تیاری کرلی۔ یہ تو معلوم ہی تھا کہ جامع مسجد سے بجلی کی ٹرام اُدھر جاتی ہے مگر سوال کرایے کا تھا۔ یہ مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ ماں سے دو پیسے لے لیے۔ اب کوئی مرحلہ باقی نہیں رہا۔ چوڑی والان سے نکلے، جامع مسجد آئے، ٹرام میں بیٹھے، فتح پوری پہنچے اور ٹہلتے ٹہلتے پھوپی کے گھر کھاری باولی پہنچ گئے۔ مردانے مکان سے گزرے۔ زنانے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ مگر اب اندر کیسے جائیں اور کیا کہیں۔ ڈیوڑھی بھی ایسی کہ کوئی بھی گزرے تو ادبدا کر نظر پڑے۔ اسی الجھن میں کھڑے تھے کہ ایکا ایکی خود پھوپی اِدھر آگئیں۔ ایں میاں تم۔ کس کے ساتھ آئے۔ کب آئے اُدھر تابڑتوڑ سوال اِدھر خاموشی۔ پھوپی نے ہاتھ پکڑا۔ اندر لے گئیں۔ کہنے لگیں۔ میاں اس طرح گھر سے اکیلے نہیں آتے۔ تمھاری اماں کتنی پریشان ہوں گی۔ آنا تھا تو کسی کے ساتھ آتے۔ فوراً آدمی دوڑایا گیا کہ بچہ یہاں آگیا ہے۔ شام کو مٹھائی کی ٹوکری ساتھ کی گئی اور سات سالہ میاں ولّی اشرف خیر سے اپنے گھر پہنچے۔ گئے تھے روزے بخشوانے اُلٹی نماز گلے پڑ گئی۔ بات یہ تھی کہ پھوپی رہتی تھیں کالے کوسوں دُور حیدرآباد دکن۔ دلّی آئیں اور بھتیجے کو دیکھا تو بڑی خوش ہوئیں۔ بڑی شفقت سے پیش آئیں۔ بھائی کا بچہ۔ آنکھ کا تارا

ایک دن اپنے گھر بلا کر رکھا۔ بڑی خاطر کی۔ بچّہ تو بچّہ۔ خاطر تواضع ہوئی تو ریجھ گیا۔ اور چُپ چاپ چوڑی والان سے کھاری باولی پہنچ گیا۔

میاں ولی اشرف اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب تھے کہ اُن کی نانی امّاں اور پرنانی امّاں دونوں اُن کے لڑکپن میں زندہ سلامت تھیں اور اُن کے مکان سے ملے ہوئے مکان میں رہتی تھیں۔ چوبیس گھنٹے کا آنا جانا۔ ملنا جُلنا۔ لاڈ پیار۔ پرنانی امّاں نے شہر آبادی کا رنگ بھر بھی دیکھا تھا اور دلّی کی بربادی بھی۔ بچّوں کو آنکھوں دیکھی، کانوں سنی پُرانی باتیں اکثر سناتی رہتی تھیں۔ قصّے کہانیاں، حکایتیں، پہیلیاں، کہ مکرنیاں۔ شاہی کے حالات۔ بچّے سب کچھ سنتے تھے میاں ولی اشرف کو ان باتوں میں بہت لطف آتا تھا۔ کرید کرید کر پوچھتے۔ ہر بات کو سمجھنے اور تہہ تک جانے کی کوشش کرتے۔ اُن میں بات سُن کر یاد رکھنے اور گرہ میں باندھ لینے کا فطری سلیقہ تھا۔ جو سنتے ذہن میں محفوظ کر لیتے۔ ماضی کے بے شمار نقوش اسی طرح کھیل کھیل میں ذہن پر نقش ہو گئے۔ نانی امّاں اور پرنانی امّاں ماضی کو زندہ حقیقت کے روپ میں بچّوں کے سامنے اس طرح پیش کرتی تھیں کہ سماں بندھ جاتا تھا۔ کبھی کبھی رات کے وقت ایک نقل ہوتی۔ وہ اس طرح کہ نانی امّاں آگے بیٹھ جاتیں اور اُن کے پیچھے پرنانی امّاں اس طرح چپک کر بیٹھتیں کہ نانی امّاں کے دونوں ہاتھ پیچھے کی جانب ہوتے اور پرنانی اپنے دونوں ہاتھ نانی امّاں کی بغلوں سے اس طرح باہر نکالتیں کہ وہ ہاتھ نانی امّاں ہی کے معلوم ہوتے۔ دونوں کو ایک چادر اس طرح اڑھا دیا جاتا کہ دونوں ایک ہی معلوم ہوتیں۔ اب نانی امّاں یہ کرتیں کہ دلّی کے باغوں میں سے کسی باغ کا نام لیتیں۔ شاہی میں دلّی میں بے شمار باغ تھے۔ مہتاب باغ، حیات باغ، قدسیہ باغ، روشن آرا کا باغ۔ کوئی ایک باغ مقرر کر لیا جاتا اور اس کی سیر کا حال بیان کرنا شروع کرتیں۔ اس سیر کا حال بیان کرنے میں کمال یہ دکھایا جاتا کہ نانی امّاں پھلوں، پھولوں اور درختوں کی جسامت۔ حجم۔ کثرت اور قلت۔ بہار اور کیفیت، جو کچھ منہ سے ادا کرتیں، اُن کا اظہار پرنانی صاحبہ کے ہاتھوں اور انگلیوں سے ہوتا۔ میاں ولی اشرف کے لیے اس قسم کی نقلیں کھیل تماشا نہیں حقائق کا وہ ادراک تھیں جس نے زندگی بھر انہیں

دہلویت کا نقیب، ثناخواں اور داستان گو بنائے رکھا۔

میاں ولی اشرف بڑے ہوئے۔ اسکول جانے لگے۔ اسکول میں بھی انھیں کھیل کود سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ اسکول کے میچ تو ضرور دیکھتے تھے لیکن کھیلوں میں بذاتِ خود کوئی حصّہ نہیں لیتے تھے۔ کلاس کے دوسرے لڑکوں سے بھی کوئی خاص دوستی نہیں تھی۔ بس اپنے دونوں پھوپی زاد بھائیوں مبشر احمد اور شاہد احمد کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے اور کلاس کے لڑکوں کے ساتھ بیت بازی کرتے رہتے۔ میاں ولی اشرف کو شعر و شاعری سے بھی شوق تھا مگر ان کا من بھاتا مشغلہ بڑے بوڑھوں کی گفتگو کو غور سے سننا، پرانے زمانے کے حالات دریافت کرنا اور ان حالات کو زندہ حقیقت کا روپ دینا تھا۔

میاں ولی اشرف میٹرک میں پہنچے تو ایک دن اُن کے پھوپا مولوی بشیرالدین احمد ابن ڈپٹی نذیر احمد نے کہا۔ مبشر اور شاہد دونوں مجھ سے انگریزی اور اُردو فارسی پڑھتے ہیں۔ تم بھی اُن کے ساتھ پڑھ لیا کرو۔ مولوی بشیر الدین بڑے رعب داب کے آدمی تھے۔ گھر والوں کا تو ذکر ہی کیا، محلّے والے بھی ان سے ڈرتے تھے۔ سنا ہے کہ پاس پڑوس کی عورتیں روتے ہوئے بچّوں کو یہ کہہ کر ڈراتی تھیں کہ چُپ ہو جاؤ ورنہ ڈپٹی صاحب ڈانٹیں گے۔ ویسے ڈپٹی صاحب آدمی بڑے محنتی تھے۔ روزانہ صبح لکھنے بیٹھتے تو دوپہر تک مسلسل لکھتے رہتے۔ ایسے محنتی اور غصیل آدمی کا سامنا کرنے کے لیے ہمّت چاہیے مگر میاں ولی اشرف کے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پڑھنا شروع کیا تو ڈپٹی صاحب کو یہ اندازہ ہوا کہ یہ لڑکا تو اُردو فارسی بہت اچھی جانتا ہے۔ اب یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ڈپٹی صاحب، میاں ولی اشرف کو کتابت کی کاپیوں کی تصحیح کے لیے ساتھ بٹھانے لگے۔ میاں ولی اشرف مسودہ پڑھتے جاتے اور ڈپٹی صاحب کاپیوں کی تصحیح کرتے جاتے۔ اس طرح میاں ولی اشرف کے تلفّظ اور بلند خوانی کی تصحیح بھی ہوتی گئی۔ کوئی لفظ غلط پڑھا اور ڈپٹی صاحب نے ٹوکا۔ کسی لفظ پر اٹکے اور ڈپٹی صاحب نے تشریح کی۔ تصحیح کیا تھی، میاں ولی اشرف کے لیے ایک اعلا درجے کی درس گاہ تھی۔

ڈپٹی صاحب بنیادی طور پر تاریخ کے آدمی تھے۔ واقعاتِ مملکتِ بیجاپور،

تاریخ وجے نگر، واقعاتِ دارالحکومت دہلی، فرامینِ سلاطین اُن کی اچھی یادگاریں ہیں، مگر انھوں نے ناول بھی لکھے اور ایک کتاب تمثال الامثال کے نام سے ضرب الامثال کی تشریح میں مرتب کی۔ کتاب کی ترتیب میں اشعار کی سند کا مسئلہ آیا تو ڈپٹی صاحب نے شعروشاعری بھی شروع کردی۔ باپ بھی شاعر تھے۔ قومی جلسوں میں لیکچر سے پہلے اپنی نظم ضرور پڑھتے تھے۔ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا۔ ڈپٹی صاحب بھی غزلیں، نظمیں، مثنویاں سبھی کچھ لکھنے لگے۔ پہلے نواب سائل سے اصلاح لی، پھر نوح ناروی کو کلام دکھانے لگے۔ شدہ شدہ شعری سرمایہ اتنا ہوگیا کہ دیوانِ بشیر مرتب ہوگیا اور اس کی کاپیوں کی تصحیح ہونے لگی۔ میاں ولی اشرف مسودے سے شعر پڑھتے اور ڈپٹی صاحب تصحیح کرتے جاتے۔

میاں ولی اشرف سات برس کی ننھی سی جان تھے تو بے کہے سُنے اکیلے پھوپی کے گھر پہنچ گئے تھے۔ پھوپی تو مدّت ہوئی اللہ کو پیاری ہوچکی تھیں لیکن ان کے حُسن توسط سے میاں ولی اشرف میں جرأتِ رندانہ ضرور پیدا ہوگئی تھی۔ اب وہ سات برس کے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے انیس برس کے نوجوان تھے۔ دیوانِ بشیر کی تصحیح میں شریک ہوکر اُن میں ایک نیا حوصلہ پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ ایک دن انھوں نے ہمّت کرکے بڑے ادب اور احترام سے ڈپٹی صاحب سے کہا کہ میں آپ کے دیوان کے لیے ایک تقریظ لکھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اسے اصلاح کے بعد دیوانِ بشیر میں شامل کرلیں گے۔ ڈپٹی صاحب بھتیجے کی یہ بات سن کر پہلے تو کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے، بہت اچھا۔ تم جو کچھ لکھنا چاہتے ہو دو تین دن میں لکھ کر لے آؤ کیونکہ اب دیوان کی چھپائی میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ اتنا سننا تھا کہ میاں ولی اشرف کی باچھیں کھل گئیں۔ سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ گھر پہنچے اور سب کام چھوڑ چھاڑ کر تقریظ لکھنے میں جُٹ گئے۔ دو دن کی محنت کے بعد جو کچھ لکھا تھا لے جاکر ڈپٹی صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ ڈپٹی صاحب نے اسے بہ نظرِ اصلاح دیکھا اور دیوانِ بشیر میں یہ تقریظ مولانا اشرف صبوحی دہلوی کے نام سے شائع ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میاں ولی اشرف مستند اہلِ قلم مولوی اور مولانا ہوگئے۔ یہ بات ۱۹۲۴ء کی ہے۔ یعنی آج سے تریسٹھ برس پہلے کی۔ آج جتنی میری عمر ہے، ولی اشرف صاحب کو اتنا ہی عرصہ زبان و ادب کی خدمت کرتے

گزر گیا ہے۔

لکھنے لکھانے کا سلسلہ چل نکلا۔ شعر و شاعری سے رغبت تھی، شعر کہتے رہے۔ ہر نوجوان ادیب کو رسالہ نکالنے کا شوق ہوتا ہے۔ صبوحی صاحب کو بھی یہ شوق ہُوا۔ بڑے اہتمام سے "ارمغان" نکالا۔ دو برس تک محنت کرتے رہے۔ پرچہ اچھا چل رہا تھا مگر ہر ماہ پورا کرنا بس سے باہر نظر آیا۔ اس لیے بھاری پتھر سمجھ کر چوما اور چھوڑ دیا۔ مگر ادبی رسالوں کے نامور مدیروں کی فہرست میں ان کا نام بھی درج ہو گیا۔ رسالہ جاری بھی کیسے رہتا، رزق کا وسیلہ تو ڈاک خانے کو بننا تھا۔ آدمی اپنا رزق چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتا۔ ارمغان کو ساقی کا پیش رو سمجھنا چاہیے۔ پہلا شمارہ نومبر ۲۹ء میں شائع ہوا۔ وہی آن بان، وہی انداز۔ مصور سمیع کا بنایا ہوا رنگین سرورق لکھنے والوں کا حلقہ بھی تقریباً وہی۔ مگر صبوحی صاحب کی نثر نے اُن کی شاعری کو دبا لیا۔ ایک دفعہ برادرم ڈاکٹر مغیث الدین فریدی اپنی ایک طالبہ کے ساتھ بستی نظام الدین میں مجھ سے ملنے آئے۔ کہنے لگے، یہ طالبہ ایم اے کے لیے اشرف صبوحی صاحب کے بارے میں ایک مقالہ لکھ رہی ہیں۔ اگر آپ اُن کے متعلق کچھ جانتے ہوں تو بتایئے۔ کیا عجیب بات تھی کہ دلّی کا حوالہ دلّی کے لیے اجنبی تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ صبوحی صاحب کا کلام بھی آپ کی نظر سے گزرا ہے؟ اس پر دونوں بڑے متعجب ہوئے کہ اچھا صبوحی صاحب شاعر بھی ہیں۔ میں نے کہا صبوحی صاحب کی شاعری اسی بستی کے پتھروں میں محفوظ ہے۔ آیئے۔ دیکھیے۔ چنانچہ میں انھیں اشتیاق احمد چشتی کے مزار پر لے گیا۔ یہ مزار عبدالسلام نیازی کے مزار کے احاطے میں ہے۔ چشتی صاحب کی قبر پر صبوحی صاحب کی کہی ہوئی تاریخِ وفات کندہ ہے۔ جو بھی فاتحہ پڑھنے آتا ہے اشرف صبوحی کی جولانیِ طبع بھی دیکھ جاتا ہے۔

۴۳ ۱۹ء میں "دلّی کی چند عجیب ہستیاں" انجمن ترقی اردو نے شائع ہوئی تو اشرف صبوحی کی دھاک بیٹھ گئی۔ معاشرہ افراد سے بنتا ہے۔ افراد معاشرے کا سنگھار ہوتے ہیں۔ اچھے بُرے کی کوئی تخصیص نہیں۔ انھیں کے ذریعے سے تہذیب و ثقافت کی شناخت ہوتی ہے۔ صبوحی صاحب نے افراد کے ذریعے سے دہلویت کا نگار خانہ ازسرِ نو مرتب کیا تھا۔ انھیں دلّی کے روڑوں سے عشق ہے۔ اُن میں گھُسنا، معلومات

حاصل کرنا، اُن کی نفسیات کا مطالعہ کرنا صبوحی صاحب کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ میر باقر علی داستان گو۔ صاحب عالم مرزا چپاتی، گھمّی کبابی، مٹھو بھٹیارا، گنجا نہاری والا، میر ٹوٹرو کے خاکے پڑھ لیجیے معلوم ہو جائے گا کہ ان کی خصوصیت ان کی دہلویت ہے۔

دلّی کے بارے میں لکھنے والے ادیبوں کی کوئی کمی نہیں۔ ناصر نذیر فراق، مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، آغا حیدر حسن دہلوی، ملّا واحدی، شاہد احمد دہلوی۔ مگر صبوحی صاحب کی انفرادیت اپنی جگہ۔ اُن کی دلّی کا مرکز لال قلعہ نہیں، شاہجہاں آباد کے عوام ہیں۔ دیوانی عورتیں، پگلے آدمی، کبابی، بھٹیارے، رکاب دار، مفلوک الحال شہزادے، عمر رسیدہ پہلوان، بوڑھے تکیہ دار، رنگے پیر، ہنستے بستے عوام جو ایک مخصوص طرزِ زندگی، طرزِ احساس اور طرزِ فکر کی نمایندگی کرتے ہیں۔ جن کے یہاں اقدار کی کشمکش نہیں۔ نفسیاتی الجھنیں اور منافقت نہیں۔ اس گہرے عوامی رابطے کی وجہ سے صبوحی صاحب کی نثر بڑی چوکھی، زندہ اور توانا ہے۔ فرحت اللہ بیگ اور شاہد احمد دہلوی نے دلّی کے میلے ٹھیلے اور کوچہ و بازار کو تماشائی کی آنکھ سے دیکھا۔ صبوحی صاحب بذاتِ خود میلا ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اُن کے یہاں مریضانہ عقیدت کا کوئی اظہار نہیں۔ یادوں کا جذباتی وفور اور خود کو ماضی میں گم کر دینے کی ذہنیت نہیں۔ صاف سیدھے اور سجل بیان ہے۔ شاہد بھائی نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ دہلی کے بارے میں صبوحی صاحب سے بہتر لکھنے والا آج کوئی بھی نہیں۔ اُن کی نثر، میری نثر کے مقابلے میں بہت جاندار ہے۔ عسکری صاحب ۱۹۴۵ء ہی میں صبوحی صاحب کو جاندار نثر لکھنے کا سرٹیفکیٹ دے چکے تھے۔

میر امّن سے شاہد احمد دہلوی تک دلّی کے قلم کاروں کا جو طویل سلسلہ ہے، صبوحی صاحب اس کی نہایت اہم کڑی ہیں۔ صاحبِ فرہنگ آصفیہ سیّد احمد دہلوی نے ناصر نذیر فراق کو سلطانِ زبانِ اُردو اس بنا پر قرار دیا تھا کہ فراق کے ایک مضمون میں اُنھیں محاوروں، ضرب الامثال اور روزمرّہ کا کمال نظر آیا تھا۔ یہ کمال صبوحی صاحب کے حصّے میں بھی آیا ہے اور خوب آیا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا کہنا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے روزمرّہ اور محاورات کا ایک مجموعہ بنا رکھا تھا۔ لکھتے تھے تو اسے سامنے رکھتے تھے۔ ڈپٹی صاحب کے بعد یہ مجموعہ مرزا صاحب کے ہاتھ آگیا تھا کہ وہ

بھی اسے سامنے رکھ کر روزمرّہ اور محاورے بے تکان لکھتے تھے۔ صبوحی صاحب نے ایسا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا۔ جو بولتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ جو زبان پر وُہی نوکِ قلم پر۔ لکھتے ہیں تو موتی پروتے ہیں، بولتے ہیں تو موتی لٹاتے ہیں۔ خاکے لکھے، افسانے لکھے، مضمون لکھے، بچّوں کی کہانیاں لکھیں۔ جو کچھ لکھا خوب لکھا۔ ساری چیزوں کو جانے دیجیے صرف بچّوں کی کہانیوں ہی کو لے لیجیے۔ میں صحیح تعداد تو نہیں بتا سکتا لیکن یہ اندازہ ضرور ہے کہ سوڈیڑھ سو سے کم نہیں ہوں گی۔ ان میں سے بیشتر صبوحی صاحب نے خود ہی چھاپیں اور احباب کی نذر کر دیں۔ یہ کہانیاں نہیں ہمارا وہ تہذیبی ورثہ ہے جسے ہم نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ صبوحی صاحب نے اُسے ہماری نئی نسل اور آنے والی تمام نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

دلّی کی چند عجیب ہستیوں کے بعد صبوحی صاحب کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ طبع زاد بھی اور ترجمے بھی۔ خاکوں اور افسانوں کا مجموعہ "جھروکے" ترجموں میں "موصل کے سوداگر"، "بَن باسی دیوی" اور "بغداد کا جوہری"۔ بَن باسی دیوی اور بغداد کے جوہری پر دیباچے دلّی کے مشہور عالم پروفیسر مرزا محمد سعید نے لکھے تھے۔ مرزا صاحب ایک خاص وضع کے بزرگ اور علم کا سمندر تھے۔ صبوحی صاحب سے اُن کی خوب گُھٹتی تھی۔ صبوحی صاحب نے نقوش کے شخصیات نمبر کے لیے مرزا صاحب کا خاکہ بھی لکھا تھا مگر بڑی احتیاط اور ادب و احترام کے ساتھ۔ چنانچہ خاکے میں ادب، احترام اور محبّت تو بہت ہے۔ اصلی مرزا صاحب کہیں نہیں ہیں۔

یہاں تک تو ساری گفتگو مکتوبی تھی۔ لیکن اب کچھ ملفوظی بھی کہ صبوحی صاحب اور یہ خاکسار دونوں ملفوظات کے رسیا ہیں۔ میں نے صبوحی صاحب کا نام اپنے زمانۂ طالب علمی میں سنا تھا۔ یہ بھی علم ہوا کہ اُن کے برادرِ خورد سیّد وصی اشرف کا کتب خانہ "علم و ادب" دلّی کے ادیبوں اور شاعروں کی بیٹھک ہے۔ روزانہ شام کو مجمع رہتا ہے جس میں شاہد احمد بالعموم شریک ہوتے ہیں۔ صبوحی صاحب کی کچھ چیزیں نظر سے گزریں۔ "دلّی کی چند عجیب ہستیوں نے بہت متاثر کیا لیکن ذاتی ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ دُور سے دیکھا، لمبا قد۔ دہرا بدن۔ گول چہرے پر خشخشی ڈاڑھی۔ اُس زمانے میں کالی تھی۔ عینک کے شیشوں سے جھانکتی ہوئی تیز اور روشن آنکھیں۔ ہونٹوں

پر مسکراہٹ۔ سر پر کرسطی کی سخت ترکی ٹوپی۔ شیروانی کے سارے بٹن کھلے ہوئے۔ علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ۔ انداز میں انکسار اور حلم۔ وضع قطع اور حُلیے سے پورے مولوی صاحب معلوم ہوتے تھے۔ مگر یہ مولانا مولوی سیّد محمد ولی اشرف صبوحی دہلوی کب، کیسے اور کیوں میرے لیے بھائی ولی بن گئے۔ یہ اب میں خود بھی نہیں بتا سکتا۔ صرف یہ یاد ہے کہ چونکہ شاہد بھائی انھیں بھائی ولی کہتے تھے لہٰذا ہم سب کے لیے بھی وہ بھائی ولی ہو گئے۔ بزرگی، خوردی، رشتہ ناتا سب اپنی جگہ لیکن اب وہ میرے لیے بھائی ولی ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد بھائی ولی لاہور میں آباد ہوئے۔ شاہد صاحب لاہور میں پانی والے تالاب میں کوچۂ سیٹھاں کے جس مکان میں مقیم تھے، لاہور سے کراچی منتقل ہوتے وقت وہ مکان بھائی ولی کے سپرد ہوا۔ میں نے ہمیشہ انھیں اسی مکان میں دیکھا۔ مکان تھا بڑا۔ بھائی ولی نے ازراہِ ہمدردی اپنے محکمے کے ایک آدمی کو نیچے کا حصہ کچھ دن کے لیے رہنے کو دے دیا۔ وہ آدمی تھا شریر۔ انگلی پکڑتے ہی پہونچا پکڑا۔ آیا تھا کچھ دن کے لیے۔ خواب دیکھنے لگا مالک بننے کے۔ نہ جانے کیا کیا جتن کیے۔ مقدمہ دائر کر دیا۔ بھائی ولی بڑے پریشان ہوئے۔ شریف آدمی کچہری عدالت کے پھیر سے ناواقف۔ کئی پیشیوں پر شاہد بھائی بھی شہادت کے لیے گئے۔ مگر یہ حوصلہ بھائی ولی ہی میں تھا کہ نہ اُن کی تیوری پر بل آیا اور نہ انھوں نے اُس شخص نامعقول سے صاحب سلامت ترک کی۔ وضع داری نباہتے رہے۔ ساری زندگی وضع داری کے ہاتھوں نقصان اٹھائے اور خوش رہے۔

لاہور میں بھائی ولی کا معمول یہ تھا کہ شام کو گھر آئے۔ کھانے سے فارغ ہوئے اور پہنچے میاں اسلم کے یہاں۔ میاں صاحب بھی اُن کے منتظر رہتے۔ اب میاں صاحب ہیں اور بھائی ولی ہیں۔ مگر یہ ٹریفک یک طرفہ تھا۔ میاں صاحب ناول سنا رہے ہیں۔ بھائی ولی سُن رہے ہیں۔ لوگ تو ایک ہی آدھ دن میں چیں بول جاتے تھے۔ بھائی ولی نے عمرِ عزیز کے تیس پینتیس برس روزانہ شام کو ناول سننے میں گزارے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس غیر معمولی تحمّل اور صبر کی وجہ سے بھائی ولی بے روک ٹوک جنت میں بھیج دیے جائیں گے۔ اگر کسی نے پرسش بھی

کی تو حکم ہوگا، خبردار انھیں نہ روکنا۔ انھوں نے ساری زندگی میاں صاحب کے ناول سُن کر نفس کے ساتھ جہاد کیا ہے۔ ویسے میاں صاحب کے سارے اہلِ خاندان بھائی دلی کا بڑا احترام کرتے تھے اور اُنھیں فردِ خاندان سمجھتے تھے۔ میں نے ایک محفل میں خود دیکھا کہ میاں امین الدین بھائی دلی کو دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے اور بڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ اسلم صاحب بھی اُن کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ بھائی دلی کا یہ بھی حال کہ ادھر میں لاہور پہنچا اور اِدھر انھوں نے کہا، چلو بھئی میاں صاحب کے یہاں چلیں۔ بھائی دلی کو خود بھی میاں صاحب کے یہاں جائے بغیر چین نہیں پڑتا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر کسی وجہ سے بھائی دلی کسی دن میاں صاحب کے یہاں نہیں جاسکے تو اگلے دن میاں صاحب بڑے خاموش اور بجھے بجھے نظر آتے اور بار بار بھائی دلی سے نہ آنے کی شکایت کرتے۔ بہت سے لوگوں نے جن میں میں خود بھی شامل ہوں۔ بہت دفعہ بھائی دلی سے کہا بھی کہ آپ وقت کیوں ضائع کرتے ہیں، ہفتے میں ایک آدھ دن ہو آئیں مگر بھائی دلی وضع کے پابند تھے۔ آندھی ہو، پانی ہو، طوفان ہو، شام کو جانا ضرور۔ میاں صاحب کے علاوہ لاہور میں بھائی دلی کے دوستوں اور احباب کا ایک پورا حلقہ تھا۔ شاہی قلعے کے قلعہ دار قاضی عبدالواحد، خاندان تیموریہ کے سربراہ مرزا خیرالدین حکیم مقرب دہلوی، شیدا دہلوی، حکیم عسکری اور اسی قسم کے چند لوگ تھے۔ حکیم کیف اور حبیب اشعر بھی کبھی کبھی آ نکلتے تھے۔ قلعے میں نشست ہوتی یا مرزا خیرالدین کے یہاں موڈل ٹاؤن میں۔ مرزا خیرالدین بڑے متواضع اور دوست نواز انسان تھے۔ چائے اور کھانے میں وہ اہتمام کرتے کہ مہمان، "حیران ہوں کہ دو ہاتھوں سے کیا کیا کھاؤں" سوچتا رہ جاتا ان نشستوں میں شعر شاعری ہوتی۔ غالباً مضمون بھی پڑھے جاتے تھے (میں نے کوئی مضمون نہیں سنا) بڑی دلچسپ گفتگو ہوتی۔ بھائی دلی اُن نشستوں میں نمایاں اور ممتاز نظر آتے سب لوگ اُن کا احترام کرتے تھے۔

لاہور میں بھائی دلی، میاں صاحب کے ہاں کی روزانہ حاضری کے باوجود خوب لکھتے رہے۔ بچوں کی بے شمار کہانیاں لکھیں، مضامین لکھے۔ غبارِ کارواں شائع ہوئی۔ دلی کی چند عجیب ہستیوں کا نیا اڈیشن شائع ہوا۔ مکتبہ فرینکلن کی فرمائش پر

کچھ ترجمے کیے۔ خاصی چیزیں لکھیں۔
بھائی ولی کی وضع داری یہ تھی کہ جب تک لاہور میں رہے ہر ادیب اور شاعر سے پابندی کے ساتھ ملتے رہے۔ ہر شخص کے یہاں جاتے، بیٹھتے، باتیں کرتے چلے آتے۔ یاروں کے یار ہیں۔ بار کسی پر نہیں بنتے نہ کسی کام کے لیے کہتے ہیں "ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا اور چل نکلے" اس وجہ سے سب لوگ اُن سے عزّت و احترام سے پیش آتے تھے۔ میں نے جس شخص سے بھی اُن کا تذکرہ سُنا محبّت اور احترام کے ساتھ سنا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اور سید وقار عظیم بھی اُن کا تذکرہ بڑی محبّت سے کرتے تھے۔ اور نئی نسل کے لوگوں کو بھی اُن سے محبّت ہے۔ دراصل یہ اپنے اپنے نفس اور ضمیر کی بات ہے۔ جو جیسا ہوتا ہے اسے حلقۂ احباب بھی ویسا ہی میسّر آتا ہے۔ بھائی ولی نیک نفس اور وضع دار اُن کے تمام ملنے والے اُن کی اس خصوصیت سے متاثر، اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا، ایک صاحب تھے شمعون احمد۔ وزارتِ مواصلات میں مالی مشیر تھے۔ اُن کے والد بھائی ولی کے ملنے والے تھے۔ شمعون صاحب کی وضع داری یہ کہ جب لاہور آتے تو بھائی ولی سے ضرور ملنے آتے اور کہتے کہ والد مرحوم کے ملنے والوں میں اب آپ ہی رہ گئے ہیں۔ بھائی ولی ڈاک خانے میں سب پوسٹ ماسٹر اور شمعون صاحب مشیر، لیکن وہ آتے ضرور تھے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب لاہور کے جی۔ پی۔ او میں پوسٹ ماسٹر کا عہدہ بڑا نہیں تھا۔ کسی نے اُس عہد کے پوسٹ ماسٹر سے کہا۔ یہ جو تمھارے ایک ڈاک خانے میں سب پوسٹ ماسٹر ہیں اُن کے یہاں ایڈوائزر صاحب آتے رہتے ہیں اُن سے کہہ کر اپنا عہدہ بڑھوا کیوں نہیں لیتے۔ پوسٹ ماسٹر نے بھائی ولی اور بھائی ولی نے شمعون صاحب سے کہا اور واقعی عہدہ بڑھ گیا۔ بھائی ولی خود تو سب پوسٹ ماسٹر رہے لیکن اگلے کو ترقی دلوادی۔

بھائی ولی ڈاک خانے میں بھی مزے مزے کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں نے اُنھیں ہمیشہ ہیرا منڈی کے ڈاک خانے میں دیکھا۔ سنا ہے سدا سے وہیں نہیں تھے۔ پہلے کہیں، اور تھے۔ غیر شریفانہ راستوں سے گزر کر ڈاک خانے پہنچے تو پہلے میر صاحب سے مڈبھیڑ ہوئی۔ میر صاحب چٹھی نویس تھے۔ ڈاک خانے کے برآمدے میں بیٹھے رہتے تھے۔ آپ پہنچے اور بھائی ولی نے کھانے پینے کی کوئی چیز فوراً منگوائی۔

میر صاحب سے لے کر ڈاک خانے کا پورا عملہ اس چُپ ندم خُور ندم میں شریک۔ آپ نے کھانے سے انکار کیا اور بھائی دتی کے چہرے پر آزردگی کی لہر دوڑی۔ اُن کا مقولہ ہے۔ ایک ڈاڑھ چلے ستر بلا ٹلے۔ کھانے پینے کے معاملے میں وہ دتی کے دل والے ہیں۔ ایک ایک دکان کا حال معلوم۔ اُس کے کبابوں کا مسالا ہی کچھ اور ہے۔ اُس کی کھیر میں سوندھاپن ہے۔ اس کے یہاں شربت میں بادام گھٹے ہوتے ہیں۔ ڈاک خانے میں کھانے پینے کی چیزیں چلی آرہی ہیں۔ باہر نکلے تو راستہ چلنا مشکل۔ ایک ایک دکان کی تعریف۔ یہاں یہ اچھا ہے، یہاں یہ اچھا ہے۔ بھائی ولی ہیں کہ آنے والے کی تواضع میں بچھے جارہے ہیں۔ بس چلے تو تن کے کپڑے بھی اُتار کر مہمان کی نذر کردیں۔ میں نے بارہا غور کیا کہ یہ خلوص، تواضع اور خوش باشی ہماری نسل کے حصّے میں کیوں نہیں آئی۔ پھر خود ہی خیال آتا ہے کہ ہم لوگ ہر شخص سے ایک توقع رکھ کر ملتے ہیں بھائی ولی کسی سے کوئی توقع نہیں رکھتے۔ بے غرض ملتے ہیں اس لیے اُن کے یہاں عزتِ نفس بھی ہے اور خوش باشی بھی۔ جس کے دوست ہیں اُس کے دوست ہیں۔ بے غرض، بے ریا، یار کی یاری سے کام یار کے فعلوں سے کیا کام۔ بے ہمہ اور باہمہ۔ اُن کے ملنے والوں میں بڑے لوگ بھی ہیں۔ بھائی دتی سب سے اپنی سطح پر ملتے ہیں، عزتِ نفس کے ساتھ۔ اُن کے سارے ملنے والے اُن کی اِس روش کا احترام کرتے ہیں۔ ایک دفعہ لاہور سے پنڈی جانے کا پروگرام بنا۔ غالباً ۵۱ء یا ۵۲ء کی بات ہے۔ خیبر میل سے جانا طے ہوا۔ بھائی دتی اپنے مکان سے اسٹیشن آئے۔ میں شاہد صاحب کے ساتھ تھا۔ ہم لوگ گھومتے پھرتے بڑی دیر میں اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی آچکی تھی۔ دیکھا تو بھائی دتی ایک پُر ہجوم ڈبے میں اطمینان و سکون سے بیٹھے ہیں۔ شاہد صاحب نے اُن سے بہیترا کہا کہ سکنڈ کلاس میں اُن کے ساتھ آکر بیٹھیں لیکن بھائی دتی اپنی جگہ مطمئن بیٹھے رہے۔ شاہد بھائی کھسیائے تو بہت لیکن کچھ کہہ نہیں سکے۔ چپکے ہو رہے۔

یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ قدرت ہر انسان کو ایک خصوصی صلاحیت سے نوازتی ہے۔ تحریر کے دھنی تقریر میں پھُس پھُسے اور تقریر کے بادشاہوں کی تحریریں پھیکی۔ ہر شخص مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد اور خواجہ حسن نظامی نہیں ہوتا۔

خواجہ حسن نظامی علیہ الرحمۃ پر۔ مجھے یاد آیا کہ بھائی دتی نے ایک دفعہ خواجہ صاحب

کی طاقتِ لسانی کا ایک واقعہ سنایا تھا۔ مچھلی والان میں کوئی شادی تھی۔ محلّے کے سنیما میں برات کے بٹھانے کا انتظام تھا۔ برات آئی۔ لوگ بیٹھے۔ سنیما میں بٹھائے جانے پر بعض ثقہ لوگوں کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے۔ خواجہ صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ شکن آلود پیشانیاں دیکھ کر خواجہ صاحب نے گفتگو شروع کی کہ س کا سُر سنگھار ستارہ سحر کی طرح روشن۔ ستار کی ستاری۔ سردار کی سرداری۔ سبحان رب الاعلا کی سرشاری سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت و سعادت، سلیمان علیہ السلام کی سطوت سلطانی سبعہ معلقہ اور سبعہ سیارہ کی بہار، صحاح ستہ کا اعتبار۔ سمندر کی سیرابی۔ ساگر کی سمائی۔ سماوات کی سیر۔ سماع کا سنگھار۔ جس سے دلوں کے بھید کھلتے ہیں اور سرِ تسلیم خم ہوتے ہیں اسی سے متعلق ہے اور یہی س سنیما کا بھی ہے کہ سین سینری سے سیر و تفریح ہے۔ اور سلیقے سے استعمال ہو تو سُبحان اللہ۔ سلیقہ نہ ہو تو سراپا سیاہ کاری۔ خواجہ صاحب کی اس س کی سرگزشت سے سماں بندھ گیا۔ سر کی جبینی سرور و سوار میں بدل گئی۔ لڑکی والوں نے سُکھ کی سانس لی۔ وہ تو خواجہ صاحب کی خداداد صلاحیت تھی۔ بھائی ولی کے یہاں بھی اسی انداز کی جھلک ملتی ہے۔ ان کے دونوں میٹھے ہیں۔ لکھتے ہیں تو گمان گزرتا ہے کہ چاند چاندنی چوک میں اُتر آیا ہے۔ بات کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم جامع مسجد کی نہ بازاری میں بیٹھے ہیں۔ برجستگی، بات سے بات اور فقرے سے فقرہ پیدا کرنا بھائی ولی کی خصوصیت ہے۔ باتیں کیا ہیں موتی کی لڑیاں ہیں کہ بکھرتی چلی جاتی ہیں۔ جگت بھی۔ ایہام بھی۔ مراعات النظیر بھی۔ زبان کا چٹخارہ بھی۔ محاورے کا حسن بھی۔ طرزِ ادا کا بانکپن بھی، اُردو ہی نہیں۔ انگریزی اور فارسی بھی۔ بھائی ولی ایک دفعہ نئی دہلی میں ایسٹرن کورٹ کے ڈاک خانے میں کاؤنٹر پر بیٹھے تھے۔ ایک بڈھی میم شور مچاتی آئی۔ لفافہ ہاتھ میں۔ ہاؤ مچ پوسٹیج۔ ہاؤ مچ پوسٹیج بھائی ولی نے اُسے دیکھا اور بولے:

MADAM:THERE IS A PROVERB IN YOUR LANGUAGE FIRST WEIGH THEN SPEAK,HOW CAN SPEAK WITHOUT WEIGHING.

بڈھی میم نے آگے بڑھ کر بھائی ولی کا منہ چوم لیا اور بھائی ولی منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک دفعہ مصر سے ایک خاتون پاکستان کے دورے پر آئیں۔ ہمدرد کی مہمان تھیں۔ بھائی ولی لاہور میں ہمدرد کے افسر تقریبات۔ لاہور کی سیر کا پروگرام اُنھیں کے سپرد تھا۔ اُن خاتون کا نام سہیلہ تھا۔

بھائی ولی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے برجستہ شعر پڑھا۔

اُقنَ شرطًا الامتاعن لقیتُ فیہا جمال سہیلہ

کرمی رساندازاں نوائے نوید وصلت بجانب ما

شعر پڑھنا غضب ہوگیا وہ نیک بخت جیسے اُدھار کھائے بیٹھی تھیں کہ کوئی بھلا مانس دو میٹھے بول بولے اور وہ فوراً اس سے دو لبول پڑھوائیں چنانچہ یہی ہوا۔ اُن کے جانے کے کچھ عرصے بعد بھائی ولی کے پاس مصر سے اُن کا خط آیا کہ میں تم سے نکاح کرنا چاہتی ہوں۔ بھائی ولی نے خط پڑھا تو زمین پیروں تلے سے نکل گئی۔ جواب نہ دینے ہی میں عافیت نظر آئی۔ چنانچہ سونٹھ کی ناس لے کر بیٹھ رہے۔ بھائی ولی کی سادہ اور معصوم گفتگو کو ہم لوگ ننھی ننھی باتوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اِن ننھی ننھی باتوں میں سب کچھ ہے۔ کرخنداروں کی بولی ٹھولی۔ لطیفے۔ شاہ جہانی دیگ کی کھرچن بزرگوں کے تذکرے۔ زبان کے رموز و نکات۔ بچے بڑے سب ان کی ننھی ننھی باتوں کے دلدادہ ہیں۔ ایک دفعہ حضرت سلطان جیؒ کی آستان بوسی کے لیے دلی جاتے ہوئے میں لاہور میں بھائی ولی کے یہاں گیا۔ دونوں بیٹے بھی ساتھ تھے۔ بھائی ولی دونوں کے کندھے پر ہاتھ رکھے مزے مزے کی باتیں کرتے رہے۔ دونوں محوِ حیرت تھے۔ باتوں باتوں میں رات گزر گئی لیکن کسی کا دل اُٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ بادل نخواستہ اُٹھنا پڑا۔ بھائی ولی بچوں میں بچہ۔ جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے ہیں۔ اُن کی گفتگو سُن کر "اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی" کا احساس نہیں ہوتا۔ بادہ شبانہ کی سرمستی اُبھری محسوس ہوتی ہے۔ بھائی ولی کے یہاں زندگی کے حقائق کا ادراک و اظہار گفتگو میں ننھی ننھی باتوں کے طور پر ہوتا ہے۔ اُن کے یہاں زندگی کو سمجھنے کے لیے گفتگو میں نرمی، ملائمیت اور عوامی سطح کی مخلصانہ واقفیت ضروری ہے۔ وہ اُن لوگوں میں ہیں جو اپنے ماحول میں ڈوب کر اُبھرتے تو ہیں لیکن اُس ماحول کی روح، حوالہ اور شناخت بن کر۔

بات سے بات پیدا کرنا بھائی ولی کی خصوصیت ہے۔ مخدومی حکیم محمد سعید صاحب بھائی ولی کے ساتھ مسجد میں داخل ہو رہے تھے۔ حکیم صاحب نے بھائی ولی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ صوفی، میں نے خانۂ خدا میں تمھارا سہارا لیا ہے۔ یاد رکھنا

بھائی دلی کہاں چوکنے والے تھے۔ فوراً بولے "حکیم صاحب۔ آپ بھی یاد رکھیے۔ آپ نے خانۂ خدا میں صوفی پر ہاتھ رکھا ہے"۔ ایک بار بھائی دلی مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے یہاں بیٹھے تھے۔ مولانا کے لیے ایک گلاس میں دودھ آیا۔ مولانا نے تھوڑا سا دودھ پی لیا۔ ایک شاگرد بھی بیٹھا ہوا تھا۔ مولانا اُس سے کہنے لگے۔ اگر جھوٹے کا خیال نہ ہو تو یہ بچا ہوا دودھ پی لو۔ شاگرد بھی سعادت مند تھا۔ گلاس اٹھا لیا۔ بھائی دلی بھلا کیسے چپکے رہتے۔ بولے میاں پروفیسر صاحب نے تمھیں دودھ بخش دیا۔ پی لو۔ جب وہ دودھ پی چکا تو بھائی دلی پھر بولے۔ میاں آج سے تم اور پروفیسر صاحب ہم شیر ہو گئے۔ بھائی دلی کی حسِ مزاح بڑی تیز ہے۔ ایک مرتبہ ایک ساٹھ سالہ بزرگ نے شادی رچائی۔ دلہن بھی خیر سے چھتیسی تھیں۔ بھائی دلی نے سہرا لکھا ہے

تین بیسی کا ہے دولھا تو دلھن چھتیسی چار کم سو میں بندھا ہے یہ خضابی سہرا

بجلی گئی ہوئی تھی۔ ایک صاحب ملنے آئے تو فوراً روشنی ہو گئی۔ انھوں نے خوش ہو کر مصرع پڑھا "آپ کیا آئے اُجالا ہو گیا"۔ بھائی دلی نے برجستہ کہا "منہ شبِ فرقت کا کالا ہو گیا"۔ ایک دن بھائی دلی اپنے ایک صاحبِ ثروت کرم فرما کو لاہور ایرپورٹ چھوڑنے جا رہے تھے۔ موقع ایسا تھا کہ یہ کرم فرما شدتِ بول سے بولائے جا رہے تھے بھائی دلی سے کہنے لگے۔ ایرپورٹ پر اتنا موقع مل جائے گا کہ فارغ ہو لوں۔ بھائی دلی بولے "جس قادرِ مطلق نے آپ کو فارغ البال کیا ہے کیا عجب کہ وہ آپ کو فارغ البول بھی کر دے"۔ اس طرح کی بے شمار پھلجھڑیاں بھائی دلی کی روزانہ گفتگو میں ملتی ہیں۔ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"!

بھائی دلی ڈاک خانے سے ریٹائر ہوئے تو حکیم محمد سعید صاحب نے اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ حکیم صاحب اُن کے پرانے اداشناس اور قدردان ہیں۔ بھائی دلی ہمدرد لاہور میں افسر تقریبات مقرر ہو گئے اور شامِ ہمدرد کا اہتمام کرنے لگے۔ ڈاک خانے میں اُن کا واسطہ بند مکتوبات سے تھا یہاں بولتے مقالوں سے کام پڑا۔ ہر دلعزیز وہاں بھی تھے ہر دلعزیز یہاں بھی رہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ ادیبوں اور دانشوروں میں پھلجھڑیاں چھوڑتے ایک دن خود اُن کی پھلجھڑی بھی چھوٹ جائے گی مگر ایسا بھول پڑا کہ سب کچھ خاکِ سیاہ ہو گیا۔ آنکھیں بنوائیں تھیں۔ گیس کا شیل پھٹا۔

ساری گیس آنکھوں میں گئی۔ اور ہے

ہوا نے خاک کا طوفاں اُڑا دیا کب کا
جما ہوا ہے ابھی تک غبار آنکھوں میں

اب بھائی دلی ہیں اور سے گزرتے لمحوں کے منظر نظریں ہیں محفوظ۔ سجائے بیٹھا ہوں کتنے مزار آنکھوں میں ـــــ لاہور سے کراچی چلے آئے۔ یہ ایک اور دیا کا تھا کہ عمر کا بڑا حصہ لاہور میں گزار کر وہاں کا جزو بن گئے تھے۔ پھر رفیقۂ حیات زندگی بھر کا ساتھ چھوڑ کر رخصت ہوگئیں۔ خدا جنت نصیب کرے۔ بڑی نیک بیوی تھیں۔ بھائی دلی کے لیے دنیا پہلے ہی اندھیر ہو چکی تھی اب اور زیادہ اندھیرا ہو گیا مگر آج تک میں نے اُن کی زبان سے شکایت کا کوئی حرف نہیں سُنا۔ جب جاؤ وہی باتیں۔ وہی مداراتیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے جیسے نورِ باطن کچھ اور پھیلتا جا رہا ہے۔ بینائی سے محروم یہ انسان تو خود روشنی ہے۔ روشنی اس کے پورے وجود سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ روشنی۔ کچھ اور روشنی۔ کہ ہم سب تاریک راہوں میں سفر کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

خواجہ انیس

نواب رئیس الدّولہ، خدا بخشے محمد شاہ رنگیلے کے دربار مینائی کے امیر تھے۔ کشمیری بھانڈوں سے اُن کا سلسلہ ملتا تھا۔ نوک پلک اچھی تھی، گلا بھی نورانی، جب تک چہرے سے جوانی نہ چھلکی ساقی رہے، پھر مزاج میں دخیل ہوکر امرا میں داخل ہو گئے۔ بڑھاپا آیا تو وہ سبھا اُجڑ چکی تھی، قلعے سے تعلق قطع کر کے گھر بیٹھ رہے اور سب سے الگ تھلگ گزار دی۔ خواجہ انیس ان کے پوتے تھے۔ کشمیری بھانڈ کی اولاد خواجہ کیسے بن گئی؟ شریف گردیوں میں یہی ہوتا ہے۔ خدا جانے مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں کتنے بنے، کتنے بگڑے۔ اور غدر کے بعد کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ جو بنا۔ یا بن گیا اس کی نجابت و شرافت میں کیا شک! لٹے کُھٹے تباہ شدہ خاندانوں پر البتہ پوری ساڑھ ستی آگئی۔ سو رذالوں کے رذالے ہو گئے۔ بہر حال اب تو یہ نواب بھی تھے اور کھرے کھرے خواجہ بھی۔

لیکن ایمان کی بات ہے کہ آدمی اپنی ذات سے بُرے نہ تھے۔ ملنسار وضع دار منکسر مزاج، خوش مذاق، پُرانے طرز کی یحیٰ زندگی بسر کرنے والے۔ البتہ یہ ساری باتیں تھیں اتنی دقیانوسی کہ اُنھیں دیکھ کر کم از کم غدر سے پہلے کا بھول پن یاد آجاتا تھا۔ بچارے ماماپختریاں[1] کھانے والے۔ گیہوں کے درخت سے ناواقف اُردو

---

[1] بے مشقت کھانے والے۔

یں میرامّن کی چار درویش اور فارسی میں، مامُقیمان پڑھے ہوئے۔ پچاسی برس کی عمر تھی۔ نہ مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت یہی تعجب ہے کہ غدر میں بچے کیونکر۔ مکان کی طرح انھیں بھی کھنڈر سمجھ کر چھوڑ دیا ہوگا۔ اِس کوڑے کو کون سمیٹتا۔

غدر کا ہنگامہ فرو ہوا۔ شہر میں امی جمی ہوئی تو ہزاروں گھروں میں سُنے چراغ جلے مگر بادشاہی کہاں رہی تھی کہ قلعے سے تیل بتی مانگ لاتے۔ کوئی کسی کو پوچھنے والا نہ تھا۔ ہاتھ پاؤں ہلاؤ یا اندھیرے میں بیٹھے رہو۔ خواجہ صاحب کے دن بھی پہلے سے نہیں رہے۔ آمد کی سوتیں تو بند تھیں، دو پشت سے خرچ ہی ہو رہا تھا۔ بیٹیاں بیاہیں، بہوئیں لائے۔ پھر داماد ملے تو نکھٹو۔ بیٹوں کا پوچھنا ہی کیا۔ زن مُرید اُڑاؤ کھاؤ۔ اس پر طرّہ اگلا سماں نہیں رہا۔ ہر چیز مہنگی ہو چلی۔ جاگیر املاک کچھ تھی نہیں کشمیری دروازے کی ایک مسجد کے نہ جانے کس پھیر میں متولّی ہو گئے تھے۔ اس کی آمدنی کیا زیادہ سے پچاس ساٹھ روپے ماہوار۔ اُن کے ٹبّر کا کیا پورا پڑتا۔ گزارا دبا نکالتے اور تنگی ترشی کے ساتھ بسر کرتے۔

آخر نا بکے بریانی کے بدلے مُونگ پلاو۔ شب دیگ کی جگہ شلجم کا سالن اور باقر خانیوں سے خمیری روٹیاں رہ گئیں۔ بہوؤں نے ناک بھوں چڑھانی شروع کی۔ داماد غرّانے لگے تو خواجہ صاحب کو فکر ہوئی۔ دل میں سوچا کہ انگریز بھی آخر بادشاہ ہیں چلو اُن ہی کے دربار میں کوئی اسامی ٹٹولو۔ اور کچھ نہ سہی مصاحبوں ہی میں رکھ لیں گے۔ صبح کو گئے سلام کر آئے۔ شام کو گئے مجرا کیا۔ غرض یں لڑائیں چلے آئے۔ ایک دن بیگم صاحبہ سے فرمانے لگے "صاحب سنتی ہو صبح شام یہ کیسی بساندی باتیں ہونے لگیں۔ گھر بھر کا مزاج ہی نہیں ملتا۔"

بیگم : جہاں ایک ایک وقت میں چار چار ہنڈیاں پکتی ہوں وہاں دونوں وقت ایک دال ایک سالن کس سے کھایا جائے۔ ہمارا تو خیر بڑھاپا ہے۔ بہت کھالیا۔ اب کیا کھائیں گے لیکن بچّے کیوں اُبالا مُبالا کھائیں۔

خواجہ : پھر اپنی تقدیر کو روئیں۔ قلعے کی دیواروں سے جا کر سر پھوڑیں۔

بیگم : اے تو صاحب کچھ کرنا چاہیے، کب تک اس طرح گزر ہوگی۔

خواجہ : مجھ سے کہتی ہو، اور سب کھانے ہی والے ہیں۔

بیگم : اس میں کس کی خطا۔ جیسا تم نے اُنھیں اُٹھایا اُٹھے۔
خواجہ: جب تک میرے پاس تھا کھلایا پلایا۔ اب نہیں ہے تو کیا کروں۔
بیگم : میں گھر کی بیٹھنے والی کیا بتاؤں۔
خواجہ: اور کھانے والوں کو ذرّہ خیال نہیں۔
بیگم : تمھارے ہوتے وہ کیوں کچھ کریں۔ کہیں سے لاؤ انھیں کھلاؤ۔
خواجہ: صاحب تو میں کہیں چوری کرنے جاؤں؟
بیگم : اچھا تو وہ کہیں ڈاکہ ڈالیں۔ نکلو حاکموں کے پاس جاؤ۔ کوئی نوکری چاکری تلاش کرو۔
خواجہ: میں نے کبھی نوکری کی ہے؟
بیگم : انھوں نے کب کسی کا ہاتھ تکا ہے۔ بیٹیوں کو بیاہ دیا تھا تو گھر داماد کیوں رکھے۔ بیٹوں کی بہوئیں لانے کی کیا مار پڑی تھی، اور لائے تھے تو اُن کو پہلے روزگار سے لگاتے۔ اپنے گھر کا حال تو سب کو معلوم ہوتا ہے۔
خواجہ: تم تو اُلٹی میرے ہی سر ہو گئیں۔
بیگم : تو کیا ان کے مُنہ لگوں؟
خواجہ: کبھی کہا تو ہوتا کہ بھئی اب تمھارے کمانے کے دن ہیں۔ آبرو کے ساتھ رہنا ہے تو کچھ کرنا چاہیے۔
بیگم : تم بھی تو کہہ کر دیکھ لو۔ میں تو تیرے میرے برابر کہہ کر بیسیوں دفعہ کہہ چکی۔
خواجہ: بہت اچھا صاحب۔ اگر تم بھی یہی چاہتی ہو کہ بچاسی برس کا بوڑھا جوانوں کی خدمت کرے تو اللہ مالک ہے۔ کل بڑے صاحب کے پاس جائیں گے (آنکھوں میں آنسو بھر کر) خدا آبرو رکھے۔
بیگم : ذرّہ قرینے سے جانا۔ بادشاہوں کے درباروں میں اپنا رسوخ جتاؤ گے تو کیوں نہ وہ آبرو کریں گے۔
خواجہ: مگر اب ہم ہیں کس مصرف کے؟
بیگم : بادشاہوں کے ہاں سب طرح کے لوگوں کی پرورش ہوتی ہے اور کچھ نہیں تو دعا گویوں میں تنخواہ ہو جائے گی۔

رات بھر خواجہ صاحب دل سے باتیں کرتے رہے کہ یوں جاؤں گا اور یوں کہوں گا۔ صبح ہوئی، نماز سے فارغ ہوئے، دُعا مانگی۔ بیگم صاحب کو بلایا، تیاری شروع کی۔ سج دھج دیکھنے کے قابل تھی۔ جامے دار کی اچکن پر وہ کھلا ہوا کلابتون کا ساز، آستین اور بغل کٹی ہوئی، زربفت کی بیل، سر پر دستار، شالی رُومال کندھوں پر پڑا۔ پانو میں گھیتلا ٹاٹ بافی جُوتا۔ میانہ نکلوایا، کہار کرایے پر بلوائے۔

خواجہ : (آئینہ دیکھ کر) کیوں صاحب ٹھیک ہے نا؟

بیگم : اللہ جانتا ہے۔ ایسی رعب دار صورت پر اب کون تمھاری بات نہ مانے گا۔

خواجہ : (مسکراتے ہوئے) تو اب میں جاؤں؟

بیگم : بسم اللہ۔ خدا کو سونپا۔

خواجہ : دعا مانگتی رہنا۔

بیگم : میں نے تو رات ہی مشکل کشا کا دونا مان لیا ہے۔ بیوی کی نیاز بھی دلواؤں گی۔

خواجہ صاحب بسم اللہ کہہ کر کھڑے ہوئے۔ دعائے فتح پڑھ کر اپنے اُوپر دَم کی اور میانے میں سوار ہو کر چلے۔ جائیں کہاں؟ دو قدم کہار چلتے اور ٹھٹھک جاتے۔

خواجہ : کیوں بھئی چلتے چلتے رک کیوں جاتے ہو؟

کہار : جو حکم (ایک کہار دوسرے کہار سے) ارے کچھ پوچھا بھی تھا کہاں چلنا ہے؟ یا یوں ہی مُنہ اُٹھا کر چل کھڑے ہوئے۔

کہار۲ : اب تو ہی پوچھ لے۔ ہم تو جانیں ہوا خوری کو نکلے ہیں۔ باغوں میں لے چلیں۔

کہار۳ : یہ بھی کوئی صاحب لوگ ہیں کہ ہوا خوری کریں گے؟

کہار۴ : پھر یہاں تو کندھے ٹوٹے جاتے ہیں۔

کہار۱ : سرکار کہاں جانا ہے؟

خواجہ صاحب کیا بتائیں۔ اُنھیں خود خبر نہیں کہ کہاں جائیں۔ حاکم وقت کہاں رہتے ہیں۔ وہ غریب غدر سے برس دن پہلے جو گھر میں بیٹھے تھے تو آج پہلی مرتبہ

نکلے ہیں۔

خواجہ : بھئی میں کیا بتاؤں چلے چلو۔ ارے بڑے صاحب کا بنگلہ تم نہیں جانتے؟

کہار: صاحب لوگ تو جنگل میں رہتے ہیں۔

خواجہ : وہیں چلو۔

میانہ چلا۔ شہر سے باہر نکلے۔ کوٹھیاں آئیں۔ کہار رُکے۔

خواجہ : بڑے واہی ہو۔ چلتے کیوں نہیں ؟

کہار : حضور! بڑے صاحب کا بنگلہ ہم کا جانیں۔

خواجہ : بڑا ساخس پوش بنگلہ ہوگا۔

کہار چلا گئے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ یہ بُڑھؤ تو سڑی ہوگیا ہے۔ خس پوش بکے جائے ہے۔ مزدوری کیا کی جھنجھٹ میں آ گئے۔

دوسرا بولا : گھس جا کسی بنگلے میں۔ جو بڑا بنگلہ آئے چلا چل۔

تیسرا : بے ٹانٹ پلپلی ہو جائے گی۔

چوتھا : کہاروں کو کوئی نہ پوچھے۔ یا ہی سسرا اپنے جواب دہی کرے گا۔ اتنے میں ایک بڑا بنگلہ آیا۔ برقنداز پہرے پر کھڑا تھا۔ کہار اندر دھنس پڑے۔ اس زمانے میں انگریزوں کے بنگلوں میں آج کل جیسی روک ٹوک نہیں تھی خصوصاً شہر کے پرانے رئیسوں کے لیے۔ برقنداز نے دیکھا کہ ایک مُتشیّن آدمی زرق برق کپڑے پہنے پرانی وضع کے میانہ پر لدا آیا ہے۔ سلام کر کے راستہ چھوڑ دیا اندر پہنچے تو بنگلے کے برآمدے میں کئی چپراسی وردیاں پہنے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک دوڑا ہوا آیا۔ کہاروں سے پوچھا۔ کون ہیں؟

کہار : نواب صاحب ہیں۔

چپراسی : صاحب سے ملنا ہے۔

خواجہ : (میانہ میں سے گردن نکال کر) ہاں بھئی صاحب سے ملیں گے۔ چپراسی بھاگا ہوا صاحب کے پاس گیا اور عرض کیا، "حضور، کوئی بڑے بھاری نواب ملاقات کو آئے ہیں۔" نئی نئی حکومت تھی۔ عوام کی دل جوئی کا خیال

تھا۔ دوسرے انگریز بھی شریف آتے تھے۔ قلعے کی رسمیں دیکھی ہوئی تھیں۔ جہاں تک ہوسکتا عزت داروں کی عزت واحترام کا پاس رکھتے۔ صاحب نے پہلے تو کچھ سوچا پھر جواب دیا "اچھا سلام دو۔ چپراسی خوش خوش خواجہ صاحب کے پاس آئے۔ انعام کا لالچ تھا اور کہا "سرکار صاحب سلام بولتے ہیں۔"

یہ پُرانے زمانے کے آدمی انگریزی بولیاں کیا جانیں۔ گھبرائے کہ سلام بولنا کسے کہتے ہیں۔ کچھ کہنے ہی کو تھے کہ چپراسی سمجھ گیا۔ اس نے کہاروں سے کہا "ادھر بنگلے کی اگاسی میں میانہ لے چلو۔"

خواجہ : کہاں۔ ارے بھئی کہاں؟ کیا بات ہے؟

چپراسی : صاحب سے ملاقات نہیں کریں گے؟

خواجہ : آئے تو اسی لیے تھے، مگر وہ تو سلام بولتے ہیں۔

چپراسی : ہاں حضور۔ تو پھر ملاقات ہوگی۔

خواجہ : ہم سمجھے نہیں۔

چپراسی : صاحب بُلاتے ہیں۔

خواجہ : تمھارے مُنہ میں گھی شکر۔ صاحب کا مزاج تو اچھا ہے؟

چپراسی : صاحب لوگ تو سدا اچھے رہتے ہیں۔

خواجہ : دربار میں کتنے آدمی ہوں گے۔

چپراسی : انگریز حاکم دربار نہیں کرتے۔

خواجہ : (غور کرکے) تخلیے میں تو جانا مناسب نہیں، ہم تو سمجھے تھے کہ دربار عام ہوتا ہوگا۔

چپراسی : ان کی ملاقات تو اسی قاعدے سے ہوتی ہے۔ ایک ایک سے الگ الگ ملتے ہیں۔

خواجہ : دو چار مصاحب ہاں میں ہاں ملانے والے تو ضرور ہوتے ہوں گے ایسا بھی کیا اندھیر ہے۔

چپراسی : نہیں حضور چڑیا کا بچّہ بھی نہیں ہوتا۔

خواجہ : پھر ہم . . . . خدا معلوم کیا کہنا چاہتے تھے کہ چپراسی پریشان ہوکر بولا

"جناب چلنا ہے تو چلیے ایسا نہ ہو کہ صاحب نکل آئیں۔"

بڑی مشکل سے خواجہ صاحب گھبرائے ہوئے اُترے۔ جوتی پہنی، پگڑی سنبھالی۔ لڑکھڑاتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھے۔ چپراسی نے چق اٹھائی۔ اندر داخل ہوئے۔

خواجہ : آداب عرض ہے۔

صاحب : سلام۔ سلام۔ (ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا)۔

خواجہ : یہ ناچیز اس قابل کہاں ہے۔ حضور تشریف رکھیں۔

صاحب : (مسکرا کر) ہاتھ ملانا آپ کو پسند نہیں۔

خواجہ : ہم تو بادشاہ کے ہاتھ چوما کرتے تھے (یہ کہہ کر جھٹ صاحب کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔)

صاحب : (بیٹھتے ہوئے) اچھا کرسی پر بیٹھیے۔

خواجہ : نہیں ہرگز نہیں ہوسکتا۔ قلعے میں ہماری نشست نہیں تھی۔

صاحب : یہ قلعہ نہیں ہے نہ ہم بادشاہ ہیں۔

خواجہ : مگر میں تو آپ کو خداوندِ نعمت ہی سمجھتا ہوں۔

صاحب : آپ کا مہربانی۔ ہماری خوشی ہے آپ بیٹھیں۔

خواجہ : زہے قسمت (بیٹھ جاتے ہیں)۔

صاحب : آپ کو ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ آپ کا مزاج اچھا ہے۔

خواجہ : خداوند کے اقبال کو دُعا دیتا ہوں۔

صاحب : آپ کا نام؟

خواجہ :۔ نام اللہ کا۔ اس ناچیز کو خواجہ انیس کہتے ہیں۔

صاحب : آپ نواب ہیں۔

خواجہ : نواب نام نہ رہے کسی کا لقب نہیں، دادا جان نواب رئیس الدولہ بہادر البتہ محمد شاہی اُمرا میں تھے۔

یہ انگریز تھا تو ایک نوجوان کوئی بڑا عہدہ دار مگر عام انگریزوں سے بہت زیادہ خلیق۔ قدیم خاندانی آدمیوں سے مل کر خوش ہونے والا اور حد درجے کا باتون پندرہ بیس منٹ تک اس طرح ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا کہ خواجہ صاحب سمجھے کہ بیڑا پار ہے۔

صاحب: آپ کا کتنی آمدنی کا جاگیر ہے؟
خواجہ: جاگیر تو دادا جان کے ساتھ مر گئی۔
صاحب: کیا بات؟
خواجہ: اُن ہی کے دم کا سارا ظہورا تھا۔ باوا جان میں قابلیت کہاں تھی؟ آپ جانیے امیروں کے بچے کھوتے ہیں کماتے نہیں۔ ادھر مرہٹہ گردی ہوئی۔ وہ ذرا ڈرپوک تھے۔ گھر میں چھپے بیٹھے رہے۔ اب کمترین، ان ہی کا جانشین ہے۔
صاحب: پھر آپ کا کیا شغل ہے۔
خواجہ: پُرانے وقتوں کو یاد کرنا اور رونا۔ ایک مسجد کی آمدنی سے گزارا کرتا ہوں۔
صاحب: اور آپ نواب نہیں رہا مُلّا ہو گیا۔
خواجہ: (گھبرا کر) نہیں صاحب مُلّا نہیں۔ ہوں تو نواب ہی۔
صاحب: اچھا اچھا لوٹا ہوا نواب۔
خواجہ: بالکل لوٹا ہوا کھنڈر۔
صاحب: آپ کی اولاد ہے؟
خواجہ: چار بیٹیاں اور دو بیٹے۔
صاحب: بیٹے بھی نواب ہیں یا مُلّا لوگ؟
خواجہ: وہ تو نماز بھی نہیں پڑھتے۔
صاحب: بہت بُری بات ہے۔
خواجہ: مگر ابھی وہ جوان ہیں اور جوانی میں ہم نے بھی کبھی نماز نہیں پڑھی۔
صاحب: اب ہم سے آپ کیا مانگنے آیا ہے۔ صرف ملاقات؟
خواجہ: حضور وقت کے حاکم ہیں۔ زیارت سے مشرف ہوا۔ الحمدللہ۔
صاحب: ہم آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اچھا سلام۔
خواجہ: مگر خداوند نعمت دریا کے پاس آکر پیاسا جاؤں۔
صاحب: ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا پانی پینا ہے؟
خواجہ: نہیں بندہ نواز پانی کی پیاس نہیں۔
صاحب: سوڈا، لیمونیڈ جو آپ مانگے۔

خواجہ : توبہ توبہ، ولایتی پانی ہم نہیں پیتے۔
صاحب : پھر کیسا پانی آپ مانگتے ہیں ؟
خواجہ : آپ بڑے صاحب ہیں دلّی کے بادشاہ۔
صاحب : ہم بڑا صاحب نہیں۔ ہمارا بادشاہ لندن میں ہے۔
خواجہ : ہمارے لیے تو آپ ہی بادشاہ ہیں۔ کچھ پرورش ہو جائے۔
صاحب : پرورش کیسا ؟
خواجہ : کوئی جاگیر عنایت ہو۔ بہت تنگی سے گزر ہوتی ہے۔
صاحب : جاگیر دینا ہمارے اختیار میں نہیں۔
خواجہ : پھر آپ کیسے حاکم ہیں ؟ اچھا کوئی نوکری تجویز کیجیے۔
صاحب : آپ اتنا بوڑھا نوکری کرے گا ؟
خواجہ : بوڑھے تو بہت تجربہ کار ہوتے ہیں۔ دنیا کا سرد وگرم دیکھے ہوئے اور غلام کی عمر تو کچھ زیادہ بھی نہیں۔ آج کے آٹھویں دن پچیاسویں سال گرہ ہوگی۔
صاحب : (مسکراکر) آپ نے بہت سچ کہا۔ اور آپ نواب بھی ہے۔ ہم نے سُنا ہے نوابوں کا دل بوڑھا نہیں ہوتا۔
خواجہ : خدا آپ کا بھلا کرے۔ کمپنی بہادر حضور کو لاٹھ بنادے۔ ملکہ ٹوریہ ہو جائیں۔ اللہ آپ کو بڑا صاحب کر دے۔
صاحب : ایسا نہ بولو۔ آپ ہم کو لاٹھ بناتا ہے۔ قطب کی لاٹھ ؟
خواجہ : توبہ توبہ، قطب کی۔
صاحب : اور یہ آپ نے کیا بولا ہم ملکہ بن جائیں۔ وہ عورت ہے ہم مرد۔ ایسی نٹ کھٹی کی بات۔
خواجہ : تو کیا لندن کا بادشاہ مرد نہیں۔ کوئی پردہ نشین عورت ہیں۔
صاحب : ہمارے ملک میں پردے کا دستور نہیں۔ اچھا اب آپ جائیں۔ سلام۔
خواجہ : نوکری کا معاملہ تو رہا جاتا ہے۔

صاحب : ہم فوج کا کرنل ہے۔ آپ سپاہی کا نوکری کرے گا؟ لڑائی پر جانا ہوگا۔
خواجہ : صاحب لڑنا ہم کیا جانیں۔ تلوار تو ہمارے باپ دادا نے بھی نہیں چلائی۔
صاحب: پھر ہم اور کچھ نہیں کرسکتا۔
صاحب کھڑے ہوگئے۔ خواجہ صاحب کو بھی اُٹھنا پڑا۔ سلام کیا، باہر آئے۔ میانے میں بیٹھنے کو تھے کہ چپراسی آموجود۔
خواجہ : کیوں بھئی، صاحب نے کوئی پروانہ دیا ہے؟
چپراسی : حضور اب ہم کب آئیں؟
خواجہ : (یہ سمجھ کر کہ ابھی کوئی پروانہ نہیں لکھا ہے۔ پھر لکھیں گے۔ ہمارے ملنے کا وقت پوچھا ہوگا) بندہ تو ہر وقت گھر پر ملتا ہے۔ جب صاحب بھیجیں آجانا۔
چپراسی : جناب ہم نے آپ کا بڑا نام کیا ہے۔ بہت سا انعام ملے۔
خواجہ : جاگیر یا نوکری ہو جائے جتنا چاہے انعام لو۔
اتنے میں صاحب نے چپراسی کو پکارا۔ یہ انعام کی فکر میں تھے۔ سُنا نہیں صاحب خود باہر نکل آئے۔ خواجہ صاحب میانے میں بیٹھتے بیٹھتے پھر کھڑے ہوگئے۔
خواجہ : حضور کو آخر کچھ خیال آ ہی گیا۔ جلدی حکم فرمایئے گا۔
صاحب : (ہنس کر) بہت اچھا بہت اچھا۔ آپ نے کیا نام بتایا؟
چپراسی صاحب کا مُنہ لگا تھا جلدی سے بول اُٹھا۔ "حضور ان کا نام خواجہ سئیس ہے"
خواجہ : ہا! ایسے نازیبا الفاظ کوئی بھلا مانس مُنہ سے نکالتا ہے۔ حضور ہم نے سب کچھ گنوایا، مگر آبرو نہیں گنوائی۔ اللہ کی شان آج رئیس سے سئیس بتائے جاتے ہیں۔
خواجہ صاحب نے یہ فقرہ کچھ اس انداز سے کہا کہ صاحب کے دل پر چوٹ سی لگی۔ چپراسی کی زبان درازی پر غصہ آیا۔ اگر وہ پُرانا نوکر نہ ہوتا تو شاید مار بیٹھتے

صاحب : یہ جاہل لوگ ہے۔ ہم اس کو سزا دے گا۔ آپ اسے معاف کرے۔
خواجہ : حضور جب سے ہمارا وقت خراب ہوا۔ ہم نے سب کو معاف کردیا۔
صاحب : آپ کا نام ہمیں یاد نہیں رہا۔
خواجہ : خواجہ انیس۔
صاحب : اچھا سلام!

صاحب اُدھر گئے اِدھر کہاروں نے میانہ اُٹھایا۔ بنگلے سے باہر نکلے۔

کہار : ملاقات ہوگئی سرکار۔ اب مکان چلیں؟
خواجہ : یہ تو بھئی کوئی ولایت کا قسائی تھا۔ کہنے لگا کہ فوج میں بھرتی ہوجاؤ۔
کہارؑ : رام رام صورت بھی کیسی جانگلو کی سی ہے۔
کہارؒ : سرکار کی ذات زمات وہ کیا جانے۔
کہارؔ : یہ امیر لوگ پالکی تام جھام میں بیٹھیں یا صاحب لوگوں کا پہرہ دیں۔
کہارؑ : ارے انھوں نے بادشاہی دیکھی ہے۔
خواجہ : مگر وقت گیا اپنی بادشاہت نہ رہی اب کیا کریں۔
کہار : تو صاحب آپ کیا چاکری کریں گے؟
خواجہ : نکلے تو اسی ارادے سے ہیں۔
کہار : پھر کسی اور صاحب کے بنگلے پر چلیں۔
خواجہ : بڑے صاحب کے بنگلے پر چلو۔ وہاں کام بنے گا۔
دوسرا کہار : وہ بنگلہ لال نہیں ہے وہاں بڑے لوگ جمع ہیں۔
خواجہ : بس بس وہیں چلنا چاہیے۔

دو بنگلوں کے بعد لال بنگلہ تھا۔ ایک موٹا تازہ انگریز بڑی بڑی مونچھیں، خرانٹ صورت برآمدے میں میز کرسی لگائے چاروں طرف کوئی دو درجن مختلف قسم کے آدمی لیکن تقریباً سب ہندو یا بنگالی۔ محرّر رکھے جا رہے تھے۔ خواجہ صاحب نے میانہ رکھوایا۔ اُترے۔ چپراسی دیکھتے ہی سامنے آیا۔

چپراسی : (سلام کرکے) حضور! صاحب تو اس وقت کام کر رہے ہیں۔ ملاقات نہیں ہوگی۔

خواجہ : بھئی ملاقات کون بھڑوا کرنے آیا ہے۔
چپراسی : صاحب کو فرصت نہیں۔
خواجہ : اتنے آدمیوں سے مل رہے ہیں۔ ہمارے لیے فرصت نہیں۔
چپراسی : وہ تو نوکری کو آئے ہیں۔
خواجہ : اور ہم کیا یارانہ گانٹھیں گے۔
چپراسی : (سر سے پانو تک خواجہ کو دیکھ کر) آپ کی شان تو نوکری کی نہیں معلوم ہوتی۔
خواجہ : شان گئی ایسی تیسی ہیں۔ میاں دیکھتے کیا ہو۔ یہ ہمارا قدیمی لباس ہے۔ اچھا کھیں کیا۔ تم جاکر صاحب سے کہہ دو کہ ایک شہر کا رہنے والا نوکری چاہتا ہے۔ چپراسی نے جاکر اطلاع دی۔ صاحب نے بلایا۔ سامنے گئے جھک کر سلام کیا۔ صاحب نے ایک نئی وضع قطع کا آدمی دیکھا۔ باوجود جُلانتن آدمی ہونے کے مسکرائے اور پوچھا۔
صاحب : ول تم نوکری مانگتا ہے ؟
خواجہ : حضور ہم عزّت دار ہیں۔ باپ دادا درباری تھے۔ ہم سے اس طرح بے وقری کے ساتھ نہ بولیے۔
صاحب : ہم پوچھتا ہے تم نوکری کو آیا ہے ؟
حضور : جی ہاں۔ لیکن ہاتھ بیچتے ہیں ذات نہیں بیچتے۔
صاحب : زیادہ بات کرنا نہیں مانگتا۔
خواجہ : زیادہ بات آپ کرنا نہیں مانگتا۔ ہم تو مانگتے ہیں۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو کر میں کون ہوں۔ آبرو کی نوکری آپ کیسے دیں گے۔
صاحب : (زمین پر پانو مار کر) ہم یہ نہیں سُنتا۔ بولو نوکری کرے گا ؟
خواجہ : جی ہاں۔
صاحب : کیا جانتا ہے ؟
خواجہ : دادا جان نواب رئیس الدولہ بہادر کا محمد شاہ بادشاہ کی دور حکومت میں بڑا دور دورہ تھا لیکن کچھ بھی پڑھے لکھے نہ تھے۔ ابا جان نے بھی

خُدا مغفرت کرے کئی بادشاہتیں گزاریں۔

صاحب : اور تمہارا دماغ خراب ہے۔ ہم پوچھتا ہے تم کیا کام کرے گا۔

خواجہ : جو حضور بتائیں۔

صاحب : فارسی لکھنا پڑھنا آتا ہے۔

خواجہ : کیوں نہیں۔

کریما بہ بخشائے بر حال ما — کہ ہستم اسیر کمند ہوا

ما مقیمانِ کوے دل داریم — دل بدنیائے دوں نمی آریم

فرمایئے اور شعر پڑھوں ساری کریما اور ما مقیماں یاد ہے۔

خواجہ صاحب نے یہ دونوں شعر ایسے لہک کر پڑھے کہ صاحب بہادر چونک پڑے۔ اور جتنے امیدوار کھڑے تھے منہ دیکھنے لگے۔

صاحب : بس بس۔ تم فارسی پڑھا ہے۔ اچھا حساب کتاب کر سکتا ہے۔

خواجہ : حساب تو ہماری سات پیڑھی نے نہیں سیکھا۔ بنیوں کا کام امیرزادے کیا جانیں۔ اور یوں پہاڑے بھی آتے ہیں۔ حکم ہو تو سناؤں۔

صاحب : لیکن تم بوڑھا بہت ہے۔ کوئی اسّی برس کا عمر؟

خواجہ : اسّی سے بھی پانچ اُوپر۔

صاحب : او بہت پُرانا آدمی۔

خواجہ : حضور سُنا نہیں۔ نیا نو دن پُرانا سو دن۔ اور نوکری تو نام ہے محنت اور کارگزاری کا۔ عمر سے کیا واسطہ؟

صاحب : کام خوب کرے گا؟

خواجہ : خوب۔ بالکل جوانوں کی طرح۔

صاحب : ول ...... اچھا تم کو نوکری دیا (ایک کاغذ پر لکھ کر) تمہارا نام؟

خواجہ : نواب خواجہ انیس الرحمٰن خاں ولد نواب حسین بخش خاں ولد نواب رئیس الدولہ بہادر محمد شاہی کشمیری۔

یہ صاحب بہادر عجیب مزاج کے تھے۔ ان کا قانون ہی الگ تھا۔ ملازم رکھنے تو اپنی مرضی سے کسی لیاقت یا شرافت کی ضرورت نہ تھی۔ جہاں کسی نے ان کو جھک کر

سلام کیا ۔ دوسرے صاحب لوگوں کی برائی کی انھوں نے فوراً رکھ لیا ۔ مگر اس کے ساتھ لمبے چوڑے نام پسند نہ تھے ۔ جس قدر مختصر نام ہوتا ان کو اچھا معلوم ہوتا ۔ لوگ تو اس عادت سے واقف ۔ چھوٹے سے چھوٹا نام بتاتے ۔ خواجہ صاحب بچارے کو کیا خبر تھی ۔ اپنے نام کے ساتھ باپ دادا کے نام بھی بتائے گئے ۔ سمجھے ہوں گے کہ ولدیت بھی پوچھی جاتی ہے ۔ پہلے ہی سے کیوں نہ کہ دوں ۔

صاحب : ول ۔ ہم اتنا فارسی نہیں جانتا ۔ نام پوچھتا ہے اُردو میں بتاؤ ۔

خواجہ : صاحب ۔ فارسی میں نہیں بولتا ۔ نام کی فارسی کیسی ؟

صاحب : اچھّا پھر بولو ۔

خواجہ : نواب خواجہ انیس الرحمٰن خاں ولد نواب حسین بخش خاں مرحوم ولد نواب رئیس الدولہ بہادر مبردر محمد شاہی کشمیری ۔

صاحب : ادہم کو پریشان نہ کرو ۔ اتنا بڑا نام ۔ تم چلا جائے برابر ۔ ہم اتنا بڑا نام نہیں لکھ سکتا ۔ ہمارے رجسٹر میں اتنے لمبے نام کی جگہ نہیں ۔ ہم ایسے آدمی مانگتا جن کا نام بہت چھوٹا ہو ۔

خواجہ : حضور ۔ اپنا نام تو میں نے نہیں رکھا ۔ چھوٹے باپ کا بیٹا ہوتا تو نام بھی چھوٹا ہوتا ۔

صاحب : چلا جائے بس ۔ ہمارے سر میں زیادہ طاقت نہیں ۔ سلام سلام

خواجہ صاحب بڑے بھنّائے مگر کیا کرتے ۔ چلنے لگے تو دیکھا کہ ایک ہندو نوجوان نے بڑھ کر صاحب سے کہا ۔ مائی باپ میرا نام رامو ہے ایسا ذرا سا کہ آپ کہیں لکھ لیں ۔

صاحب : ول ول ٹھیک ایسا ہی نام مانگتا ہے ۔

رامو نوکر ہوگیا اور خواجہ صاحب مُنہ لٹکائے چلے ۔ سوچا کہ کسی طرح نام چھوٹا کرنا چاہیے ۔ معلوم ہوا کہ بڑا نام بھی صاحب لوگوں کو پسند نہیں ۔ اب کہاں جائیں ۔ بڑے صاحب سے اور ملنا چاہیے ۔ آکر میانہ میں بیٹھے اور کہا چلو ۔

کہار : سرکار نوکری مل گئی ہے

خواجہ : ارے بھئی یہ تو نرا گاودی تھا ۔ نام ہی پر اٹک گیا ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ

کوئی پُر کٹا ہے۔ ہماری قدر کیا جانے۔ اسے تو رامو۔ بھولو۔ للّو۔ بدلو پسند ہیں۔ اب تم بسم اللہ کر کے درِ دولت پر چلو۔

کہار : درِ دولت ہم کا جانیں۔

خواجہ : ارے درِ دولت نہیں جانتے۔ حاکم وقت کے کاشانۂ مبارک کو درِ دولت کہتے ہیں۔

کہار : کاسانہ واسانہ ہم نے نا دیکھا۔ بڑے صاحب کے بنگلہ جلیں کہ ہندو راؤ کی کوٹھی یہ دونوں تو ہم نے دیکھے ہیں۔

خواجہ : ارے وہی ہندو راؤ کی کوٹھی۔

کہار : تو پھر یہ کہو (دوسرے کہاروں سے) دھر لیو سیدھی سڑک۔ پرے پار۔

تھوڑی دور چلے تھے کہ فرمانے لگے "ارے بھئی کہارو! یہاں تو ہمارے سوا کوئی آتا دکھائی دیتا ہے نہ جاتا۔ قلعہ آباد تھا تو اس کے گردا گرد کیسا میلا سا لگا رہتا تھا۔ یہ کیسے بادشاہ آئے کہ ساری سڑکیں بھی سنسان ہو گئیں۔ نہ پالکیاں نظر آتی ہیں نہ میانے۔

ایک بوڑھا فقیر بھی اپنی صدا لگاتا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے جو خواجہ صاحب کو دیکھا اور ان کی باتیں سنیں تو بولا "بابا اگلے وقتوں کے معلوم ہوتے ہیں۔ پالکی میانے والے ہی نہ رہے تو پالکی میانے کہاں سے دکھائی دیں"

خواجہ : درِ دولت پر تو ہجوم ہوتا ہوگا۔

فقیر : کیسی درِ دولت اور کس کا ہجوم؟ پرانی باتوں کو یاد کر کے کیوں اپنا دل دکھاتے ہو۔ بڑی بڑی حویلیاں کھد گئیں۔ باغ ویران ہو گئے۔ ان انگریزوں کو تو مانس گند آتی ہے۔ جنگل میں رہتے ہیں۔ بابا آنکھ کھول کر دیکھ۔ خانم کا بازار، خاص بازار، زینت باڑی، عزت باڑی، بیگم کا باغ۔ تیس ہزاری کے کہیں نشان ہیں؟

خواجہ صاحب نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ فقیر نے اپنا راستہ لیا اور کہار ہوں ہوں کرتے چڑھائی پہ چڑھ کر ہندو راؤ

کی کوٹھی کے احاطہ میں جا ٹھہرے۔
کہار : سرکار۔ سرکار۔ درِ دولت آگئی۔
خواجہ صاحب اونگھ گئے تھے۔ شانہ پکڑ کر ہلایا تو اُٹھے "کیوں بھئی درِ دولت آگئی؟"
کہار : آگئی۔
خواجہ : بھئی یہاں تو نہ نوبت بج رہی ہے نہ چوب دار نظر آ رہے ہیں۔
کہار : اس کا آپ جانیں۔
خواجہ : خیر بھئی یہ کایا پلٹ بھی قسمت میں دیکھنی تھی۔

سامنے ایک انگریز میم کے ساتھ ننگے سر ٹہل رہا تھا۔ نوجوان خوبصورت آدمی۔ ان دونوں نے جو ایک نئی برزخ کا بوڑھا میانے پر لدا ہوا دیکھا تو مسکراتے ہوئے آگے بڑھے۔ پوچھا "ول آپ کس سے ملنے آیا ہے؟"

خواجہ صاحب گھبرائے کس کا نام بتائیں۔ انھیں یہ بھی خبر نہ تھی کہ اس کوٹھی میں رہتا کون ہے۔ کہنے لگے "حضور کے مجرے کو۔"

یہ انگریز کوئی عہدے دار نہ تھا مگر طبیعت با مذاق پائی تھی۔ ہنسی کو روک کر کہا "ہمارا نام آپ جانتا ہے؟" سوال ذرا ٹیڑھا تھا۔ خواجہ صاحب چکرائے۔ انگریزوں کے نام ان کو کہاں آتے تھے کہ کچھ کہہ دیتے۔ فرمایا "آپ بڑے صاحب ہیں نواب روشن الدولہ بہادر" یا وحشت نام بھی یاد آیا تو محمد شاہی امیر کا۔ پھر بڑے صاحب کو روشن الدولہ کہا۔ اور کیا کہتے؟ شاہی میں وزرا اُمرا کے ایسے خطابات ہوا کرتے تھے۔ مٹکاف، ڈنکن، ڈنلاپ، فٹز پیٹرک ان کی زبان پر کہاں سے آتے؟

صاحب نے قہقہہ لگایا۔ میم اُردو نہیں سمجھتی تھی وہ تعجب سے پوچھنے لگی "کیا بات ہے؟"
صاحب : یہ بوڑھا آدمی شاید دیوانہ ہے ہم کو بڑا صاحب جانتا ہے اور روشن الدولہ نام بتاتا ہے؟
میم : اپنا نام؟

صاحب : نہیں ہمارا نام۔
میم : ایسا پاگل ؟ اچھا پھر پوچھو۔
صاحب : ول ہمارا کیا نام ہے ؟

خواجہ صاحب ان دونوں کے گٹ پٹ کرنے قہقہے لگانے سے سمجھ گئے کہ یہاں دال نہیں گلے گی۔ رونکھی صورت بنا کر بولے "صاحب ہم شامت کے ماروں پر آپ کیا ہنستے ہیں۔ ہمیں تو جو نام یاد تھا بتا دیا۔ اب حضور وہ نہیں سہی۔ خانہ آباد دولت زیادہ۔"

صاحب : (کسی قدر متاثر ہو کر) آپ کا نام ؟

خواجہ صاحب ابھی ابھی اپنا پورا نام بتا کر دھتکار کھا چکے تھے بولے اُس کمترین کو نتھو کہتے ہیں۔"

صاحب : ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ کا یہ لباس آپ کی یہ صورت اور ایسا چھوٹا سا نام۔
خواجہ : اب تو یہی نام ہے۔
صاحب : او یہ کیسی بات۔ آپ نام بھی بدل لیتا ہے ؟
خواجہ : جی ہاں۔ میرا نام خواجہ انیس الرحمٰن خاں تھا۔ لیکن صاحب لوگ اتنا لمبا نہیں مانگتے لہٰذا میں نے نتھو رکھ لیا۔
صاحب : کون صاحب لوگ ایسا کرتا ہے ؟

خواجہ صاحب نے سارا قصّہ سنایا۔ صاحب ہنسا بھی اور افسوس بھی کیا۔ میم کو سمجھایا تو اس نے بھی تعجب کیا کہ شریفوں کے ساتھ ایسے بیہودہ برتاو۔

خواجہ : بندہ اب رخصت ہوتا ہے۔
صاحب : ہم کو بہت افسوس ہے کہ ہم آپ کے واسطے کچھ نہیں کر سکتا۔ اچھا سلام۔

الغرض خواجہ صاحب اپنا سا مُنہ لیے میانے میں بیٹھے۔ کہاروں نے پوچھا "سرکار نوکری ملی ؟" خواجہ صاحب بولے "ارے بھئی یہ کیا نوکری دیں گے۔ ہم نے آج نوکری کے خیال پر بھی لعنت بھیج دی۔"

کہار : پھر گھر چلیے۔
خواجہ : چلو بھئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ بیٹھے بٹھائے شیطان نے انگلی دکھائی۔ عورت ذات کے کہنے میں آ گئے۔ اب کھائی سو کھائی، آگے کھاؤں سو رام دہائی۔ چوبے جی گئے تھے چھبے ہونے دوبے ہو کر آئے۔ آیندہ گھر سے نکلنے والے کی ایسی تیسی۔

وہ اسی طرح راستے بھر بڑبڑاتے رہے۔ گھر پہنچ کر بیگم صاحبہ سے جھڑپ ہوئی۔

بیگم : کہو، کیا کر آئے۔ کس کس سے ملے؟
خواجہ : (چُپ)
بیگم : چُپ شاہ کا روزہ رکھا ہے؟
خواجہ : تمھاری بات جب مانی جب ذلیل ہوا۔
بیگم : میری بات مانتے تو یہ دہاڑے نہ ہوتے۔
خواجہ : کون سی بات نہیں مانی؟
بیگم : اور مانی کون سی؟
خواجہ : صبح سے اب تک تمھارے کہنے سے دھکّے کھائے یا کسی اور کے؟
بیگم : نہ گئے ہوتے۔ میں نے ہاتھ جوڑے تھے؟
خواجہ : نوکری کرنے کی صلاح دی تھی یا نہیں؟
بیگم : صلاح دینے میں بھی گناہ ہے؟
خواجہ : میں کہتا ہوں کہ مجھے غصّہ نہ دلاؤ۔ جیسی ذلّت آج اٹھائی ہے۔ عمر بھر نہیں اٹھائی تھی۔ کافر ہو جو اَب نوکری کا خیال بھی کرے۔ اور یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے۔
بیگم : ہاں ہاں۔ میں نے ہی مرہٹوں سے تمھاری جاگیر چھنوائی۔ میں نے ہی کہا کہ تم گھر میں بیٹھے اٹکن بٹکن کھیلا کرو۔ میں نے ہی تمھیں بے روزگار بیٹوں کا بیاہ کرنے کی صلاح دی۔ میں ہی ایسے داماد لائی جو جواری ڈھنڈاری نکلے۔ اپنے گریبان میں مُنہ نہیں ڈالتے۔ کوئی بھی ایسا کام کیا جو مردوں کو

زیب دیتا ہے۔ ایک تو وہ تھے جو خاک سے پاک ہوئے۔ آپ دار سے روشن الدولہ بنے۔ کیسا نام پیدا کیا۔ ایک تم ہو کہ تین بادشاہتیں دیکھیں اور موچی کے موچی رہے۔

خواجہ : صاحب میں طعنوں ہی کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ اولاد ہے وہ الگ کھائے جاتی ہے۔ تم ہو سو جُدا گودنے لگیں۔ میری قسمت۔

بیگم : تم سدا قسمت ہی کو پیٹا کرتے ہو۔ تم نے بھی ہاتھ پانو ہلائے۔

خواجہ : ہمارے باپ دادا نے تو بڑی تلواریں ماری تھیں۔

بیگم : تلواریں نہیں ماریں تو دادا میں کوئی ایسا کمال تو تھا کہ محمد شاہ کو رجھا لیا۔ اور اتنا کمایا کہ تم نے آج تک کھایا۔ اپنی کہو کہ الی الذی نہ اُلی الذی۔ کوئی بات تو پیدا کی ہوتی۔

خواجہ : خیر اب تم مجھے کھولاؤ تو نہیں۔ آخر صبح سے اس وقت تک جھک مارنا تو پھرا۔

بیگم : اچھا پھر کیا کیا؟

خواجہ : اپنی ایسی تیسی۔ کسی نے کہہ دیا کہ جاگیر دینے کا ہمیں اختیار نہیں۔ کوئی بولا کہ تم بوڑھے بہت ہو۔ کہیں ہمارے نام کی ہنسی اڑائی یہ بادشاہ ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

بیگم : یہ تو سچ کہا۔ کیا تم بوڑھے نہیں؟ قلعے کی بات اور تھی۔ وہ اپنے گھر کے کوڑے کو بھی سمیٹ لیتے تھے۔ دوسرا کوئی کیوں گھُن لگا ایندھن خریدے؟ یہ جھک جھک چل رہی تھی کہ لونڈی نے آکر کہا کہ کوئی صاحب لکھنؤ سے آئے ہیں۔

بیگم : یہ لکھنؤ سے کون آگیا؟

خواجہ : دیکھتا ہوں (کچھ سوچ کر) اوہ! کہیں میر خوشبو تو نہیں آگئے۔ کئی دن ہوئے ان کا خط بھی آیا تھا۔ (لونڈی سے) ارے بخشا سے کہہ دے کہ انھیں بیٹھک میں بٹھائے۔ پیچوان بھر کرے جا۔

بیگم : کون ہیں؟ میر خوشبو تو آج ہی نام سُنا ہے۔

خواجہ : ہماری طرح یہ بھی نوابوں کی اولاد ہیں۔ سدا کس کی رہی ہے۔ بچارے تباہ ہو گئے۔ عطر تیل بیچنے لگے۔ نام تو میر خورشید علی خاں ہے۔ یار لوگوں نے میر خوشبو کہنا شروع کر دیا۔ وقت کی خوبیاں ہیں۔ اللہ کی شان ہے۔ ایرے غیرے نتھو خیرے امیر بن بیٹھے اور جو پوتڑوں کے امیر تھے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔

بیگم : کوئی تم ہی جیسے ساون کے اندھے، تقدیر کو رونے والے ہوں گے۔

خواجہ : خیر صاحب ہم بُرے بُرے بُرے۔ جیسا خدا نے بنا دیا۔ اب اچھے کیونکر بن جائیں۔ ذرا خاطر داری کا خیال رکھنا۔ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔

بیگم صاحبہ مدارات کے انتظام میں لگیں۔ خواجہ صاحب باہر تشریف لائے۔ واقعی میر خوشبو تھے۔ لکھنؤ کے آثارِ قدیمہ کا نمونہ۔ خواجہ صاحب کے ہم سن۔ جس وقت آمنے سامنے کھڑے ہوئے یہ معلوم ہوتا تھا کہ عجائب خانے سے نیلام میں کوئی دو قدیم پتلے خرید لایا ہے۔ ہاتھ ملائے گلے ملے۔ دونوں کے آنسو نکل پڑے بیٹھے۔ مزاج پرسیاں ہوئیں۔

خواجہ : حضرت۔ آپ نے تو صورت کو ترسا دیا۔ یا تو ہر سال تشریف لاتے تھے۔ یا آج پچیس برس کے بعد تشریف لائے۔

میر خوشبو : قبلہ آپ کا شکوہ سر آنکھوں پر۔ مگر لکھنؤ کیا اُجڑا ہم ہی اُجڑ گئے۔ بادشاہت لُٹی تھی سو لُٹی تھی۔ شہر بھی اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ عطر تیل بیچنے کے بہانے سے گزر ہو جاتی تھی۔ بڑی بڑی ڈیوڑھیاں تھیں۔ عام لوگ شوقین بیس بیس روپے سیر کا تیل سر میں ڈالنے اور تیس تیس روپے تولہ کا عطر لگانے والے۔ طوائفیں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر خریدار۔ جہاں بیٹھا تو سوا سو روپے سے کم کا بیچ کر نہ اُٹھا۔ اُسی زمانے میں دلّی بھی اکثر آنا ہوا ہے۔ یہاں بھی ماشاء اللہ اچھے اچھے امیر تھے۔ دو عملی ہوتے ہی فیض آباد چلا گیا۔ راستے میں تین برس بنارس میں رہا۔ جہاں پناہ قید ہو کر کلکتے چلے تو اُن کے ساتھ ہو لیا۔ وہاں کا رنگ بگڑا، مٹیا برج میں خاک اڑنے لگی تو پھر اُلٹے پاؤں لکھنؤ کا رُخ کیا۔ خبر ملی کہ دلّی میں غدر ہو گیا۔ لکھنؤ میں لوٹ مچ گئی۔ اب

ہم کیا کرتے ۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن ۔ جہاں کے تہاں سر چھپائے پڑے رہے۔ امن و امان ہوا تو برسوں کے بعد گھر پہنچے ۔ ہائے ہائے ہر طرف ہو کا میدان پایا ۔ مکان ہیں مکیں نہیں ۔ اس سرے سے اُس سرے تک ساری سبھا لٹی ہوئی ۔ شہر اب بھی آباد ہے ۔ لوٹے پھوٹے رئیس بھی موجود ہیں لیکن حضت ہم نے جو سماں دیکھا تھا وہ کہاں ؟ نوابوں کے ہاں گئے تو منہ چکنا پیٹ خالی ۔ طوائفوں کی حویلیاں ، کھلے ہوئے اڈے ۔ نہ جانے کہاں کی گنواریاں آمری ہیں شہر میں جدھر نظر پڑی پر دیسی عجیب عجیب بولیاں بولتے ہوئے ، انگریزی خیالات ۔ لکھنؤ کو تو خاصا چوں چوں کا مربا سمجھو ۔ اب فرمائیے اہلِ آبرو کیا کریں ۔ چنڈو کا چرچا نہیں ۔ افیم کا ٹھیکہ ہو گیا ۔ مرغ ، بٹیر ، کنکوے لڑانے والے مرکھپ گئے ۔ جو ہے بابو ، بابو گٹ پٹ کرنے والا ۔ کوئی شریف ، اگلے طور طریق کا میرزا منش ہمیں تو دکھائی دیا نہیں ۔ یاد ہوگا جب آپ لکھنؤ گئے تھے کیا بہار تھی ۔ روز مشاعرے ، روز پالیاں ۔ دوسرے تیسرے کنکووں کے میدان ہیں ، چوک پرستان کیسی کیسی صورتیں تھیں اور غضب سنو اُستاد فجو خاں کو پکڑ کر قید کر دیا ۔ خطا یہ کہ اس کی دکان پر چار اُجلے پوش بھلے مانس چوری چھپواں چنیا بیگم سے شغل کر لیا کرتے تھے ۔ مرزا جانی کے ہاں کعبتین ہوتی تھیں ۔ بڑے بڑے نواب زادے اپنا شوق پورا کر جاتے ۔ کہو اس میں کسی کا اجارہ ہے ؟ محتسب را درونِ خانہ چہ کار ، اپنا پیسا ہے کھوتے ہیں اور کھونا کیا معنی ۔ ایک ہارے گا تو دوسرا جیتے گا ۔ اس کوٹھی کے دھان اُس کوٹھی میں لیکن نہیں وہ شریفوں کو تنگ کرنا ہے ۔ اس غریب کا وہ ناک میں دم کیا کہ شہر چھوڑتے بنی ۔ بھلا اس شریف گردی میں ہم جیسے اگلے وقتوں کے لوگوں کا کیا ٹھکانا ؟ کس سے ملیں کہاں جائیں ؟ بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ دلی ہی چلو شاید وہاں کوئی روزگار کی شکل نکل آئے ۔ تھوڑے سے عطر بھی لایا ہوں ۔ اب قبلہ آپ فرمائیے دلی کا کیا حال ہے ؟

خواجہ : (ایک آہ بھر کر)

آہم صفیر مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

میر صاحب کیا پوچھتے ہو۔ دلیّ کو دیکھو گے تو پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔ آپ کے وہاں سے تو صرف نوابی رخصت ہوئی، بہار گئی چمن تو سلامت ہے۔ یہاں تو ایسے اولے پڑے کہ پھر پنپنے کی اُمید نہیں۔ جتنے آبرودار تھے۔ ایک ایک کو چُن چُن کر پھانسی پر چڑھا دیا۔ میں تو کئی برس کے بعد آج گھر سے نکلا تھا۔ سر پیٹ لیا۔ اگلی سی کوئی بات نظر نہ آئی۔ پھر حاکم ہیں تو عجیب۔ نہ دربار نہ بات چیت میں سلیقہ۔ انعام نہ اکرام گفتگو دیکھو تو پہاڑی کے پتھر لڑھک رہے ہیں۔ لباس ہے تو تلنگوں سے بدتر۔ نہ جامہ نہ دستار۔ ننگے سر۔ وِل وِل کے سوا دوسرا کلمہ نہیں۔ بھیّا افسوس تو یہ ہے کہ ہم پر کوئی گور کیوں نہ پڑ گیا۔ قلعے میں سنا گورے رہتے ہیں۔ کیسی کیسی حویلیاں تھیں! کیسے کیسے نامی نام دار امیر تھے! نجیبوں شریفوں سے گلی گلی کوچہ بھرا پڑا تھا۔ آج یہ بھی سنسان ہے۔ جن کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں قبرستان میں بھی اُن کا پتا نہیں۔ زمین کھا گئی یا آسمان۔ کس سے پوچھیں۔ اب تم آئے ہو۔ دیکھ لینا۔ لکھنؤ کا ماتم تو وہاں کر آئے، دلیّ کا مرثیہ یہاں کے در و دیوار سے سُننا۔

میر باقر علی

غدر کے بعد سے دِلّی پر کچھ ایسی ساڑھ ستی آئی کہ اوّل تو پُرانے گھروں کا نام و نشان ہی مٹ گیا۔ نہ مکان رہے نہ مکیں۔ سارا شہر ہی بارہ باٹ ہوگیا۔ اور جن کی نال نہیں اُکھڑی وہ پیٹ کی خاطر تتر بتر ہوئے۔ روٹی کی تلاش میں جس کو دیکھو خانہ بدوش۔ بارہ برس ہوئے ملازمت کے سلسلے میں دیس نکالا جو ملا تو دلی کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ وہ تو خدا بھلا کرے بادشاہ سلامت کا۔ نہ وہ دلی میں دربار کرتے نہ میرا یہاں آنا ہوتا۔ تقدیر میں ایک مرتبہ پھر دلی دیکھنی تھی آگیا ورنہ یوں ہی روزی کی اُلسیٹ میں ترستا ہوا مرجاتا۔

رات کے وقت ریل سے اترا۔ بیوی بچے ساتھ تھے۔ مگر آیا تو عجیب نقشا۔ اسباب کوٹھریوں میں بند، اُجڑا ہوا اسماں۔ سفر کی تھکن تھی۔ یوں ہی زمین پر بچھونے کر سو گئے۔ صبح سے درستی شروع کی، دو روز اسی ٹیٹک منجا میں لگ گئے۔ گھر سے باہر تک نہ نکل سکا۔ وطن مکان کی چار دیواری کا تو نام نہیں۔ تیسرے دن باہر نکل کر سوچ رہا تھا کہ پہلے کہاں چلنا چاہیے۔ راہ گیر آجا رہے تھے۔ سب شکلیں اجنبی۔ بیسیوں بوڑھے جوان گزر گئے۔ نہ میں نے کسی کو پہچانا نہ مجھے کسی نے جانا۔ اتنے میں ایک صاحب مُنخنی سے جیسے سفید انچور کی پھانک نیچی نظریں کیے سامنے سے چلے۔ ان کی صورت کچھ جانی پہچانی سی دکھائی دی۔ ان کی نظر جو مجھ پر پڑی، ٹھٹکے اور بولے "آپ کا اسم مبارک؟" میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ دربار کے سبب، سی آئی ڈی کا

بڑا زور تھا۔ گمان ہوا کہ کوئی خفیہ پولیس والا ہے، کون جواب دے کر الجھن میں پڑے۔ ایک منٹ انتظار کر کے انھوں نے پھر مجھے مخاطب کیا "جناب میں آپ سے عرض کر رہا ہوں۔"

میں : (ذرا تیوری چڑھا کر) جناب کو میرے نام سے مطلب ؟

وہ : بس جناب جو میں معلوم کرنا چاہتا تھا معلوم ہو گیا۔

میں : کیا ؟

وہ : آپ کو دہلی شریف سے کوئی نسبت نہیں۔

میں : پھر آپ نے کہاں کا رہنے والا سمجھا ؟

وہ : کم از کم جمنا پار کا۔

میں : (کسی قدر بھنا کر) چلیے اپنا کام کیجیے۔

وہ : حضت یہ زمانہ بے کاری کا ہے کام کہاں ؟

میں یاد کر رہا تھا کہ یہ آواز اور یہ بول چال تو سُنی ہے، کہاں سنی ہے. کب سنی ہے ؟ سمجھ میں نہیں آیا. صورت حافظے میں آتی اور نکل جاتی۔ انھوں نے مجھے خاموش دیکھ کر فرمایا: "آپ نے یہ مکان کرایہ پر لیا ہے ؟"

میں : بندۂ خدا تم تو سربِشں بن گئے۔ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔

وہ : بھئی دِلّی کی بولی تو خاصی بولتے ہو۔ بیوی کا صدقہ ہے شاید۔

مجھے اس فقرے پر کچھ ہنسی سی آئی اور میں نے کہا۔ "جناب آخر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں ؟"

اُن کی داہنی بغل میں ایک خاصی بڑی پوٹلی سی تھی جسے ایک ایک دو دو منٹ کے بعد سہارتے سنبھالتے جاتے تھے اور بائیں ہاتھ میں ایک بستہ سا اس طرح چھاتی سے لگا ہوا جیسے بڑی جماعتوں کے طالب علموں کا قاعدہ ہے. دروازے کی چوکی پر اپنا پوٹلا رکھتے ہوئے بولے "جناب اجازت ہے ؟" میں نے عرض کیا "شاید آپ کے ہاں کاو برآری کے بعد اجازت طلبی کا دستور ہے ؟" خدا جانے انھوں نے میرا یہ فقرہ سُنا یا نہیں وہ اپنا بستہ کھولنے میں مصروف تھے۔ بستے میں چھوٹی چھوٹی کتابیں تھیں۔ کتابیں کیا دو دو تین تین جزو کے رسالے (ایک کتاب

میرے آگے کر کے) "حضرت دلّی کی کانا باتی بھی سنی ہے" ملاحظہ ہو۔ پرانی کہانیاں ہیں۔ یہ دیکھیے پاجی پڑوسی، خلیل خاں اور فاختہ، پڑھیے اور ہنسیے، بادشاہ کا مولا بخش ہاتھی، قلعے کی آبادی کے زمانے کا ایک قصّہ ہے۔ سیاسی رنگ مزاج پر غالب ہو تو گاڑھے خاں کا دُکھڑا اور ململ جان کی انوٹھیں لیجیے۔ قیمت کچھ زیادہ نہیں سوا روپے میں پورا سٹ!

کتابوں کے عجیب نام سُن کر میں نے کتابیں ہاتھ میں لیں۔ ایک کتاب کے ٹائیٹل پر نظر پڑی تو مصنّفہ میر باقر علی داستان گو۔ فوراً میر صاحب کی تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی۔ اب جو حُلیہ ملاتا ہوں تو خود بدولت ہیں۔ وہی وضع وہی قطع، وہی لٹھے کی گول خانہ ساز ٹوپی، کانوں سے رومال لپٹا ہوا۔ وہی چوڑی آستینوں کا کُرتا، وہی چھینٹ کی ادھ سیری نیمہ آستین، وہی سوا انچی چگّی ڈاڑھی، وہی پوستینوں کی سی آنکھیں، وہی مَل گجا مَل گجا چہرے کا رنگ۔ میری آنکھوں کا قصور رہا ورنہ اُن کی شباہت میں فرق نہ تھا۔ ہاں کسی قدر جُھرباگئے تھے۔

میر صاحب کو پہچاننے کے بعد مجھے کہاں تاب تھی، لپٹ گیا۔ ہائیں میر صاحب آپ ہیں؟ واللہ غضب کیا۔ آخر یہ کون سی عیّاری تھی۔ کیا سچ مچ آپ نے بھی مجھے نہیں پہچانا تھا۔

میر صاحب : نہ پہچاننے کے کیا معنی؟ میں جب ادھر سے گزرتا تھا آنکھیں آپ کو ڈھونڈتی تھیں۔ میاں کب آئے؟

میں : اوہو! کتنے عرصے بعد ملنا ہوا ہے!! گذشتہ اتوار کی رات کو آیا ہوں۔ آپ نے کس سے سن لیا۔ میں تو ابھی کہیں گیا بھی نہیں۔

میر صاحب : میرے دل کو خبر ہوگئی تھی۔

میں : اور آپ نے مجھے پہچان لیا؟ مجھ میں تو زمین آسمان کا فرق ہوگیا ہے۔

میر صاحب : میاں ہم لوگ نئی روشنی کے نہیں کہ ظاہر میں اُجالا اور دل میں اندھیرا۔ جو آنکھوں میں بس گیا بس گیا ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

میں : کیا کہوں آپ کو دیکھ کر کس قدر خوشی ہوئی ہے۔

میر صاحب : تمھاری سعادت مندی ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم۔ اچھا آداب عرض کرتا ہوں، انشا اللہ پھر کسی وقت ملاقات ہوگی۔

میں : مگر یہ تو فرمایئے کہ یہ کتابیں آپ نے کب لکھیں اور کب چھپوائیں؟

میر صاحب : پڑھو گے تو معلوم ہو جائے گا۔

میں : اور اس پوٹلی میں کیا ہے؟

میر صاحب : چھالیا! کتابیں بھی بیچتا ہوں اور چھالیا بھی۔

میں : آپ چھالیا بھی بیچتے ہیں؟ داستان گوئی کا سلسلہ ختم؟

میر صاحب : تم دلی کو اب کیا سمجھتے ہو۔ کایا پلٹ گئی۔ بجلی کی روشنی میں پرانے دلیوٹ کو کون پوچھتا ہے۔ میاں " اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے" خدا حمالی کرائے دلالی نہ کرائے۔ آبرو کے ساتھ بسر کرنے کی آخر کوئی شکل تو ہونی چاہیے۔

میں : لیکن کہاں وہ سبق آموز اور شریف فن، کہاں یہ چھالیا فروشی۔ کیا آپ اس میں خوش ہیں؟

میر صاحب : ارے صاحب خوشی تو دلی والوں کی خوش اقبال کے ساتھ رخصت ہوئی۔ آج جو خوش ہوتا ہے دراصل خوشی کو منہ چڑاتا ہے اور میں تو بھئی داستان گوئی سے چھالیا بیچنے میں زیادہ خوش ہوں۔

میں : بھلا کیوں؟

میر صاحب : قبرستانوں میں جا کر سناؤں؟ زندوں میں تو کہیں چرچا رہا نہیں، کیونکر رہے؟ جو ہے زبان سے ناآشنا، اگلے وقتوں کی معاشرت پر منہ آنے والا۔ اگلے انسانوں کو انسان ہی نہیں سمجھتا۔ زندگی کا فلسفہ ہی بدل گیا ہے۔ بچے کھچے کچھ لوگ رہ گئے تھے جن کے ہاں کبھی کبھی جا کر بزرگوں کی فاتحہ پڑھ آتا تھا۔ اُن کی صحبتیں بھی درہم برہم ہو گئیں۔

میں : لیکن چھالیا بیچنا تو بہر حال آپ کی شان کے خلاف ہے۔

میر صاحب : شان، ہاتھی کا نشان، میاں شان کا مفہوم دنیا نے غلط سمجھ رکھا ہے۔ دوسرے داستان کی طرح میں نے اس میں بھی کمال پیدا کیا ہے۔ میری چھالیا کھا کر دیکھو داستان کا مزہ نہ آئے تو کہنا۔ بات یہ ہے کہ پان کھانا دِلّی والے بھولتے جاتے تھے (ہنس کر) میں نے انھیں پھر سکھانا شروع کیا ہے اور پنجابی تک کہنے لگے ہیں کہ آہو میر صاحب ہُن پان دا سواد آیا۔

میں : (تعجب سے) آپ کا مطلب میں سمجھا نہیں۔ دِلّی والے پان کھانا کس طرح بھول گئے؟

میر صاحب : اپنی معاشرت بدل کر۔ اپنے بڑوں کی ہنسی اُڑاتے اُڑاتے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اگر کچھ دن اور پان کھانے والوں میں بے شعوری بڑھتی رہی تو ہمارے تمدّن کی یہ چیز بھی گئی۔ سوچتے سوچتے یہ سمجھ میں آیا کہ چھالیا بیچو۔ چنانچہ اس کی تجارت شروع کر دی۔ اب جہاں چھالیا لے کر جاتا ہوں میرا فرض ہے کہ پان کھانے کا سلیقہ بھی بتاؤں۔

میں : پان کھانے میں بھی سلیقے کی ضرورت ہے؟

میر صاحب : سبحان اللہ۔ پھر آدمی گھاس کے پتّے نہ چبا لے۔ میاں تمھارے بڑوں نے جانوروں کی طرح پیٹ بھرنے کے لیے پان نہیں کھائے۔ نہ یہ کوئی تعیّش کی چیز تھی۔

میں : پھر کیوں کھاتے تھے؟

میر صاحب : گلے، دانتوں اور معدے وغیرہ کی دوا سمجھ کر اور اس لیے وہ پان اور اس کے جملہ لوازم سے واقف ہوتے، چھالیا کیسی ہونی چاہیے۔ پان کس موسم میں کس حالت میں کون سا کھایا جائے۔ کتھا کیوں کر پکائیں۔ چونا کس طرح بجھائیں۔ آج کل پہلے کی نسبت پان زیادہ کھائے جاتے ہیں۔ جسے دیکھو پنواڑی کی دکان پر کھڑا ہے۔ یا ڈبیا جیب میں ہے۔ بکر بکر چبائے جاتا ہے۔ مگر پوچھو کیا کھایا، پان یا پیپل کا پتّا۔ چھالیا یا پنساری کی دکان

کا کوڑا تو دانت نکوس دیتے ہیں۔ ایسوں ہی نے تو ہمیں بدنام کیا ہے۔ ہماری معاشرت میں کیڑے ڈلوائے ہیں۔

میں : تو کیا داستان کہنی بالکل چھوڑ دی۔

میر صاحب : ؎

بُلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی　　بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا　　ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

یوں دو چار لگے بندھے ٹھکانے ہیں۔ کبھی بُلایا جا بیٹھا۔ داستان کیا، وقت کے مطابق کوئی چٹکلا سُنایا۔ دل بہلایا۔ اپنا نہیں بلانے والوں کا۔ اور چلا آیا۔ ہاں عزیب خانے پر ہفتے کے ہفتے پرانے کھنڈروں کے کچھ روڑے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور سچ پوچھو تو سر پھوڑنے کا مزہ آجاتا ہے۔ اچھا تو رخصت ہوتا ہوں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

یہ کہہ کر دو قدم چلے تھے کہ پھر پلٹے اور فرمانے لگے "بھئی خوب یاد آیا۔ اب کے ہفتے کو (انگلیوں پر گن کر) تیسرے دن جی چاہے تو عزیب خانے پر تشریف لے آیئے۔ لکھنؤ کے چند اہلِ ذوق آنے والے ہیں۔ ان کی فرمایش ہے کہ دِلّی کے رنگ کی داستان سناؤں۔ نو بجے شروع کروں گا گیارہ بجے محفل برخاست ہو جائے گی۔"

میں : میر صاحب! میں اور نہ آؤں۔ آخر دِلّی آیا کس لیے ہوں؟ مگر آپ وقت پر کسی کو بھیج کر بلوالیں تو بڑا کام کریں۔ دوسری مصروفیتوں میں شاید میں بھول جاؤں۔

دِلّی جب ہندستان کا دل تھی۔ قلعہ آباد تھا۔ اس میں زندگی کے آثار تھے۔ تو ہر فن کا صاحبِ کمال پیدا ہوتا تھا۔ فارغ البالیاں تھیں۔ قدر دانیاں تھیں۔ لوگ اپنے اپنے ہُنر دکھاتے تھے۔ دیکھنے والے کبھی بطور پرورش کبھی "اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ماخوش کردی" کے مصداق اور کبھی شانِ امارت دکھانے کے لیے دل بڑھاتے رہتے تھے۔ جب تک سپاہیانہ جوش اور فتوحات کے ولولے رہے اندر اور باہر کا وہی نقشا تھا۔ تیر اندازی، شمشیر زنی کشتی، گھوڑے کی سواری کھیلوں میں داخل تھی۔

وہ وقت نہ رہا۔ حکومت دوسرے رنگ پر آگئی تو رزم نے بزم کی صورت اختیار کرلی۔ خون آشامی کے جذبات مرغ بازی، بٹیر بازی وغیرہ میں اور سواری شکاری کے خیالات، ناچ رنگ اور دوسرے تفریحی مشاغل میں بدل گئے۔ حیاتِ متحرک پر جمودی کیفیت طاری ہوئی۔ تمام دن مسند تکیہ لگائے بیٹھنے میں اعصاشل ہوجاتے تھے، راتوں کی نیند بدمزہ ہونے لگی۔ لوریوں کی ضرورت پڑی۔ قصے کہانیاں شروع ہوگئیں۔ یہ گویا داستان گوئی کی ابتدا ہے۔ خواہ اس کا موجد ایران ہو یا ہندستان، لیکن ہے یہ قوم کی غنودگی اور حکومت کی افسردگی کے دور کی پیدائش۔

میر باقر علی کے باپ دادا داستان گو نہ تھے۔ ان کے نانا میر امیر علی قلعے میں قصہ خواں تھے۔ میر امیر علی ۵۷ء کی بساط کے ساتھ لپٹ گئے۔ میر صاحب کے ماموں میر کاظم علی نے قصہ خوانی سے بڑھ کر داستان گوئی شروع کی اور اس فن کو ایسی ترقی دی کہ لکھنؤ اور فیض آباد کے واجد علی شاہی قصہ خوانوں کی چیں بلوا دی۔ دِلّی والوں کا سکّہ بٹھا دیا۔ ان کی ہزار داستانی کا غلغلہ حیدرآباد پہنچا۔ سرآسماں جاہ بہادر کا دور دورہ تھا۔ شہرت کے ہاتھوں وہاں بلائے گئے۔ اور قدردانی نے ایسا پکڑا کہ وہیں کے ہو رہے۔ میر باقر علی ان ہی کے شاگرد تھے۔ ماموں بھانجے کا رشتہ استاد لاولد۔ شاگرد ہونہار اور بقائے فن کا شوق۔ خوب سکھایا اور خوب سیکھا۔ ماموں کو تو ہم نے سُنا نہیں۔ بھانجے کو سنا ہے اور پیٹ بھر کر سُنا ہے۔ کیا کہنا اس فن کے خاتم تھے۔ وہ کیا مرے کہ یہ فن ہی مرگیا۔ میر کاظم علی تو میر باقر علی جیسا شاگرد چھوڑ گئے۔ لیکن میر باقر علی نے نام کے سوا کچھ نہ چھوڑا۔ لڑکا کوئی ان کا بھی نہ تھا۔ ایک لڑکی تھی جسے انھوں نے قابلہ کی تعلیم دلائی۔ کاش داستان گوئی سکھاتے کہ اس مرحوم فن کا سلسلہ تو نہ منقطع ہوتا۔ مردوں کی نسبت عورتوں میں داستان گوئی زیادہ کارآمد ثابت ہوتی۔

امیر حمزہ اور عمر عیار کے تقریباً سارے قصے ہم نے پڑھے ہیں۔ میر باقر علی مرحوم کی داستانیں ان ہی کا ضمیمہ ہوتی تھیں۔ وہی کفر و اسلام کی جنگ آزمائیاں، وہی طلسم کشائیاں۔ وہی عیاریاں۔ مگر اُن کی طرزِ ادا، ایسی دلچسپ ہوتی تھی کہ کیا کہیے۔ اصوات و حرکات کے پورے ادا کار تھے۔ میدان جنگ کا نقشا کھینچتے تو یہ

معلوم ہوتا کہ رستم و اسفندیار کی کُشتی دیکھ کر ابھی آئے ہیں۔ بزمِ عیش کا سماں باندھتے تو فضا میں مستانہ رنگ نظر آنے لگتا۔ ہر جذبے کی تصویر کھینچنا کیا معنی خود تصویر بن جاتے تھے۔ حافظہ اس بلا کا تھا کہ دفتر کے دفتر نوکِ زباں تھے۔ کھانوں کا ذکر آیا تو الوانِ نعمت کی فہرست کھول دی۔ کشتی کا بیان کیا تو گونڈی شاہ والوں اور شیخو والوں کے سارے داؤ پیچ گنوا دیے۔ بیان کی روانی اس قدر تھی کہ کبھی کبھی حُقّے کا کش یا اتفاقیہ افیون کی چسکی لگا لینے کی سہی نہیں، ورنہ عموماً داستان شروع کرکے خاتمے ہی پر دَم لیتے تھے۔ کیا مجال ہے کہ نظم یا نثر میں کہیں ہچکی لیں یا کسی میدان میں جھول آئے۔ موسیقی سے واقفیت کا سامان تو خداساز تھا۔ ترکمان دروازے ڈوموں کی گلی کے اصلی رہنے والے تھے، جہاں کی دنیا ہی سُروں میں گُتھی ہوئی تھی۔ یہ تو تحقیق ہو نہیں سکا کہ موسیقی کا علم کس حد تک تھا۔ گلے سے بھی کام لیتے تھے یا نہیں۔ البتہ کن رسیے پورے تھے۔ بڑے بڑے جلسوں میں اچھے اچھے گویّوں کو ٹوک دیا ہے۔ آواز کی باریکیوں اور سنگیت پر اتنی اچھی نظر تھی کہ اکثر پنڈتوں سے مباحثے کے لیے تیار ہو گئے۔

آخری عمر میں طب پڑھنے کا شوق ہوا تھا۔ باقاعدہ طبیہ کالج دہلی میں جاکر لیکچر سُنتے تھے۔ طبیب بننے کے لیے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ داستان میں علمی رنگ پیدا ہو جائے، کیونکہ طبِّ اسلامی کے نصاب میں فلسفہ، ریاضی، ادب، نفسیات، منطق فلکیات وغیرہ تقریباً سارے علوم کم و بیش داخل ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی داستان میں اس بدعت سے کام لینا شروع کر دیا تھا لیکن افسوس یہ اُن کی اجتہادی غلطی ثابت ہوئی۔ کوّا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔ میر صاحب خیر اپنی چال تو نہیں بھولے، البتہ چھالیا ضرور بیچنے لگے۔ بات یہ تھی کہ میر باقر علی داستان گو تھے، علم کے کسی شعبے کے لکچرار نہیں۔ لوگ ان سے صرف اپنا دل بہلانا اور اپنے جذبۂ حیرت کی تسکین چاہتے تھے، یا دلّی کے کرخنداروں کی بولیاں ٹھولیاں سُننا مقصد ہوتا تھا۔ حقیقت میں داستان بھی اگر سائنس، فلسفہ اور حکمت کی خشکی سے متاثر ہو جائے تو قہقہے کے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

خیر آمدم بر سرِ مطلب۔ ہفتہ آیا اور اتفاق سے میں میر صاحب کے ہاں جانا بھولا

بھی نہیں، لیکن اُس دن یکایک کچھ اتنے کام آپڑے اگر میر صاحب اپنے برادرِ نسبتی کو نہ بھیجتے تو غالباً میں نہ جاسکتا اور اس نہ جانے کا عمر بھر افسوس رہتا۔ ٹھیٹ داستان گوئی کے رنگ میں بیان کی آخری داستان تھی۔ لکھنؤ والوں میں ایک صاحب طلسم ہوش ربا کے مترجم بیٹھے تھے اور انھیں دعوا تھا کہ میرے والد سے بہتر داستان گوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ اس لیے میر صاحب کو بھی اپنا کمال دکھانا پڑا۔

جاڑے کا موسم تھا۔ میں میر صاحب کے ہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چھوٹے سے دالان میں دس بارہ آدمی بیٹھے ہیں۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ طول میں پکھوائی کے قریب ایک چوکی بچھی ہوئی ہے۔ افیون کی ڈبیا، لوٹا پانی کا، دو تین پیالیاں آس پاس رکھی ہیں۔ چوکی کے آگے دیوار کی طرف ایک منحنی سا آدمی لپٹا لپٹایا بیٹھا ہے۔ آگے ڈوری میں ٹنگی ہوئی لال ٹین ٹمٹا رہی ہے۔ مدھم روشنی، میری آنکھوں پر عینک چڑھی ہوئی، کیا پہچانتا۔ سلام علیک کر کے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آواز آئی۔

"میاں بڑی راہ دکھائی۔ میں تو ہار کر داستان شروع کرنے والا ہی تھا۔"

میں : آپ ہیں کہاں؟ آواز آرہی ہے نظر نہیں آتے۔

میر صاحب : بھائی سردی ہے سردی۔ ناک کی سیدھ میں چلے آؤ میرے پاس پہنچ جاؤ گے۔

میں آگے بڑھا اور آواز پر جا پہنچا۔ اُن کی اُس وقت کی برزخ بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ سر پر روئی کا کنٹوپ جس کے دونوں سرے اوپر کو اُلٹ کر ٹوپی سی بنا لی گئی تھی۔ سیاہ زمین اور لال لال بوٹیوں دار چھینٹ کی مرزئی۔ اوپر سے خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی ڈیڑھ سیر روئی کی رضائی۔ ٹانگوں میں خاکی زین کا پاجامہ۔ پاؤں میں سُرخ دھاری دار لدھیانے کے موٹے موٹے موزے پاجامے کی موریوں کے اوپر چڑھے ہوئے۔ میں نے جو اُنھیں غور سے دیکھا تو تاڑ گئے۔ کہنے لگے "کیا دیکھتے ہو، بھولا بنا ہوا ہوں۔ سبحان اللہ اپنا لباس بھی کیسا آرام دہ ہوتا ہے۔ میاں سردی روئی سے بھاگتی ہے یا دوئی سے۔ بھائی

ہیں تو اپنی راحت اور تن درستی کو مقدم سمجھتا ہوں ۔ اب دیکھو سینے کی حفاظت کمری سے ہو گئی ۔ کان اور گردن وغیرہ کا بچاو کنٹوپ سے ہو گیا۔ رہی رضائی، اوڑھنا کا اوڑھنا ہے اور بچھونے کا بچھونا ۔ سردی لگے اوڑھ لو ورنہ گدیلا بناکر بچھالو۔ بندہ بشر ہے، کہیں رات زیادہ آجائے ، وہیں سونا پڑے تو دوسروں کے جھوٹے لحاف کی ضرورت نہ بستر کا ٹنٹا۔ جہاں نیند آئے گُنڈلی مُنڈلی مارو اور پڑ جاؤ۔"

اس مختصر سی مجلس میں میر صاحب کے کئی ہم مشرب یعنی چُنیا بیگم کے عاشق بھی تھے ۔ میر صاحب کو گھولوے کی لت کب سے تھی اور کس طرح لگی اس کا تو علم نہیں، مگر تھی اور اس حد تک تھی کہ بغیر نشہ کھٹے داستان نہیں کہہ سکتے تھے۔ البتہ اور باتیں افیمیوں کی سی نہ تھیں۔ مزاج صفائی پسند تھا۔ طبیعت میں بھی کثافت نہ تھی۔ جب پیالی چڑھا کر داستان کہنے بیٹھتے تو انجانوں کو افیمی ہونے کا شبہ بھی نہ ہوتا۔ میر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "سطحی نظر والے جانتے ہی نہیں کہ افیم کیا ہے؟ وہ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ دیکھنے میں کالی اور مزے میں کڑوی ایک شے ہے، جسے اہل ظاہر نے مکروہ کہہ دیا ہے۔ انھیں کیا خبر کہ اس کے چوگے میں ایک زبردست فلسفہ، ایک اعلا مذہب بند ہے ۔ مردانِ خدا سے پوچھو اس کا باطن کیسا لالوں کا لال ہے ۔ مولو فبلُ اَن تمو تو کی مجسّم تفسیر بن جاتے ہیں، جہاں اسے گھولنا شروع کیا اور درستی اخلاق وتزکیہ نفس کی بنیاد پڑی ۔ سرکش سے سرکش اور ظالم سے ظالم آدمی اسے پیتے ہی رحم کا پُتلا اور خدا ترس بن جاتا ہے۔ اس کے اثر سے بڑے بڑے مغرور اور خود پسند سرنگوں ہو گئے ہیں۔ ہزاروں سورما اس کی بدولت میدانوں سے زندہ آ گئے ۔ سیکڑوں پیراک پانی میں ڈوبنے سے بچ گئے ۔ اس کے صدقے میں بیسیوں صفتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ آواز میں وہ شیرینی کہ مکھیاں ہونٹ چاٹیں ۔ خیال آفرینیاں اس بلا کی کہ بوستانِ خیال کو مات کر دیں ۔ زبانی بہادری کے یہ ٹھاٹ کہ رستم واسفندیار تھرا جائیں اور منکسر مزاجی یہاں تک کہ اگر ایک لونڈا جھانپڑ مارے تو سرِ مقدس زمین کے بوسے لے کر بھی اونچا نہ ہو ۔ زبان سے سوائے منمناہٹ کے کیا مقدور ہے کہ کوئی لفظ تو اخلاق سے گرا ہوا نکل جائے ۔ تواضع کا یہ حال کہ ایک گنڈیری کے جب تک چار ٹکڑے کر کے بھائیوں کو نہ کھلالیں چین نہ آئے ۔

نو بج چکے تھے۔ میر صاحب کے ایک ہم مشرب دوست میاں فجو خاں نے پہلے تو "کسنبے" کی کٹوری پیش کی۔ یہ پی چکے تو چائے کی پیالی سامنے رکھ دی، اور بولے "ہاں جناب میر صاحب شروع کر دیجیے۔ میر صاحب "بہت مناسب" کہ کر دوزانو بیٹھ گئے، اور اپنی نسبت چند انکسار کے الفاظ کہنے کے بعد داستان کے میدان میں اترے۔ مجھے پوری داستان تو کیونکر یاد رہ سکتی تھی، نہ ایسا حافظہ نہ کل کی بات، ہاں کچھ ٹکڑے حافظے میں محفوظ ہیں۔ پیش کرتا ہوں سنیے:

مغنی خبر دہ ازاں دوستاں   کہ بودند چوں گل دریں بوستاں
چمن را تر و تازہ آراستند   چو شبنم نشستند و برخاستند

کم ترین یہ داستانِ فرحت عنوان یہاں سے گزارش کرتا ہے کہ دفتر کوچک باختر و بالا باختر ختم ہو چکا ہے اور بقائے بے بقا راندۂ درگاہ زمرد شاہ باختری مقابلہ جناب آفتاب عالم تاب دولت قاہرہ و ماہتابِ جہاں افروز سلطنتِ باہرہ۔ شکنندۂ گردنِ گردانِ گردن کشانِ عالم سلطان المعظم امیر المکرم صاحب قرانِ عرب و عجم سے بھاگ چکا ہے اور بڑے بڑے مغرور در دولت پر سرِ پُر غرور خم کر چکے ہیں۔ ان ہی ایام سرور انجام میں ایک روز کا ذکر ہے کہ میانِ بارگاہِ سلیمانی دربارِ جہاں بانی منعقد ہے اور قریب قریب سو سوا سو طائفہ ارباب ونشاط کا حاضر ہے۔ تھاپ طبلوں پر پڑ رہی ہے۔ سارنگی کا لہرا اور بائیں کی گمک آسمان کو جا رہی ہے۔ طرح طرح کے باجے۔ الغوزے، بربط، بین، بانسری، بنگ دائرہ، پرنہ، جل ترنگ، چنگ دف، ڈھولک، دمنانی، رباب، سرنائی، نفیری، سرسنگھار، طاؤس، ستار طرب جوش، قانون، کمانچہ، مردنگ، ہنجیرہ، نے نسترن بج رہے ہیں۔ ساقیان گل فام جام و صراحی لیے ہوش اُڑا رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی ہنگام عیش ونشاط میں دفعتاً ایک جوڑی عیارانِ طرار اور جاسوسانِ ہوشیار کی گرد میں آلودہ اور پسینے میں غرق بہ حضورِ شاہنشاہ والا جاہ گیتی پناہ ظل اللہ سلطان سعد بن قباد غازی حاضر ہوئے۔ حدِ ادب سے زمینِ خدمت کو بوسہ دے کر دست بستہ عرض کیا ؎

شاہا بقائے عمرِ تو بادا ہزار سال   لیکن بایں حساب بصد حشمت و جلال
سالے ہزار ماہ و ماہے صد ہزار روز   روزے ہزار ساعت و ساعت ہزار سال

سرورِ عالم کی عمر دراز ہو۔ خانہ زاد حسبِ حکم عقب لقا باختری ہیں سرگرم رفتار تھے کہ ایک درۂ کوہ مثل درِ فردوس نظر سے گزرا۔ جب اس سے سربدر کیا تو وہ عالم دیکھا کہ ؎

شجر شجر سے ہویدا ہے رنگِ بوقلموں | چمن چمن ہے بنا رشکِ طبلۂ عطّار
روش روش میں درختانِ باغ استادہ | قدم قدم پہ صنوبر جُدا قطار قطار
بچھا ہے سبزۂ صحرا میں فرشِ مخملِ سبز | کھنچا ہے روے زمیں سایبانِ ابرِ بہار
ہر ایک غنچے سے پیدا ہے یار کی شوخی | ہر ایک گُل سے ہویدا ہے رنگ و بوے نگار
نسیم مست نکلتی ہے جوشِ مستی میں | لپٹ لپٹ کے جوانانِ باغ سے ہر بار
برنگِ بادہ کشاں مست ہیں وحوش و طیور | مثالِ صوفیِ سرمست وجد میں اشجار

نمک خوار اس کیفیتِ بہار میں مصروف تھے کہ سامنے سے ایک گردِ تیرہ رنگ بلند ہوئی۔ جب قریب اس گرد کے پہنچے تو دیکھا کہ کئی ہزار فیلانِ کوہ شکوہ مست و بلند جن کی جل ہاے مکلّل تا پاشنہ لٹکتی اور کاٹھیاں پولادی جوہردار پشتوں پر کسی۔ اُن پر دو دو جوانانِ زبردست سوار ہاتھوں میں نشانِ سربلند اور اعلام فلک پیوند سنبھالے پھریرے ہوا سے اُڑاتے، اگردوپیش سانٹے مار، بھالے بردار، بان انداز، چرکٹے اگڈ اگڈ بری بری غُل مچاتے۔ ان کے بعد سانڈنی سوار، قطار در قطار سانڈنیوں کی گردنیں گودیوں میں لیے پوراسیاں لٹکتیں۔ گھنگرو بجتے۔ دروپال شتری بانات کی پہنے۔ بتّیاں سُرمئی سروں پر باندھے۔ پیچھے اُن کے نیزہ باز مرکبوں پر سوار۔ نیزوں سے نیستان پھولا نظر آتا تھا۔ ان کے بعد دو بادشاہ زبردست القاب و انصاب، نام تاج زرّین بر سر قبائیں شہنشاہی در بر۔ بیچ میں اُن کے لقاے بے بقا ایک فیلِ کوہ پیکر پر سوار۔ عقب میں اس کے یعقوب شاہ بن لقا اور بختیارک بن بختک بن الفش بن مادرش بن سگ سفید۔ . . . . . اور القا لقاے عرض کرتا جاتا تھا کہ خُداوند! میرے نام تقدیر نیاہی لشکرِ خداپرستان فرمایئے۔ لقا نے کہا کہ خداوند! درۂ آذر کوہ اور عنطلیا باد میں تمھارے ہی ہاتھ پر بربادی ان نادیدہ خُدا پرستوں کی کئی ہزار برس پہلے تقدیر فرما چکا ہے۔ یہ کہہ کر دونوں عیّار آداب بجالا پچھلے قدموں ہٹ رخصت ہوئے۔ اور یہاں بادشاہِ اسلام نے

واسطے روانگی امیر کشور گیر کو ارشاد فرمایا۔ صاحب قراں نے پہلوان عادی کو کہ ہراول لشکر تھا حکم سُنایا۔ پہلوان عادی سلام کر اپنے خیمے پر آئے اور ..... دوسرے روز لشکر ظفر اثر اور فوج دریا موج جناب صاحب قرانِ دوراں مع پانچ ہزار پانچ سو پچپن سرداران نامی۔ بہادرانِ گرامی۔ دلیرانِ صف شکن اور جوانانِ تیغ زن، تین سو زنگی، چار سو فرنگی، پانچ سو مداینی، چھے سو ہندی، سات سو خجندی، آٹھ سو ترکی، ایک ہزار عجمی، بارہ سو باختری، باقی شیرانِ بیشۂ عراق اور شاہ زادگانِ آفاق جو خاص خاندانِ قریش سے تھے مع امیر نام دار دبادشاہ اسلام و مہر سپہر عیاری قطب فلکِ خنجر گزاری شاہنشاہ و عیارانِ روزگار یعنی خواجہ عمر بن امیہ ضمیری نام دار اور شاگردانِ خاص چار مہتر چودہ سرہنگ ایک لاکھ اسی ہزار عیار و قائم مقام مہتر قران و اولاد عمر روانہ ہوا ..... بدیع الزماں کہ صاحب قرانِ کشتی گیری ہیں ان کا عالم ہے کہ ابھی گردِ گلِ رُخسار کے سبزۂ لو نے نمایش نہیں کی ہے۔ شعلۂ حُسن بے دود نظر آتا ہے۔ شجرِ قامت باغِ نوجوانی میں مائل نوخیزی ہے اور غزالِ چشم شباب میں آمادۂ شوخی ہے۔ ان کے دل میں شکار کی امنگ اٹھی۔ حکم کی دیر تھی کہ میرِ شکار نے جانورانِ صید گیر، باز، جُرّہ، باشین، کوہی، کوہیلا، تُرمتی، شکرا موسا بولے، بحری، چپک، لگڑ بگڑ۔ سیاہ گوش، چیتے وغیرہ کو درست کر درِ دولتِ شاہ زادہ پر حاضر ہوئے اور ادھر ایک مرکبِ صبا رفتار کہ سُم جس کے فراخی میں سپر۔ آنکھیں اُبلی ہوئی، جلد باریک نعل ہلال عید غنچہ سی تھوتنی، کنوتیاں چھوٹی چھوٹی، کلائیاں شیر کی سی، گردن مور کی، پٹھے ہاتھی کے سے۔ مگر چیتے کی اور رفتار کا وہ حال کہ ؎

اگر کھڑا ہو مشرق میں اور سامنے ہو اس کے غرب
ٹک اسے راکب کہے اتنا کہ چل تو یاں سے واں
پہنچے پائے صدائے ہاں نہ مُنہ سے تا بہ لب
پہنچے ہے یہ بادیہ پیمایاں سے واں اور واں سے یاں

القصہ جب وہ گردوں مقام بہ کمال تجمل و احتشام لشکر سے چار یا پانچ فرسنگ پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک دریائے ذخّار اور بحرِ موّاج کہ ہر موج جس کی مثل زلفِ جاناں پیچ در پیچ اور ہر گرداب صورتِ حلقہ کاکل، معشوقانِ فتنہ انگیز نظر آتا ہے۔ بڑے

زور شور سے مستانہ وار بہ رہا ہے اور کنارے پر اس کے ایک مرغ زار سبزہ شاداب کوسوں تک چلا گیا ہے۔ سبزۂ زمرّد گوں لہلہا رہا ہے، سبزی اور طراوت آنکھوں میں کُھبی جاتی ہے ؎

طرفہ سرسبزی نے کی ہے ہر طرف سے سرکشی — ہے زمیں فیروزہ گوں اور لاجوردی آسماں
سجدۂ خالق میں ہے ہر شاخِ نخلِ پُر ثمر — حمد میں خلّاقِ عالم کے ہے سوسن تر زباں

کہیں دھانوں کے کھیت پانی سے سیراب، کسان جہاں تہاں ڈھینکلیاں اور پروٹ چلاتے۔ رکھوالے درختانِ ثمردار کے کھٹکے ہلاتے تو تنے اُڑ لتے۔ وہ ہرے ہرے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں۔ ڈابر اور تالاب پانی سے لبریز۔ جھیلیں کٹورا سی چھلکتیں ندیاں رواں۔ کنارے پر مرغانِ آبی کا ہجوم۔ تالابوں میں کنول اور سنگھاڑوں کی بیلیں پڑیں، کہیں کوکنار پھولا ہوا۔ اللہ رے فضا اس سبزہ زار کی۔ وہ شام کا قرب ہوا کی خنکی۔ جھلکتا سورج۔ شفق کی سُرخی۔ سرسوں کی زردی۔ اور گھنے گھنے درختوں میں کوئل کا کوکنا۔ موروں کی جھنکار۔ موسم کا اعتدال۔ بادِ بہاری کا چلنا۔ طوطیانِ شیریں مقال کا امریوں پر جھوم جھوم کر گرنا۔ رکھوالوں کے شور، گوپھن کے تڑاقے۔ کھٹکوں کی آواز، جُھٹ پٹے کا وقت ؎

کہوں کیا سماں اختری روز کا، — مسیحائی کرتی تھی واں کی ہوا،
ہر اک سمت سرسوں کے کھیتوں کا روپ — ملائم ملائم وہ دھانوں پہ دھوپ
بھلی لگتی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، — غرض زندگی کا وہاں تھا مزا،
وہ دریا کا پُر پیچ آبِ رواں، — ہر ایک موج تھی صورتِ کہکشاں
درختوں پہ ہر سو وہ شورِ طیور — وہ چھپتا سا سورج وہ مہ کا ظہور

کہ دفعتًا دور سے اس دریا میں ایک روشنی پیدا ہوئی۔ جب وہ روشنی قریب آئی تو دیکھا کہ ساٹھ ستّر کشتی، بجرا، مور پنکھی، لچکا، ہوڑی، ڈونگا، بادبانی ناد، بیڑا جن میں ہزارہا کنول، فرشی جھاڑ، گلاس، فانوس، گلال ٹین منوّر ہیں۔ ان میں نازنینانِ پری تمثال اور مہوشانِ حور خصال۔ زلفیں تا کمر چھوٹی ہوئی۔ دوپٹے سروں سے ڈھلکے ہوئے۔ نشوں میں سرشار زرق برق جوڑے پہنے، گہنے پاتوں سے لدی عالمِ بے خودی میں آپے سے بے خبر۔ نشۂ حُسن و شباب میں بے خوف و خطر

یاہم چہلیں کر رہی ہیں اور قہقہے مار رہی ہیں، بیچ میں ایک طاؤسی از دُم تا منقار جواہر
اُب دار سے تیار۔ جوانِ جوان عورتیں سبزہ رنگ، ساڑیاں بنارسی بھاری بھاری
باندھے، گاتیاں مارے۔ موٹے موٹے کڑے۔ مگر وہاں جڑاؤ ہاتھوں میں پڑے۔
فتح پیچ کے سر گُندھے۔ کوڑیالے موباف، مانگیں نکلیں، کانوں میں میناکاری بجلیاں۔
گلوں میں دُہرے گجروں کے توڑے، گنگا جمنی چپّو ہاتھوں میں لیے ڈانڈیں لگاتی چلی
آتی ہیں۔ اندر اس کے سورج مکھیاں روشن، مسندِ زر تار لگی، بیس بائیس انیسان
خاص خوش رو ژولیدہ مو، موسمی رنگ کے جوڑے، ہلکے ہلکے زیور چپ راست کھڑی
بالائے مسند ایک ماہِ طلعت کمال نازو ادا سے جلوہ فرما۔ گورا گورا بدن چاند سا مکھڑا،
بھولی بھالی صورت، لمبے لمبے بال، بڑی بڑی آنکھیں، جنگی بھویں، پھول سے گال،
سُتواں ناک غنچہ دہن، پتلے پتلے ہونٹ، دانت موتیوں کی لڑی، صُراحی دار گردن،
پیاری پیاری وضع ؎

سمن سینہ و نازک اندام و نرم
عیاں شرم میں شوخی شوخی میں شرم

گول گول شانے، کلائیاں بلّور کی بلکہ نور کی، پنجۂ حنا میں یاقوت کی صفائی ؎

یہ ساعدوں کا ہے اس کے عالم کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بے دم
نیامِ تیغِ قضائے مُبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

اُبھرا اُبھرا سینہ، اُٹھتی جوانی، آئینہ سا پیٹ، چیتے کی سی کمر ؎

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سِن | جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

کاسنی جوڑا پہنے، جامِ شرابِ گل فام ہاتھ میں لیے مخمورِ بادۂ نشاط پیچھے دو خواصیں پشتہ
راں ہاتھوں میں، سامنے کچھ گائنیں، ستار، تنبورہ، ڈھولک کے ساتھ دھیمے دھیمے سُروں
میں چھوٹے چھوٹے دلیں اور سہاگ کے خیال گا رہی ہیں۔ جوں ہی نگاہ شاہ زادے کی
اُس جادو ادا پر پڑی مرغِ دل تیرِ نگاہ ناز کا شکار ہوا ؎

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی | وہ نظر ہی وداعِ طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ | صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز | رنگ چہرے سے کر گیا پرواز

شاہ زادہ شکار کی جستجو میں خود شکار ہو کر واپس آرہا تھا کہ ؎

سامنے سے ناگہاں اک طرفہ باغ آیا نظر
وصفِ شادابی میں ہے جس کی مری قاصر زباں،
لغزشِ مستانہ دکھلانے لگا پائے خیال
بس کہ اس کی چار دیواری تھی صاف آئینہ ساں
پشتۂ دیوار پر اس کے وہ سبزہ دوب کا
جس کی سرسبزی سے تھا سرسبز روئے گل رخاں

اور قریب باغ ایک میدانِ وسیع میں اکثر خیمے ڈیرے، قناتیں، چھول داریاں بنگلے استادہ ہیں۔ شاہ زادہ بدیع الزماں قریب ان خیموں کے آئے تھے کہ ایک عیّار نے آگے بڑھ کر آواز دی: "خبردار ہوشیار۔ یہ لشکر رخشانِ تیغ زن کا ہے۔" شاہ زادے نے مرکب کو روک کر امیہ بن عمر سے کہا کہ تم جا کر رخشاں تیغ زن سے کہو ہمارے سردار آپ سے ملاقات چاہتے ہیں . . . . . . بدیع الزماں مرکب بڑھا داخل لشکر ہوئے اور خیمۂ رخشاں پر آ، گھوڑے سے اُتر خیمے میں پہنچے تو دیکھا کہ حقیقت میں دنگل میں ایک جوان زبردست جس کا چھاتا گردن تیار مچھلیاں بازو کی اُبھری ہوئی، کمر پتلی، رانیں موٹی، پنڈلیاں گول، آنکھیں سُرخ۔ سپر پسِ پشت، قربان میں کمان ہزار تیر کا ترکش شکلِ دُمِ طاؤس پیچھے پڑا۔ جوڑی خنجرِ آب دار کی کمر میں لگی، موزے سیاہ ولایتی زانوؤں تک، ظفر تکیہ زیرِ بغل دبائے بڑی شان وشوکت سے بیٹھا ہے اور دائیں بائیں دنگلوں میں جن شاگردانِ خاص کو آپس میں ہم سری کا دعوا ہے مودّب موجود ہیں . . . .

باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک شاگرد نے عرض کی کہ کسرت کا وقت آگیا ہے۔ یہ سُن کر رخشاں نے شاہ زادے سے کہا کہ آپ بھی تشریف لے چلیں۔ شاہ زادہ کھڑا ہو گیا۔ قریب ہی زیرِ شامیانہ اکھاڑا ہرا کیا ہوا تھا۔ جس میں پٹڑیاں ہر چہار سمت۔ ان پر لیزم بل ڈنڈ۔ بل کھم۔ سنتولہ، یکہ، کریلے، نالی، گودیل، تالیاں، نال مگدروں کی جوڑیاں کھنیاں وغیرہ قاعدے سے رکھی تھیں۔ شاگرد لنگر لنگوٹے باندھے کچھ ڈنڈ بیٹھکیاں لگا رہے ہیں اور کچھ دوسری کسرتوں بنوٹ، پھکڑی، بیلیا، ناگ موڑ، بن توڑ، دھارانی، ایکھیتی، کرپتی، بانک، پٹا، ہنونتی، لچ دنتی، رستم خوانی، کرناٹک،

علی مد، شیرزور، شیر پیکر، لٹھینتی میں مصروف ہیں۔ ایک طرف دس بارہ ضعیف اُستاد ہر فن کے بیٹھے گھاتیاں اُڑانے اور ورزش کی رکانیں تعلیم کرتے جارہے ہیں۔ رخشاں نے بدیع الزماں کو ایک دنگل پر بٹھایا چند جام شراب پی لباس اُتار۔ سامان کشتی درست کر اکھاڑے میں اُترا اور نہایت نخوت سے خم پرخم مار آواز دی کہ آؤ کون آتا ہے؟ آٹھ دس شاگرد سامنے آ کھڑے ہوئے۔ رخشاں نے بیٹھ کر کہا کہ لوچت کرو۔ وہ سب لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس نے سب کو اُٹھا اُٹھا کر پھینک دیا اور کھڑے ہو کر ہنکارا کہ ہاں کہاں ہیں رستم و سہراب، اسفندیار و گودرز۔ حمزہ و بدیع الزماں آئیں میرے مقابلے میں اور حلقہ میری بندگی کا اپنے کان میں ڈالیں۔ بدیع الزماں کو اس لاف و گزاف کی کب تاب تھی۔ بولے اے جوان ایسی شیخی بہادروں کو سزاوار نہیں۔ رستم وغیرہ تو خیر اپنی جگہ ہیں اگر آپ کہیں تو میں موجود ہوں۔ ہاتھ مل جائیں۔ رخشاں نے ہنس کر کہا، آیئے۔ شہزادہ اسی وقت دنگل سے اُتر سامان کشتی سے آراستہ ہو سامنے آیا۔ جس وقت شہزادے نے پینترا بدلا تو بوڑھے بوڑھوں کی گردنیں ہل گئیں۔ سرسے سر ملا سامنے کے زور ہونے لگے۔ طاقت آزمائی کے بعد داؤ پیچ شروع ہوئے اور اک دستی، دودستی، آنٹی سونت، ردم، مونڈھا۔ قینچی، بغچی، ہنکوڑہ گال، گرہ، جھوم، ہفتہ، ٹنگڑی، کولا، سکھی، حمائل گولا لاٹھی جھولی کیلی، ناک پیچ، گومکھ، بغلی، گلبند، پری بند، دیو بند، قلعہ جنگ، بارہ بیلن، غوطہ، تھپکی، سلہڑ، ہوکا، جھڑکی، مُغلا، ساندھی، اک دبی، قلندرہ، سواری جھولا، جھپکی، کھسوٹا، اڑنگا، دھڑ مار، ہار سنگھار، لنگر، تیفا قفلی، ہوتے ہوتے شہزادے نے رخشاں کی کمر بند زنجیریں ہاتھ ڈال ایک ہی قوت میں سر سے بلند کیا اور نعرہ مارا کہ منم سر کردہ کشتی گیرانِ جہاں بدیع الزماں بن صاحب قراں حمزہ ذی شان۔

اب جو شہزادہ لشکر گاہِ اسلام میں پہنچا، خلوت ہوئی تو عشق نے زور باندھا، معشوقہ طناز کی یاد آئی، ہر چند ضبط کیا مگر کہیں عشق و مشک چھپتا ہے۔ ایک ہائے کا نعرہ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ .... امیر کشور گیر کو اطلاع ہوئی کہ شہزادہ دامنِ آذر کوہ میں لبِ دریا چاندنی کی سیر ملاحظہ فرما رہے تھے کہ یکایک چند

کشتیاں دریا میں پیدا ہوئیں۔ جوان جوان عورتیں سوار تھیں۔ معلوم نہیں کہ ان میں سے کس فسوں ساز نے جادو کر دیا .... امیر نام دار نے سُنا اُٹھ کھڑے ہوئے ..... یہ خبر عیاروں نے کوتوالی چوترہ پر خواجہ عمر بن اُمیہ ضمری کو پہنچائی۔ خواجہ سنتے ہی خیمہ بدیع الزماں پر آ خدمتِ امیر بالتوقیر میں آداب بجا لائے۔ ساری کیفیت سن کر کہا حضور اطمینان فرمائیں۔ یہ کہیں عاشق ہو گئے ہیں یا ان پر کسی نے سحر کر دیا ہے۔ بہر حال میں اس کا انتظام کر لوں گا۔ اتنے میں شہزادے کو ہوش آیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو صاحبِ قرانِ ذی شان خواجہ عمر اور کئی سردار اپنے تابع دار پلنگ کو گھیرے بیٹھے ہیں۔ بدیع الزماں گھبرا کر پلنگ سے اُترے۔ آداب بجا کچھ شرمندہ سامنے مودّب بیٹھ گئے۔ صاحب قراں نے فرمایا بیٹا کہاں گئے تھے اور یہ کیا حال ہے؟ شہزادے نے شرما کر نیچی گردن کر لی۔ امیرِ نام دار نے بھی زیادہ گفتگو کرنی مناسب نہ سمجھی۔ رُخصت ہوئے اور چلتے چلتے شہنشاہِ عیّارانِ جہاں سے فرمایا تم جا کر شہزادے کو سمجھاؤ کہ صاحبِ زادے ہم نے عالمِ شباب میں ایسے بہت کھیل کھیلے ہیں مگر انجام ان کا سوائے ذلّت و خواری اور آہ و بے قراری کے کچھ نہ دیکھا کیونکہ معشوقانِ چمنِ روزگار ہفتہ دوستی میں مشّاق ہیں ؎

دم دِلاسے میں لگا لینا دل اُن کا کھیل ہے
روز کرنا اک شکار اُن کی ہیں ادنا شوخیاں
سُن کے نالہ عاشقوں کا کہتے ہیں کیا راگ ہے
ذبح کر کے دیکھتے ہیں سیرِ رقصِ بسملاں

جو سرمستِ بادۂ غم اُن کی نرگسِ چشم کا بیمار ہوا بہ خیالِ افشائے راز گُھل گُھل کر گُھٹ گُھٹ کر بپاسِ خاطرِ دل دار کچھ کہہ تو سکتا نہیں آخر کار فرہاد دار جانِ شیریں تلف کرتا ہے ؎

غرض انجامِ اُلفت کا بُرا ہے
کہ جو محبوب ہے سو دل رُبا ہے
دل آزاری ہے ہر دم کام اُن کا
جفا جوئی وفا ہے نام اُن کا
ستم گر ہیں یہ سفّاکِ جہاں سب
کہ ہے عاشق کُشی سے اُن کو مطلب
دل آزار و جفا جُو فتنہ گر ہیں
خدا شاہد ہے بُتِ بانیِ شر ہیں

بیٹا! اپنے کو سنبھالو یہ مقامِ ساحرانِ غدّار اور جادوگرانِ نابکار ہے۔ خُدا نے ہمیں اپنی راہ میں جہاد کے لیے پیدا کیا ہے نہ کہ حُسن و عشق کے جھگڑوں میں مبتلا ہو کر آہ و فریاد کے لیے۔

یہ فرما امیر تو اُدھر روانہ ہوئے اور عمر عیار مُنہ بنائے ہوئے شہزادے کے پاس آئے اور کہنے لگے برخوردار ہم سے اب ملازمت نہیں ہوتی جس کا بیٹا کی طرف سے ایسا پتھر کا دل ہو اس سے کیا اُمید۔ اپنا وقت بھول گیا۔ ملکہ مہر نگار کی چاہت میں کہاں کہاں جھک مارتا پھرا۔ ملکۂ روشن تن کے لیے کوہ قاف تک کی خاک چھان ڈالی اور اب بھی اگر کوئی صورت نظر آجاتی ہے تو کیا بتاؤں کیا حال کرتا ہے مگر بیٹے کی طرف سے ذرا فکر نہیں۔ کہتا ہے کہ سمجھا بجھا کر عشق کی آگ کو ٹھنڈا کر دو۔ تو قرۃ العین سمجھ جاؤ۔ محبّت کے شعلوں پر خاک ڈال دو۔ لیکن میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ عزیزِ من " نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال تمھاری جان دو بھر ہو تو صبر و جبر کی تلقین کروں۔ یہ کہ کر جھوٹ موٹ رونے لگے۔ شہزادے نے جو عمر کو ہمدرد پایا تو بولا چچا آپ کو اگر میرا خیال ہے تو اس آفتِ روزگار کا پتا لگایئے۔ اور اس کے شربتِ وصل سے سیراب کیجیے۔ خواجہ نے بسورتے ہوئے مُنہ سے جواب دیا جانِ عم مجھ کو تلاش کرنے میں کیا عذر تھا مگر کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ میرے پاس ایک خرمہرہ نہیں کہ کسی کو دے کر دریافت کروں اور جب تک کچھ فائدہ نہ ہو کسی کو کیا پڑی کہ اس کا پتا بتائے۔ غیر ملک، غیر مذہب، بُرا زمانہ بُرا وقت یہاں کے لوگوں سے دشمنی۔ اور یہ بھی دستور ہے ؎

خواہی کہ دلِ دلبرِ ما نرم شود
وز پردہ بروں آید و بے شرم شود
زاری مکن و زور مکن زر بفرِیش
زر بر سرِ فولاد نہی نرم شود

مہر سپہرِ عیاری کا یہ عرض کرنا تھا کہ شہزادہ سمجھا یہ حضرت بغیر مٹھی گرم کیے کب ٹلتے ہیں، فوراً دس ہزار روپیا منگوا آگے رکھا اور کہا اس وقت اتنا تو حاضر ہے جب خبر آجائے گی انشاء اللہ دوچند اور پیش کروں گا۔ خواجہ وہ روپے داخلِ زنبیل

مبارک کر خدمتِ امیر نام دار میں حاضر ہوئے اور گزارش کیا۔ پیر و مرشد کمترین نے ہر چند سمجھایا حُسن کی بے وفائی، حسینوں کی کج ادائی، عشق کی خانہ خرابی، دل لگانے کا انجام بخوبی تمام بتایا مگر وہ کب سنتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جب تک یہ اچھی طرح خاکِ صحرائے محبت نہ چھانیں گے آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ اگر حکم عالی ہو تو بندہ پتا لگا کر کوئی بندوبست کرے۔ امیرِ نام دار نے فرمایا۔ بھائی اگر تم سے ہو سکے کیا بہتر ہے اور ایک ہزار اشرفی خواجہ کو دی کہ یہ زادِ راہ ہے جلد آنے کا قصد کرنا۔ خواجہ رخصت ہو اپنی اصلی صورت میں کوتوالی چوترہ پر آئے یعنی وہی ناریل سا سر، ٹکیہ سا چہرہ، چلغوزہ سی ناک، زیرہ سی آنکھیں، بتا سا سی ٹھوڑی، تکّا سے چند بال ڈاڑھی کے مگر سیدھے، پونگی سے شانے، ٹوکری سا سینہ، تُتلی سے ہاتھ پاؤں، مٹکا سا پیٹ، ناف جیسے آبخورہ مٹکے پر اوندھا ہوا۔ اور بان ہائے عیاری سے آراستہ ہوئے۔ سامانِ سفر زنبیل سے نکالا، تاجِ عیاری سر پر رکھا۔ چیغۂ شہنشاہی درست کیا۔ کسوتیں رنگیں تنگ و چست بر میں۔ دام جناب مہتر الیاس کا دوش پر۔ مشکیزۂ خضر زیبِ کتف۔ گلیم عیاری کاندھے پر۔ دیو جامہ حضرت صفی اللہ کا پہنا ایک توبرہ جس میں سنگ تراشیدہ و خراشیدہ بھرے تھے برابر ان کے لٹکایا۔ نیمچۂ برق دم۔ ایک جوڑی خنجرِ آب دار کی کمر میں۔ گردہ سپر عیاری پُشت پر۔ قربان میں کمان ہزار تیر کا ترکش پیچھے۔ دست بغچۂ عیاری بغل میں۔ چرب میلۂ عیاری سے ہاتھ چرب۔ دو نلیاں جن میں حبوبِ بے ہوشی بھرے جبڑوں میں دبی۔ بیلہ ہائے بے ہوشی جیب ہائے عیاری میں۔ کمندِ عیاری ریشم سیاہ کی باریک دبل دار بازوں پر نفت آتش بازی گھائیوں میں۔ موزے ولایتی سیاہ تا بہ زانو۔ ایک ایک جوڑی گزلک کی اندر موزوں کے، غرض یہ کہ ہر طرح سے لیس ہو تلاشِ معشوقۂ بدیع الزماں میں روانہ ہوئے اور راستہ طے و پے کرتے چلے جاتے ہیں اور اب دیدہ خواہد شد کہ کیا ہوتا ہے۔ آداب عرض کرتا ہوں۔

"واہ میر صاحب واہ۔ سبحان اللہ کیا کہنا ہے"

"جی پیر و مرشد مجھے کیا آتا ہے"

"میر صاحب۔ آپ کے دم سے بھی دلّی میں شہر آبادی کا لُطف آجاتا ہے۔

اتنے سے مکان میں ماشاء اللہ شیخ، سیّد، مغل، پٹھان سب ہی تو موجود ہیں۔ یہ مور تیں یہاں کے سوا اور کہاں دیکھنے میں آتی ہیں"۔

"خدا رکھے آپ لوگوں کو یہ سب چہل پہل آپ ہی کے قدموں کی ہے"۔

لکھنوی : قسم ہے حضرت عبّاس کی۔ داستان بھی ایسی ہوئی کہ جوانی یاد آگئی اور نشے بھی خوب ہی گھٹے۔

مرزا جی : اور چائے کو نہیں کہتے۔ قسم اللہ کی وہ پیارا رنگ آیا ہے کہ جی چاہتا ہے دیکھا ہی کرو۔ اپنے حسابوں گلاب کے تختے کی سیر کر رہے ہیں۔

میر صاحب : مرزا صاحب۔ مسلمائی اور یہ آنا کانی۔ ایک پیالی ادھر بھی عنایت ہو۔

مرزا جی : میر صاحب چائے آپ کے کتّوں کو یہ آپ نے کیا کہا۔ ذرا پہلے ایک چسکی لگا لو۔

میر صاحب : اچھا ہمارے چھوٹے میاں کو دیجیے۔

رات زیادہ آگئی تھی۔ میں چائے سے انکار کر اور اس ساری منڈلی کو اصرار کرتا ہوا چھوڑ گھر روانہ ہوا۔

مٹھّو بھٹیارا

میاں مٹھو کا نام تو کچھ بھلا سا ہی تھا، کریم بخش یا رحیم بخش ٹھیک یاد نہیں اڈھائی ڈھوئی کے مہینے سے پہلے کی بات ہے۔ ساٹھ برس سے اوپر ہی ہوئے ہوں گے۔ مگر ایک اپنی گلی والے کیا جو انھیں پکارتا میاں مٹھو کہہ کر اور انھیں بھی اسی نام سے بولتے دیکھا۔ میاں مٹھو بھٹیارے تھے۔ سرائے کے نہیں۔ دلی میں محلّے محلّے جن کی دکانیں ہوتی ہیں تنور میں روٹیاں لگتی اور شوربا پائے اور اوجھڑی پکتی ہے۔ نان بائی اور نہاری والوں سے ان بھٹیاروں کو ذرا نیچے درجے کا سمجھنا چاہیے۔ تنور والے سب ہوتے ہیں۔ نان بائیوں کے ہاں خمیری روٹی پکتی ہے۔ یہ بے خمیری پکاتے ہیں۔ ادھر آٹا گندھا اور ادھر روٹیاں پکانی شروع کر دیں۔ پراٹھے تو ان کا حصہ ہے۔ بعض تو کمال کرتے ہیں۔ ایک ایک پراٹھے میں دس دس پرت اور کھجلے کی طرح خستہ۔ دیکھنے سے منہ میں پانی بھر آئے۔ قورما اور کبابوں کے ساتھ کھائیے۔ سبحان اللہ۔ بامن کی بیٹی کلمہ نہ پڑھنے لگے تو ہمارا ذمہ۔

شاہ تارا کی گلی میں شیش محل کے دروازے سے لگی ہوئی میاں مٹھو کی دکان تھی۔ شیش محل کہاں؟ کبھی ہوگا۔ اس وقت تک آثار میں آثار ایک دروازہ وہ بھی اصلی معنوں میں پھوٹا ہوا باقی تھا۔ نمونتاً بطور یادگار۔ اب تو ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ

لہ ایسی سخت بارش جس سے مکان گر پڑے تھے۔

بھی صاف ہو گیا اس کی جگہ دوسری عمارتیں بن گئیں۔ دروازہ تو کیا رہتا، دروازے کے دیکھنے والے بھی دو چار ہی ملیں گے۔ سنا ہے جاڑے گرمی برسات محلے بھر میں سب سے پہلے میاں مٹھو کی دکان کھلتی۔ منہ اندھیرے بغل میں مسالے کی پوٹلی وغیرہ سر پر پتیلا، پیٹھ کے اوپر کچھ چھپٹیاں، کچھ جھانکڑ لنگی میں باندھے ہوئے گنگناتے چلے آتے ہیں۔ آئے دکان کھولی، جھاڑو بہارو کی، تنور کھولا، ہڈیوں گڈیوں یا اوجھڑی کا ہنڈا نکالا۔ ہڈیاں جھاڑیں۔ اس کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں کیے۔ یعنی گھر سے جو پتیلا لائے تھے ہنڈے کا مال اس میں ڈالا۔ مسالا چھڑکا اور اپنے دھندے سے لگ گئے۔ سورج نکلتے نکلتے سالن، نہاری، شروا، جو کہو درست کرلیا۔ تندور میں ایندھن جھونکا۔ تندور گرم ہوتے ہوتے غریب غربا کام پر جانے والے روٹی پکوانے یا لگاون کے لیے شروا لینے آنے شروع ہو گئے۔ کسی کے ہاتھ میں آٹے کا طباق ہے تو کوئی مٹی کا پیالہ لیے چلا آتا ہے اور میاں مٹھو ہیں کہ جھپا جھپ روٹیاں بھی پکاتے جاتے ہیں اور پتیلے میں کھٹا کھٹ چمچا بھی چل رہا ہے۔

مٹھو میاں کی اوجھڑی مشہور تھی۔ دور دور سے شوقین منگواتے۔ آنتوں اور معدے کے جس مریض کو حکیم اوجھڑی کھانے کو بتاتے وہ یہیں دوڑا چلا آتا۔ کہتے ہیں کہ پراٹھے بھی جیسے میاں مٹھو پکا گئے، پھر دلی میں کسی کو نصیب نہ ہوئے۔ ہاتھ کچھ ایسا منجھا ہوا تھا، تندور کا تاؤ کچھ ایسا جانتے تھے کہ مجال ہے جو کچا رہے یا جل جائے سرخ جیسے باقرخانی، سموسے کی طرح ہر پرت الگ نرم کہو تو لچی سے زیادہ نرم، بالکل ملائی۔ کرارا کہو تو پاپڑوں کی تھئی کھجلے کو مات کرے۔ پھر گھی کھپانے میں وہ کمال کہ پاؤ سیر آٹے میں ڈیڑھ پاؤ کھپا دیں۔ ہر نوالے میں گھی کا گھونٹ اور لطف یہ ہے کہ دیکھنے میں روکھا۔ غریبوں کے پراٹھے بھی ہم نے دیکھے۔ دو پیسے کے گھی میں تر بتر۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ ڈیڑھ پاؤ گھی والے سے دو پیسے والے پر زیادہ رونق ہے۔ اس ہنر کی بڑی داد یہ ملتی کہ غریب سے غریب بھی پراٹھا بچوا کر شرمندہ نہ ہوتا۔ پوسیری اور چھٹنکی پراٹھے دیکھنے والوں کو یکساں ہی دکھائی دیتے۔ مال دار اور مفلس کا بھید نہ کھلتا۔

پچھلے وقتوں میں ہر آدمی اپنی کھال میں رہتا۔ جس رنگ میں ہوتا وہی رنگ

دکھاتا۔ جس قوم کا ہوتا وہی بتاتا۔ یہ نہیں کہ پیٹ سے زیادہ ملا اور اپھر گئے، ہیں اوباش اور صورت ایسی اختیار کی کہ لوگ صوفی کہیں۔ تھے مردھوں میں اللہ نے کام چلا دیا، اب مرزا مغل کی اولاد ہونے میں کیا شک رہا۔ اللہ نے جیسا بنا دیا۔ جس پیشے میں رزق اتار دیا۔ جو صورت بنا دی۔ اپنی شخصیت کی جھوٹی نمایش انسان کیوں کرے۔ جہاں ہو، کیا وہاں شرافت نہیں دکھا سکتے؟ حلال خور، چمار، کنجڑے، قسائی سب اپنے اپنے درجے میں شریف ہوتے ہیں۔ اچھے کام کرو، دین داری بھل منسائی کے ساتھ دوسرے سے پیش آؤ۔ حرام خوری پر کمر نہ باندھو یہی شرافت ہے۔ "جنم کا اولیا، کرم کا بھوت، پہلے کپوت دوجے اچھوت، اونچے خاندان میں سبھی تو فرشتے نہیں ہوتے۔ ایک درخت کے بہت سے پھل کرڑ کھائے بھی نکل آتے ہیں۔ ڈھول کوٹ کی بعض کچریاں ایسی مزے دار دیکھو گے کہ لکھنؤ کا چتلا پانی بھرے۔

کوئی پچاس برس ہوئے کلن نفیری والا، گلزار بھانڈ، اچپل ہیجڑا، ننواں تیلی، اُجلا دھوبی، ببّی رنگریز، چپو قسائی، چھوٹا گھوسی، امیر نائی، شبّو شہدا، نبّو گورکن، کوڑا بھنگی کہنے کو کمین اور پیشے کے لحاظ سے نیچے تھے مگر ان کی شرافت کا کیا کہنا؟ پھر خدا نے ان کو بڑھایا چڑھایا بھی ایسا ہی تھا۔ میاں مٹھو رہے تو بھٹیارے کے بھٹیارے۔ غریب کو مرتے مرتے گھر کا مکان تک نہ جُڑا۔ بھٹیارے سے نان بائی بھی نہ بنے۔ صدا اپنے ہاتھ سے ہی تندور جھونکا۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ جیتے جی کوئی اُن کی طرف انگلی نہ اُٹھا سکا۔ کیا مجال جو کسی طور طریق میں بساند آئی۔ نور کے تڑکے سر جھکائے آنا، ہنس کر بات کرنا اپنے کام سے کام رکھنا اور رات کے بارہ بجے آنکھیں بند کیے چلے جانا۔ آدمی کچھ مشین نہ تھے۔ معمولی قد، چھریرا بدن، سر گھٹا ہوا، چُندی آنکھیں پلکیں اُڑی ہوئی۔ شاید دھویں اور آگ نے آنکھوں اور پلکوں کا یہ درجہ بنا دیا تھا، ڈاڑھی کیا بتاؤں۔ جب کبھی ہوگی تو بالکل خفی بکھرے کی سی۔ تندور میں جھک کر روٹی لگائی جاتی ہے۔ کوئی کیسا ہی چھپا کا کرے آگ کی لپٹ کہاں چھوڑے۔ جُھلستے جُھلستے لہسن کی پینڈی بن کر رہ گئی تھی۔ ڈاڑھی کا یہ حال تو موچھوں کا کیا ذکر؟

دلی میں جب تک شاہی رہی، دن عید رات شب برات تھی، ایک کماتا

کنبہ بھر کھاتا۔ نہ ٹیکس تھے نہ اتنی گرانی۔ ہر چیز سستی۔ غدر کے بعد تک روپے کا پچیس سیر آٹا۔ پکا دو سیر ڈھائی سیر گھی۔ بکری کا اچھے سے اچھا گوشت چار یا چھ پیسے سیر۔ ترکاریاں پڑی سڑتیں کون پوچھتا؟ مکان کا کرایہ برائے نام۔ اول تو غریب یا امیر سب کے مرنے جینے کے ٹھکانے اپنے الگ۔ پکا محل نہ سہی کچی کھپریل سہی۔ دوسرے غیر جگہ بسے بھی تو مفت برابر۔ آٹھ آنے، روپے، دو روپے حد تین، اس سے زیادہ نہ کوئی دیتا نہ لیتا۔ ان فارغ البالیوں اور راحتوں کے بعد مہینے کے تیس دن میں اکتیس مہینے کیوں نہ ہوتے؟ روز ایک نہ ایک تہوار رکھا تھا۔ پھر جو تھا رنگیلا۔ بات بات میں دل کے حوصلے دکھانے اور چھٹی منانے کے بہانے ڈھونڈے جاتے۔ عید کے پیچھے ہفتے بھر تک سیریں منائیں جاتیں۔ باغوں میں ناچ ہو رہے ہیں۔ دعوتیں اُڑ رہی ہیں۔ شب برات آئی، آتش بازی بن رہی ہے۔ وزن سے وزن کا مقابلہ ہے۔ بسنتوں کی بہار دیکھنے قابل ہوتی، سورج مکھی کے ارد گرد مرہٹی بازوں کے غول میں واہ واہ کا شور ہے۔ آج اس مزار پر پنکھا چڑھا کل اس درگاہ پر۔ محرم میں سبیلیں سجتیں۔ تعزیہ داریاں ہوتیں، بُراق نکلتے، اکھاڑے جمتے۔

دلی کی دل والی مُنہ چکنا پیٹ خالی۔ غدر کے بعد کی کہاوت ہے۔ گھر بار لٹ گیا، شاہی اُجڑ گئی، سفید پوشی ہی سفید پوشی باقی تھی۔ اندر خانہ کیا ہونا ہے؟ کوئی کیا جانے بیا ہر آبرو، جہاں تک سنبھالی جا سکتی سنبھالتے۔ مدتوں پرانی وضع داری کو نبھایا۔ شہر آبادی کی رسمیں پوری کرتے رہے۔ سات دن فاقے کر کے آٹھویں روز پلاو کی دیگ ضرور چڑھ جاتی۔ اپنے بس تو باپ دادا کی لکیر چھوڑی نہیں۔ اب زمانہ ہی موافق نہ ہو تو مجبور ہیں۔ فاقے مست کا لقب بھی مسلمانوں کو قلعے کی تباہی کے بعد ملا ہے۔ اللہ اللہ! ایک حکومت نے کیا ساتھ چھوڑا سارے لچھن چھوڑ گئے۔ ہر قدم پر مُنہ کی کھانے لگے۔

اگلے روپ اب تو کہاں دیکھنے میں آتے ہیں۔ کچھ بدنصیبی نے بگاڑے تو کچھ نئی تہذیب سے بدلے۔ اور جو کہیں دکھائی بھی دیں گے تو بالکل ایسے جیسے کوئی سانگ بھرتا ہے۔ دل کی اُمنگ کے ساتھ نہیں صرف رسماً کھیل تماشا سمجھ کر۔ محرم میں سبیلیں آج بھی رکھی جاتی ہیں۔ تعزیہ داری بھی ہوتی ہے۔ مگر دلوں کے حوصلے

مر گئے تو زندگی کس بات میں؟ پُرانی روحوں کو ثواب پہنچانے کے سوا کچھ نہیں میاں مٹھو دُکان کے آگے دو کورے مٹکے رکھ کر سبیل بھی لگاتے اور برابر کی دُکان میں تعزیہ بھی رکھتے۔ اُن کے تعزیے میں کوئی نُدرت تو نہ ہوتی۔ آرایش والوں سے بنوا لیتے۔ معمولی کھپچیوں اور پنی کا۔ ہاں جو چیز دیکھنے کے قابل تھی وہ ان کی عقیدت یا سوگ دار صورت۔ چاند رات سے جو یہ امام حسین علیہ السلام کے فقیر بنتے تو بارھویں کو حلیم کھا کر کہیں نہاتے دھوتے اور کپڑے بدلتے۔

دلی میں پچاس ساٹھ برس پہلے تک منتوں، مُرادوں کا بڑا زور تھا۔ درگاہوں میں چلّے چڑھتے۔ مسجدوں کے طاق بھرے جاتے۔ بچوں کے گلوں میں اللہ آمین کے گنڈے ڈالتے۔ جینے کے لیے طرح طرح سے منتیں مانی جاتیں، کوئی شاہ مدار کے نام کی چوٹی رکھتا، کوئی حسینی فقیر بناتا۔ لوگ کچھ کہیں، جہالت کے عیب لگائیں یا عقیدے کا کچا بتائیں، سچ پوچھو تو فارغ البالی کے سارے چونچلے تھے۔ وہ جو مثل ہے کہ کیا ننگی نہائے گی کہ کیا نچوڑے گی۔ دل ہی افسردہ ہو اور ہاتھ ہی خالی ہو گئے، تو جس کام میں جتنی چاہو فی نکال لو۔ خیر! وقت وقت کی راگنیاں ہوتی ہیں۔ مطلب یہ کہ میاں مٹھو بھی فقیر بنتے تھے۔ بچپن میں ماں باپ نے بنایا ہوگا۔ جوانی میں بدصورت پر بھی کچھ نہ کچھ روپ ہوتا ہے۔ سبز پوشی بھا گئی۔ ہر سال فقیر بننے لگے۔ تعزیہ داری کئی پشتوں سے ان کے ہاں ہوتی آئی تھی۔ یہ اپنے بڑوں کی سُنّت کیوں ترک کرتے۔ اس کے بعد لوگوں کا بیان ہے کہ انھیں کچھ نظر بھی آیا۔ حضرت عباس کی زیارت بھی ہوئی، اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی بار یہی سبب تھا کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق سچے دل سے تعزیہ نکالتے اور جو کچھ کرتے بناوٹ سے خالی ہوتا۔ جوانی بھر اُن کا یہی طور رہا اور مرتے مرتے اور کچھ نہ ہو تعزیہ نکالنا اور فقیر بننا نہ چھوڑا۔ آخر میں غریب کی آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ دُکان پر ایک شاگرد کو بٹھا دیا تھا۔ وہ نالائق نکلا۔ آٹھ آنے روز استاد کو دیتا وہ بھی آٹھ آٹھ آنسو رُلا کر۔ تاہم جس طرح بنتا محرّم کے لیے اُنھیں بیس پچیس روپے بچانے لازمی تھے۔ دوستوں کو حلیم کھلا کر فقیری اُترتی۔

باپ کے مرنے کے بعد میاں مٹھو نے جب دُکان سنبھالی ہے تو ان کی عمر

پچیس برس سے کم نہ ہو گی۔ شادی ہو گئی تھی بلکہ دو بچّے بھی ہو کر مر گئے تھے۔ باپ کے سامنے یہ بھی گھنٹے دو گھنٹے کے لیے تعزیے کے پاس آکر بیٹھتے لیکن رات کے دس بجے دُکان اُٹھا کر۔ اب تعزیے داری کا بوجھ ان کے سر پر آپڑا تھا اس لیے چراغ جلتے ہی جلدی جلدی دُکان داری ختم کی۔ پاس کی مسجد میں نہائے۔ سبز تہمد باندھا۔ سبز کرتا پہنا لال کلاوہ گلے میں ڈالا، جھولی سنبھالی۔ سبز دو پلڑی ٹوپی مُنڈے ہوئے سر پر جمائی اور تعزیے کے پہلو میں دو زانو آبیٹھے۔ ملنے والوں میں جو سوز، نوحہ، مرثیہ پڑھنے والے ہوتے آتے اور ثواب کے لیے کچھ پڑھ کر چلے جاتے۔ اب جہاں جہاں اس قسم کی تعزیہ داری ہوتی ہے یہی دیکھنے میں آیا ہے۔ انھیں خود بھی سوز پڑھنے کا شوق تھا۔ شوق کیا تعزیہ داری، سبیل لگانے، حسینی فقیر بننے اور تعزیے کے آگے کچھ پڑھنے کو نجات کا باعث سمجھتے تھے۔ آواز تو جیسی بھونڈی تھی، تھی ہی۔ طرّہ یہ کہ سلام یا بین جو چیز حضرت پڑھتے وہ بھی سُنا گیا کہ آپ ہی کی تصنیف ہوتی۔ لیکن پڑھتے وقت صورت کچھ ایسی سچ مچ کی رونی بناتے اور ایسے جذبے کے ساتھ ادا کرتے کہ سننے والے حضرت امام کی بے کسی کو بھول کر اُن پر ترس کھانے لگے۔

محلّے میں کئی جگہ تعزیے نکلتے اور بڑی کاری گری کے ہوتے۔ مرثیے بھی وہاں خوب خوب پڑھے جاتے مگر جتنی بھیڑ ان کی دُکان کے آگے رہتی کہیں نہ رہتی۔ بڈھوں کو رقّت چاہیے اور بچّوں کو دل لگی۔ یہ دونوں باتیں میاں مٹھو میں موجود تھیں۔ بڑے بوڑھے تو انھیں کچھ اور ہی سمجھنے لگے تھے۔ جاگتے یا سوتے یہ سقائے سکینہ کی زیارت کر چکے تھے۔ سبز عمامہ باندھے، نقاب ڈالے، نیزہ ہاتھ میں لیے، گھوڑے پر سوار سیّد الشہدا حضرت امام حسینؓ کو بھی انھوں نے اپنے تعزیے کے سامنے دیکھا تھا۔ یہ اپنا گھڑا ہوا سلام الاپتے اور وہ بیٹھے سر دُھنا کرتے۔ لڑکے بالے کچھ تو ریوڑیوں یا کھیلوں کے لالچ میں جمے رہتے یا اُن کی حرکات و سکنات کا تماشا دیکھنے کے لیے۔ بچارے شاعر تو کیا تھے بلکہ کلام مجید بھی پورا نہیں پڑھا تھا۔ جوانی میں چاوڑی بازار بھی دو چار ہی مرتبہ گئے ہوں گے، ورنہ مرثیے کے دو چار بند، سلام کے پانچ سات شعر یا کوئی سوز وہیں سے یاد کر لاتے۔ اب شوق پورا

کرنا ٹھیرا گھڑ گھڑا کر ایک سلام بنا لیا۔ میرا حافظہ کم بخت ایسا خراب ہے کہ کئی دفعہ سُنا اور یاد نہیں رہا۔ حالانکہ میاں مٹھو اسی سلام کی بدولت بنے۔

سلام کہو یا مرثیہ، سوز کہو یا نوحہ کوئی ایسی چیز تھی جس میں بار بار

ع "نبی جی کے لاڈلوں پر بھیجو سلام"

آتا تھا۔ اور اسی کو وہ سب سے زیادہ لہک لہک کر ادا کرتے تھے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ ناپ تول کے حساب سے کوئی مصرع ہے یا کیا۔ افسوس میں نے لکھ کیوں نہ لیا۔ اور اب جس سے پوچھتا ہوں، اسی ایک مصرعے کے سوا کچھ نہیں بتاتا۔ اچھا اس مصرعے سے اور میاں مٹھو کے خطاب سے کیا نسبت؟ آہ دلّی مرحوم! دلّی والوں کی دُور بلا، میاں دلّی والے ہی نہ رہے۔ دلّی کا چھے برس کا بچّہ تک سمجھ جاتا۔ آخر کریم بخش یا رحیم بخش پر میاں مٹھو کی پھبتی بھی تو بچّوں ہی نے کہی تھی "نبی جی کے لاڈلوں پر بھیجو سلام" والا سلام پڑھتے انھیں دوسرا دن تھا کہ محلّے کا ایک لڑکا روٹی پکوانے آیا۔ اتفاق سے رات کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ لڑکا اُنھیں دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ اکیلا تھا کچھ کہنے کا ہیاو نہ پڑا۔ اتنے میں اس کا ایک یار بھی آ پہنچا۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا۔ میاں مٹھو کی طرف اشارہ کیا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ہنستے ہنستے ایک بولا "میاں مٹھو ہیں" دوسرا کہنے لگا "میاں مٹھو نبی جی بھیجو" دُکان پر کھڑے ہونے والے لونڈوں کی باتوں پر لوٹ گئے۔ اب کیا تھا۔ ساری گلی میں "میاں مٹھو نبی جی بھیجو" شروع ہو گیا۔ اُس دن سے یہ ایسے میاں مٹھو بنے کہ لوگوں کو ان کا اصلی نام ہی یاد نہ رہا۔ لیکن اللہ بخشے کبھی بُرا نہ مانا اور نہ اپنی وضع بدلی، مرتے مرتے اپنا وہی سلام پڑھا۔

گھمّی کبابی

گھمّی کبابی کو کون نہیں جانتا۔ سارا شہر جانتا ہے۔ جب تک یہ زندہ رہا کبابوں کی دُنیا میں اس سے زیادہ دلچسپ کوئی کبابی نہ تھا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں سے لے کر اُدھر دِلّی دروازے تک اور اِدھر حبش خاں کے پھاٹک تک اس کے کباب کے چٹخارے لے لے کر کھائے جاتے تھے۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب سب ہی پر میاں گھمّی کے کبابوں نے سکّہ بٹھا رکھا تھا۔ دکان تو آج بھی ہے اور کباب ہی اس پر بکتے ہیں۔ لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ نہ وہ گھمّی کی سی مزے دار باتیں ہیں، نہ وہ گھمّی کا سا کباب بیچنے کا ڈھنگ۔ نہ وہ خریداروں کی بھیڑ ہے۔ نہ وہ چٹپٹا پن: ایک لمبا تڑنگا بھینگا سا جوان آدمی دُکان پر بیٹھا ہوا مکھیاں مارا کرتا ہے۔

میاں گھمّی کی صورت بھی ایسی گول مٹول تھی کہ گولے کا کباب معلوم ہوتے تھے۔ شام کو پانچ بجے کے بعد جاڑوں میں اور مغرب کی اذانوں کے قریب گرمیوں میں ان کی دُکان جمتی تھی۔ سری پائے گھر سے پکا کر لاتے۔ کلیجی گُردے اور بکری کے بھیجے تلے ہوئے الگ اور بھُنے ہوئے علاحدہ سینیوں اور پتیلے میں رکھے ہوئے ہوتے۔ قیمہ سیخوں پر چڑھاتے جاتے اور آپ ہی آپ بڑبڑاتے رہتے۔ باتیں ایسی صاف ستھری زبان میں آواز کو جھولا دے دے کر کیا کرتے کہ قلعے کی بویوں مغلانیوں کا لطف آجاتا۔ اب تو وہ اُردو ہی سننے میں نہیں آتی۔

بولنے والے نذر ہے تو سمجھنے والے کہاں سے آئیں۔
یونی ورسٹی کے امتحانوں کے دن تھے۔ بڑی بڑی دور کا لڑکا آیا ہوا تھا۔ طالب علم پورب کے ہوں یا پچھم کے گھنٹوں میں یار ہو جاتے ہیں۔ اردو کے پرچے کا نمبر آیا تو آپس میں چخ شروع ہوئی۔ بحث یہ تھی کہ اُردو پر دلّی والوں کا ناحق دعوا ہے۔ دوسرے ان سے اچھی جانتے ہیں۔ گویا اُستادوں کو منہ چڑانے والے شاگرد بھی، اللہ کی شان میاں مٹھو بننے لگے۔ یوں وہ کب ماننے والے تھے۔ کاگا رول میں میری کون سُنتا۔ یکایک مجھے ایک ترکیب سوجھی اور خوب سوجھی۔ شام کو اُن میں جو زیادہ شیخی بگھار رہے تھے، انھیں ساتھ لے، باتوں میں لگا اِدھر اُدھر کا چکر دیتا ہوا میاں گھمّی کی دُکان پر جا پہنچا۔ اتفاق سے اُس وقت اُن کا بھی بہرہ کھُلا ہوا تھا۔ کسی نے چھیڑ دیا ہوگا۔ چونکھی چل رہی تھی۔ ایک زرغل دُکان کے سامنے کھڑے ہونے کا کوئی بہانہ تو ہوتا۔ میں نے چاندی کی ایک پادلی پھینکی اور چُپ کھڑا ہو گیا۔ مگر گھمّی صاحب اپنے رنگ میں غرض کہ ہم سب کھڑے تھے اور میاں گھمّی پنکھے کے ساتھ پتنگے اُڑا رہے تھے۔ آغاز اور انجام کی تو خبر نہیں کہ کیونکر اُردوے معلّی کا دفتر کھُلا اور کس پر آخری تان ٹوٹی۔ ہاں جتنا ہم نے سنا حاضر ہے۔

خوب۔ دھوبی بیٹا چاند سا بیٹی اور پٹاخ۔ اجی وہ زمانے لد گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے۔ آج کی کہو۔ جس کو دیکھو بے نوا کا سونٹا بنا پھرتا ہے۔ نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کی لاج۔ وہی مثل ہوگئی کہ باولے گانو اونٹ آیا لوگوں نے جانا پرمیشور آئے۔ حضت ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ جھُجّو جھونٹوں میں عمر نہیں گزاری۔ رانڈ کے سانڈ بن کر نہیں رہے۔ یہ بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے۔ کیا کہا بارہ برس دِلّی میں رہے اور بھاڑ جھونکا؟ ہاں صاحب اب تو جو کہو بجا ہے۔ آنکھ پھوٹ پیڑ گئی۔ دِلّی کا کوئی ہو تو اُس کے پیٹ میں درد اُٹھے۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ پھر جیسا راجا ویسی پرجا۔ جیسی گندی سیتلا ویسے پوجن ہار۔ میری کیا پوچھتے ہو۔ آٹے کا چراغ گھر رکھوں چوہا کھائے، باہر دھروں کوّا لے جائے۔ انھیں کیوں نہیں دیکھتے جو آدھے قاضی قدوا اور آدھے بابا آدم بنے

ہوئے ہیں۔ آخر کس برتے پر تتا پانی۔ کرگا چھوڑ تماشے جائے۔ ناحق چوٹ جلاہا۔ کھائے خیر بھی ہم تو اپنی کہتے ہیں زن، زر، زمین، زبان قضیہ چاروں کے گھر۔ یہاں کیا دھرا ہے؛ جس کا کام اسی کو ساجھے اور کرے تو ٹھینگا باجے۔ پہلے بادشاہی تھی اب انگریزی ہے۔ سُنا نہیں کہ راجا کہے سو نیاو، پانسا پڑے تو داؤ۔ کالوں کا چراغ بجھ گیا۔ گوروں کی رتی چڑھی ہوئی ہے۔ خدا سے لڑو۔ حکومت اس کی جس کے ہاتھ میں تلوار۔ کہتے نہیں کہ رانی کو رانا کانی کو کانا۔ دلی اسی قابل رہ گئی تھی۔ اچھا جناب، تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو، بقولِ ذوق۔ یار تو کباب بیچتے ہیں جس کی زبان سو دفعہ کھجائے وہ ہمارے نخرے اٹھائے۔ ہاں صاحب آپ نے چوٹی دی ہے! کیا عرض کروں، گلزار کی لوٹی کا ایک پرانا لمڈا آ گیا تھا۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ بھلا کہو تو گدھی کمہار کی تجھے رام سے کیا کام، پڑھے لکھوں کی سی تقریر کرنے لگا۔ میں نے جو کس کر ذرا مُرتے لیے تو کہاں ٹکتا، ہوک دم بھاگا۔ بھُس میں چنگی ڈال جالو دور کھڑی، لیجیے آپ کی واری ہے۔ کباب بھی ملائی ہیں۔ جگر تک سکے ہوئے۔ آپ تو تشریف لے جائیے، مجھے تو نہ جانے ابھی کب تک بکواس لگی رہے گی۔"

میرا تو پوچھنا ہی کیا۔ گھمّی صاحب کے کبابوں اور اُن کی چٹپٹی باتوں کا عاشق تھا۔ رات بھر ہو جاتی تو بھی وہاں سے نہ ٹلتا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میرے ساتھی بھی اڑیل ٹٹو بنے ہوئے تھے۔ دُکان سے کھسکے تو لیکن اوپری دل سے۔ تھوڑی دور آگے چل کر اُن میں سے ایک حضرت بولے۔

"کیوں مسٹر ان طبّاخی کا نام کیا ہے؟"

میں : گھمّی! پکڑوانے کا ارادہ تو نہیں؟

دوسرے صاحب : کیا بات کرتے ہو، نام پوچھنے میں بھی کچھ حرج ہے؟

میں : میں سمجھا شاید......

تیسرے صاحب : (بات کاٹ کر) یہ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟

میں : پڑھے لکھے کی ایک کہی۔ پڑھا لکھا ہوتا تو کباب بیچتا؟

پہلے : اور یہ اردو میں باتیں کر رہا تھا؟

میں : جی نہیں زرگری میں!

دوسرے صاحب : زرگری بھی کوئی زبان ہے؟
تیسرے صاحب : زرگر بولتے ہوں گے۔
میں : (ہنس کر) واہ! اسی برتے پر تتا پانی۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ بھائی دِلّی کی اصلی بول چال یہی ہے۔
پہلے صاحب : اُردو نہیں؟
میں : تم کیا سمجھے؟ سمجھو گے کیا خاک۔ تم نے جسے اُردو کہتے ہیں، پڑھی نہیں، لیکن اب دِلّی میں بھی اس زبان کے جاننے اور بولنے والے گنتی کے رہ گئے ہیں۔ پڑھے لکھوں میں کوئی جم ہی جم دکھائی دے گا۔
دوسرے صاحب : (اعتراضاً) تو یہ زبان جاہلوں کی زبان ٹھیری!
میں : یار تم تو اُردو کے پورے رَنگروٹ نکلے۔ میاں انقلاب کا اثر معاشرتی ہو یا علمی، پہلے بڑے گھرانوں، اونچے خاندانوں اور پڑھے لکھوں پر پڑا کرتا ہے۔ مدتوں بعد کہیں ادنا طبقے والے اور جاہل متاثر ہوتے ہیں۔ دلی کی کایا پلٹ ہوئی تو اس کی ہر چیز پر گردش آگئی۔ پردیسیوں سے میل جول بڑھا۔ مدرسوں میں نئی تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا۔ پرانی بولیاں بولی جاتیں تو کون سمجھتا۔ سادگی اختیار کی اور رفتہ رفتہ اُردو ایک نئے قالب میں ڈھل کر رہ گئی۔ پڑھے لکھے تو کتاب کے محتاج ہوتے ہیں، جیسا پڑھتے ویسا بولتے لیکن چھوٹی اُمّت، اَن پڑھ جوں کی توں اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ نہ باپ دادا کے طریق اُن سے چھوٹیں نہ مادری زبان۔
تیسرے صاحب : اچھا تو وہ اُردو ہی میں باتیں کر رہے تھے؟
میں : ہاں اُردو میں اور ٹھیٹ اُردو میں۔ تمھاری سمجھ میں نہ آئے تو اس کا کیا علاج؟
پہلے صاحب : اگر یہ اُردو تھی تو ہماری سمجھ میں نہ آنے کی وجہ۔
میں : وجہ یہ کہ تم جو اُردو پڑھتے ہو وہ دِلّی والوں کی اُردو نہیں، انگریزی والوں کی اُردو ہے۔ جو کتابیں مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں اُن کا معیار کچھ اور ہے۔ ایک جاہل کبابی کو دیکھ لیا، کس صفائی کے ساتھ کیسا بے تکان فاورے

پر محاورے اور ضرب المثل پر ضرب المثل بولتا چلا جارہا تھا۔"
آخر انھیں اقرار کرنا پڑا کہ

نسیم دہلوی ہم موجد بابِ فصاحت ہیں
کوئی اُردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

گھمی، ایک کبابی کی بدولت دِلّی کی لاج رہ گئی۔ لیکن افسوس اب ایسا بھی کوئی نہیں۔ لاگ آپڑے تو کہاں جائیں؟ مٹرمٹر سُنا کرتے ہیں کہ دِلّی والے بے ہُنر، بے غیرت، جھوٹے، شیخی باز، یہاں کے باورچیوں کو کھانا پکانا نہیں آتا۔ یہاں کے حلوائی مٹھائی بنانی نہیں جانتے۔ نہاری جس کی اتنی تعریف ہے، کباب جس پر رال ٹپکائے دیتے ہیں گُھلی ہوئی مرچوں اور جلے ہوئے گوشت کے سوا کیا رکھا ہے۔ کیا جواب دیں؟ "نہ ایسے ہوتے نہ تم پر مرتے" رات گئی بات گئی۔ جو کوئی اور جو کچھ کہے سچ ہے۔

کوئی فن ہو اصل میں قدر دانی کی گود میں پرورش پاتا ہے۔ قلعہ آباد تھا۔ اُمرا کی ڈیوڑھیاں برقرار تھیں۔ مُلک گیری اور مُلک داری والے تو خلد آشیاں اور جنّت مکاں ہو چلے تھے۔ رہ گئی تھی صرف شاہی اور امارت کی باتیں، بازیاں، عیاشیاں اور کھانا اڑانا خالی بیٹھے کیا کرتے۔ لباس کی تراش خراش ہوتی یا دسترخوان کی زیبایش۔ درزی اپنی کاری گریاں دکھاتے باورچی، نان بائی، رکاب دار طرح طرح کی استادیوں سے کھانے کے اقسام بڑھاتے، انعام پاتے۔ بادشاہت اُجڑی۔ اہلِ کمال دربدر کی ٹھوکریں کھاکر بازاروں میں نکلے۔ پیٹ بڑی بلا ہے۔ کیسی آن اور کس کی شان؟ کوئی کبابی بن گیا۔ کسی نے نہاری کی دُکان کر لی۔ اس طرح اکثر خاص کھانے جو سچّی چینی کے پیالوں اور بلوری قابوں میں تورہ پوشوں سے ڈھکے ہوئے شاہ زادوں اور شہزادیوں کے سامنے آتے تھے، ڈھاک کے پتّوں کے دُونوں اور مٹّی کے جھجرے برتنوں میں نکلنے لگے عوام النّاس کا بھلا ضرور ہوا مگر فن کی ترقی رُک گئی۔ جو مرا اپنا فن اپنے ساتھ لے گیا کسی نے اپنا جانشین نہ چھوڑا۔

دِلّی کے اکثر دُکان داروں میں یہ بات پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے کہ وہ گاہکوں کے منہ کا خیال رکھتے ہیں۔ وار سے سودا دیتے ہیں تاہم خریدار کی وجاہت

اور خریداری کی نوعیت سے ان کا یہ قاعدہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ لیکن گھمی اس اصول کا بڑی مضبوطی سے پابند تھا۔ اس کی نگاہ میں ایک پیسے کے اور ایک روپے کے کباب لینے والا برابر تھا۔ اب اس کو کوئی بُرا کہے یا اچھا۔ اس کے اس طریق کی کوئی مذمت کرے یا تعریف۔ وہ بڑے سے بڑے موٹر میں بیٹھ کر آنے والے کی پروا نہیں کرتا تھا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے کہ "میاں ایسی جلدی ہے تو کہیں اور سے لے لو، میں تو نمبر سے دوں گا۔" باوجود اس کے کہ میں اس کا لگا بندھا گاہک تھا، اس کو میری خاطر بھی منظور تھی۔ مجھے وہ خاص طور پر زیادہ دہی لگا کر دھیمی آگ پر سنکے ہوئے کباب دیا کرتا تھا۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ نمبر کے خلاف دیے ہوں۔ ذرا جلدی کی اور اس نے تیوری چڑھا کر کہہ دیا کہ "حضت گھمی کو اپنی جنٹلمینی سے نہ دبایئے۔ آپ سے پہلے کا یہ لونڈا کھڑا ہے اس کی سیخ سینک دوں پھر آپ کا وار ہے۔ دیکھیے یہ آپ کے واسطے لگا رکھی ہے۔"

گھمی کی اس مستقل عادت سے دو چار دفعہ ہمیں تکلیف بھی ہوئی اور بڑا بھی معلوم ہوا لیکن ایمان کی بات ہے کہ اُس جاہل کبابی میں یہ خصلت ایسی تھی کہ ہزاروں پڑھوں لکھوں میں نہیں ہوتی۔ مساوات کا سبق میں نے اسی دُکان پر پڑھا تھا۔ حالاں کہ ان حضرت کی اس حق شناسی کی بدولت جس میں کوئی استثنا ہی نہ تھا، ایک مرتبہ مجھ کو سخت خفت، پریشانی اور بے حد ذلت اٹھانی پڑی۔ اس واقعے کے بعد وہ مرگیا اور مجھے مرنا ہے۔ آج تک میں پچھتاتا ہوں۔ اور اپنی اجتہادی حماقت اور گھمی کی جہالت آمیز عمل نمبری پر ماتم کرتا ہوں۔

علی گڑھ سے کرکٹ کی ٹیم آئی ہوئی تھی۔ میرے چند کھلاڑی دوستوں نے اس کی دعوت کر دی۔ اس دعوت کی انتظامی مجلس کا میں بھی ایک رکن تھا کھانوں کی فہرست تیار ہوئی۔ شامتِ اعمال میرے مُنہ سے نکل گیا کہ گھمی کے کباب بھی ہونے چاہییں۔ تھوڑے بحث و مباحثے کے بعد میری رائے پاس ہوگئی۔ مگر ساتھ ہی اس پر زور دیا گیا کہ جہاں کھانا کھلایا جائے وہیں میاں گھمی کباب لگائیں تاکہ گرما گرم ہوں۔ اِدھر اُتریں اور اُدھر دسترخوان پر آئیں۔ اور اس کا انتظام مجھ بدنصیب

کو سونپا گیا۔ میں خوش تھا کہ مفت میں گھمّی پر احسان ہوگا اور علی گڑھ والے بھی کیا یاد کریں گے کہ دِلی کی وہ دعوت کھلائی، جو کھانے والے کو سر سے پانو تک جنتی بنا دیتی ہے اور جس کے پہلے ہی نوالے میں خضوع وخشوع شروع ہو جاتا ہے۔

خوشی خوشی میاں گھمّی کی دُکان پر پہنچا۔ وہ ابھی آئے نہ تھے۔ ایک لڑکا اُن کا ٹھیا صاف کر رہا تھا۔ اتنے میں وہ بھی لُنگی باندھے تہبند سے اونچا بنیان پہنے بڑے ٹھسے سے تشریف لائے۔ سر پہ پتیلا، بغل میں روٹیاں، دونوں ہاتھوں میں دو پوٹ۔ سامان رکھتے رکھتے بہت کچھ تصنیف کر ڈالا۔ جب ذرا ہلکے ہوئے تو مجھ سے پوچھا میاں آج اس وقت کہاں، سیخیں تو گھنٹہ بھر میں تیار ہوں گی۔ مگر وار پہلا تمہارا ہوگا۔ میں نے کہا ـــــــ اس وقت تو میں کباب لینے نہیں آیا ہوں تمہارے لیے ایک کام لایا ہوں۔ بولے میاں میں کس کام کا ہوں، کباب بیچتا ہوں اور پیٹ بھرتا ہوں۔ اور یہ فقرہ کچھ ایسے انداز سے کہا کہ مجھ کو خیال آیا کہ کہیں کم بخت انکار کر دے تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو جائے۔ ڈرتے ڈرتے کہا کہ بھئی ایک دعوت ہے اور اس میں تمہارے کبابوں کی ضرورت۔ علی گڑھ تک نام ہو جائے گا جواب دیا کہ کباب جتنے چاہیں لیجیے، اور ایسے مزے کے لیجیے کہ کھانے والے انگلیوں چاٹتے رہ جائیں۔" میں نے کہا" مگر ایک شرط ہے۔ دعوت کی جگہ چل کر تیار کرنے پڑیں گے" کہنے لگے میاں یہ جھگڑے کی بات ہے۔ گھمّی سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کے دروازے پر جائے، یہیں سے لے جایئے گا۔" اس جملے میں ایسی مڑک تھی۔ میں گھبرا گیا اور زور دیتے ہوئے کہا" لو اور سنو! میں تو اپنے دوستوں سے وعدہ کر آیا ہوں۔ اپنے دلی والے کی اتنی لاج بھی نہیں۔" یہ سُن کر میاں گھمّی کچھ پسیجے۔ اب دُکان پر چند کبابوں کے رسیا بھی آ گئے تھے۔ کہنے لگے۔ تم گھمّی کی آن توڑتے ہو۔ خیر۔ گھمّی نے تو آج تک دوسرا در دیکھا نہیں۔ کبھی اس ٹھیے سے اُٹھ کر کہیں گیا ہو تو کلمے کی مار پڑے۔ مگر اب تم سے کیا کہوں۔ اچھا ...... مگر یہ بچارے کس کی جان کو روئیں گے۔ یہ غریب جو کباب لینے کو آئیں گے تو کیا کہیں گے .... وقت کون سا ہوگا؟" دعوت رات کی تھی اور دعوتوں کا عام طور پر یہی وقت ہوتا ہے۔ میں نے کہ دیا رات کا وقت ہوگا۔ لیکن تم کو دن سے آنا پڑے گا۔ یہ سُن کر میاں گھمّی کو پھر جلال آگیا۔ بولے "حضت اگر مجھ پر ایسا ظلم کرنا

ہے تو دوپہر کا وقت مقرر کرو وہاں سے فراغت پا کر میں اپنی دکان تو لگا سکوں نہیں تو میرا سلام ہے۔ اس سے زیادہ میں آپ کی مروت نہیں کر سکتا۔"

دستر خوان پر گھمّی کے کباب نہ ہوں اور میری بات میں فرق آئے۔ اس سے یہ آسان تھا کہ دعوت کا وقت بدل دیا جائے چنانچہ اپنی ترکیب سے یاروں کو سمجھا دیا۔ اگرچہ نفسیات اور فلسفے کا سارا زور لگانا پڑا۔ دعوت دن کے گیارہ بجے قرار پائی اور اس کی میاں گھمّی کو بھی اطلاع دے دی گئی اور یہ بھی بتا دیا کہ اتنے آدمی کھانا کھائیں گے اور سب کے سب تقریباً نوجوان انگریزی فیشن اور انگریزی مذاق کے ہوں گے جس کے جواب میں گھمّی نے عارفانہ لہجے میں صرف یہ کہا " اللہ مالک ہے۔ اسی نے اب تک تو گھمّی کی آبرو رکھی ہے۔"

دعوت ایک قدیم وضع کے مکان میں ہے۔ صدر دالان میں دستر خوان بچھانے کا انتظام ہے۔ صحن چبوترے سے نیچے ایک سہ دری میں میاں گھمّی ٹاٹ کے ایک ٹکڑے پر پھسکڑا مارے تشریف فرما ہیں۔ تسلے میں مسالا ملا ہوا قیمہ۔ زانوؤں کے قریب سیخوں کا ڈھیر، مٹی کے کونڈے میں پیاز کا لچھا۔ باریک کتری ہوئی ادرک ہری مرچیں، لیموں اور پودینہ رکھا ہوا ہے۔ کوئلے سلگ رہے ہیں۔ پنکھا چل رہا تھا۔ میں صبح سے موجود تھا اور ہر دس منٹ بعد میاں گھمّی کو جھانک آتا تھا۔ نو بجے کے بعد جب دعوت کے دوسرے منتظم آئے اور انھوں نے کہا کہ سارے کھانے تیار ہیں۔ تنور بھی گرم ہے۔ مہمانوں کے آتے ہی باقرخانیاں لگنی شروع ہو جائیں گی تو مجھے بھی کبابوں کی تیاری کا فکر ہوا۔ جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ابھی نہ پورے کوئلے دہکے ہیں نہ قیمے نے کبابوں کی شکل اختیار کی ہے۔ میاں گھمّی بڑے آرام سے بیٹھے قیمے کو دہی ڈال ڈال کر مِنھ رہے ہیں۔ دو چار منٹ تو میں صبر دیکھتا رہا۔ آخر اُکتا کر پوچھا۔

" میاں گھمّی! یہ کیا کر رہے ہو؟ ابھی تو سیخیں یونہیں پڑی ہیں۔ کباب کب تیار ہوں گے؟ دیکھو دس بجنے کو ہیں اور ٹھیک گیارہ بجے دستر خوان بچھ جانا چاہیے۔"

گھمّی: میاں میں نہ خالی بیٹھا ہوں نہ کھیل رہا ہوں۔ کام اپنے رستے سے ہوا کرتا ہے۔ قیمے کو ذرا درست کر لوں تو سیخوں کو لوں۔ اتنے میں کوئلوں کا

تاو بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

میں : لیکن ہمارے پاس تو صرف چالیس پچاس ہی منٹ ہیں اور تمہارے کام میں ابھی بہت دیر معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے کھانے کبھی کے تیار ہو چکے۔

گھمی : میاں ان کا اور کام ہے اور میرا اور کام۔ یہ گھمی کے کباب ہیں۔ آخر جب سے آیا ہوں اسی میں لگا ہوا ہوں۔ آپ گھبرائیں نہیں اللہ مالک ہے۔

میں : اللہ تو مالک ہے مگر خدا کے بندے تم نے یہ اوپر کا کام بھی پہلے نہ کر لیا۔ اب کوئی دم میں مہمان آنے شروع ہو جائیں گے۔ وقت کی پابندی بہت ضروری ہے۔

گھمی : آپ میرے ہاتھ پاؤں نہ پھلایئے۔ میں وقت کو دیکھوں یا اپنے کام کو دیکھوں۔ یہ تو مجھ سے کبھی ہوگا نہیں کہ آپ کی ٹیم کی وجہ سے کباب کو خراب کر دوں۔

میں : بھئی تم آج مجھ کو بغیر ذلیل کیے نہیں رہو گے۔ خدا کے واسطے کچھ تو پھرتی کرو۔ تو بس قیمے سے کشتی لڑ چکے۔ آگ بھی خوب دہک گئی ہے۔ سیخیں لگانی شروع کر دو۔

گھمی : اسی لیے تو پرائی تابعداری نہیں کرتا۔ بڑے بڑے نوابوں نے بلایا۔ نہیں گیا۔ دنیا کے انعام کا لالچ دیا لیکن میں نے دوسروں کی حکومت اٹھانے سے اپنی اسی حالت کو اچھا سمجھا۔ پھٹے حالوں رہتا ہوں۔ بلا سے کسی کا نوکر تو نہیں۔ غلامی تو نہیں کرنی پڑتی۔

میں : تم کس کے نوکر ہو۔ اس وقت تو ہم تمہارے نوکر ہیں۔ صرف یہ عرض ہے کہ ہماری دعوت پھیکی نہ رہ جائے۔

گھمی : اللہ نہ کرے پھیکی کیسی اتنی چٹ پٹی ہو کر عمر بھر یاد رہے۔ اچھا آپ تشریف لے جائیں اور پورے آدھے گھنٹے بعد کباب لینے شروع کر دیں۔

یہ کہہ کر میاں گھمی نے ہاتھ کسی قدر تیزی سے چلائے اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری سیخوں پر قیمہ چڑھا کر تاگے لپیٹ ڈالے۔ ایک سیخ سے کوئلوں کی سطح کو برابر کیا۔ اینٹیں جو کوئلوں کے دونوں طرف سیخیں لگانے کے لیے رکھی تھیں ان کو دیکھا اور برابر

برابر تمام سیخیں لگا دیں۔ پنکھا چلانے والے چھوکرے کو حکم دیا اسے ذرا دبا کر ہاتھ چلا۔

گیارہ بجنے میں دس منٹ تھے کہ مہمان آپہنچے۔ کالج کے طلبہ عموماً آزاد اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ آتے ہی انھوں نے کھانا مانگا۔ مہمان، میزبان، طفیلی اور تُف طفیلی سب ملاکر کوئی پچاس آدمی تھے۔ دستر خوان بچھا۔ خالی رکابیاں رکھی گئیں۔ قابوں میں کھانا نکل نکل کر آنے لگا۔ نان بائی نے باقرخانیاں لگانی شروع کر دیں۔ مجھ کو اپنے کبابوں کا اندیشہ تھا۔ لپکا ہوا میاں گھمّی کے پاس پہنچا۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا، حضت یہ چالیس سیخیں تو تیار ہیں۔ کھلانا شروع کر دیجیے۔ خدا نے چاہا تو اب تار نہیں ٹوٹنے پائے گا۔ یہ سُن کر میں نے دیکھا تو حقیقت میں آٹھ نو رکابیاں کبابوں سے بھری رکھی تھیں اور اُن پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیاز کا لچھا۔ ادرک کی ہوائی۔ ہری مرچیں اور کترا ہوا پودینہ چھڑکا ہوا تھا۔ خوشی کی گھبراہٹ میں کہیں یہ پوچھ بیٹھا کہ بھئی کبابوں کے تاگے بھی نکال دیے ہیں؟ یہ کہنا تھا کہ میاں گھمّی آئیں تو جائیں کہاں۔ جان کو آگئے۔ "میاں تم نے مجھے کیا کوئی گنوارا سمجھا ہے۔ میں نے کوئی گھامڑوں میں عمر گزاری ہے۔ واہ صاحب واہ، اچھی قدردانی کی! کیا کہنے آپ کی سمجھ کے۔ میاں دلّی رہ کر بھاڑ نہیں جھونکا ہے۔ کباب بیچے ہیں کباب اور وہ بھی جامع مسجد تلے جہاں ایک سے ایک تانا شاہی مزاج کا آدمی آتا ہے۔ بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے لوگوں کو بھگتا ہے۔ خوب حضت خوب کیا بغیر تاگے نکالے رکابیوں میں لگا دیتا۔ ہت تیری قسمت کی ایسی تیسی۔ نہیں میاں یہ وقت کی خوبی ہے۔ گھمّی چالیس برس کا کبابی اور اُس سے پوچھا جاتا ہے کہ کبابوں میں سے تاگے نکال دیے۔ اچھا میاں اچھا!"

میاں گھمّی بڑبڑاتے رہے اور میں نے آکر نوکروں کو بھیج دیا کہ کبابوں کی رکابیاں اُٹھا لائیں اور دستر خوان پر چن دیں۔ کھانا شروع ہوا۔ کم بختی جو آئی میں نے میاں گھمّی کی تعریف اور کھانوں میں سب سے پہلے کباب پیش کیے۔ کچھ تو کباب کے ذائقے نے سارے کھانوں کا ملیا میٹ کر دیا، جس نے اُس کا ایک لقمہ کھایا اُس نے دوسرے کسی کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ چند منٹ نہ گزرے تھے کہ کبابوں کی ساری

پلیٹیں صاف۔ اتنے میں پچیس تیس سیخیں اور تیار ہو گئی تھیں وہ آئیں اور تکا بوٹی ہو گئیں۔ اب تو یہ عالم ہو گیا کہ ادھر کباب آئے اور اُدھر غائب۔ آنے میں دیر ہوئی تو پھبتیاں کسی جائیں۔ یہ تہذیب شہد سے تعلیم یافتہ لگا رہے کسی کے روکے کب رُکے تھے اُٹھ اُٹھ کر دوڑنے لگے۔ جو جاتا تھا میاں گھمی سے کباب بدلے آتا تھا اور دسترخوان پر آتے ہی چھینا جھپٹی ہوتی تھی۔ جب معاملہ اس سے بھی گزر گیا اور کباب تیار نہ ملے تو جو جاتا میاں گھمی اس سے کہہ دیتے۔ "حضرت رکابی چھوڑ جایئے کباب سک جائیں تو آ کر لے جایئے گا۔" رکابیاں چھوڑ دی گئیں اور انتظار ہونے لگا۔ اب ایک جاتا ہے " میاں گھمی کباب لاؤ۔ جواب ملتا ہے آپ کا ابھی نمبر نہیں۔ وہ لمبے سے عینک لگائے کھڑے ہیں، پہلے پلیٹ اُن کی آئی ہے۔ دوسرا آتا ہے "لاؤ بھئی ہمیں تو دو" " ارے میاں میں وار سے دوں گا۔" نمبر اور وار سنتے سنتے آخر جل گئے۔ سعید صاحب جو اس ساری پارٹی کے سرغنہ اور پورے جلاتن تھے، بگڑ گئے۔ مجھ سے کہنے لگے: "اشرف! یہ تمہارا کبابی آدمی ہے یا پیسے والا ٹرو۔ نمبر وار دوں گا، نمبر وار دوں گا کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کہیں میں چانٹا نہ مار بیٹھوں۔" یہ سننا تھا کہ گھمی کے تن بدن میں مرچیں لگ گئیں۔ غلّہ سی آنکھیں نکال کر بولے۔ گھمی کو چانٹا مارنے والا تو آج تک پیدا ہوا ہی نہیں۔ یہ سیخچہ بھی دیکھا ہے، آدمی کا پیٹ پھاڑ دیتا ہوں۔ تم جیسے انگریزوں کی بیٹ چاٹنے والے ہزاروں دیکھ ڈالے ہوں گے۔ ولایت والوں کی اُترنیں کیا پہننے کو مل گئیں کہ اترا ہی گئے۔ ارے ذرا ان کنگلوں کی صورتیں تو کوئی دیکھے۔ پھر غصّے سے میری طرف مخاطب ہوئے۔ آپ نے یہ بہروپیے کہاں سے پکڑ بلائے ہیں۔ ایسے لٹیرے مہمان تو ہم نے کہیں دیکھے نہ سُنے۔ کیوں جی ایسے ہی جنٹلمین ہوتے ہیں؟"

اِدھر میاں گھمی پر بکواس کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ اُدھر بعض نوجوان بھی بگڑ چلے۔ میں ڈرا کہیں گھمی پر حملہ نہ ہو جائے اور وہ اپنی پھوہڑ زبان کی پاداش میں واقعی پٹنے نہ لگے۔ ہنستا ہوا چہرہ بنا کر ایک مصنوعی قہقہہ لگایا اور گھمی سے کہا۔ "واہ لونڈوں کے چھانسے میں آ گئے۔ یہ تو تمہاری زبان کی بانگی دیکھتے تھے۔ بچلو۔

اپنی بانی ختم کرو۔ کب تک ٹیسواڑا رہے گا۔ جن جن صاحبوں کی رکابیاں رکھی ہیں۔ اُنھیں کباب دو۔ تم نے کباب ہی ایسے بنائے ہیں کہ مُنہ سے لگ کر چھوٹتے ہی نہیں۔" میری اس تقریر کا بھی اُن پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اور زیادہ سخت لہجے میں بولے۔ کس نے منع کیا ہے۔ نمبروار آئیں اور لے جائیں۔ بے نمبر تو میں لاٹ صاحب کو بھی دینے والا نہیں۔ یہ کس کھبت کی مُولی ہیں۔ رفع شر کی غرض سے میں نے کسی قدر لجاجت سے کہا میاں گھمی یہ تمھاری دُکان تو نہیں ہے جہاں تم نے نمبر کی شرط لگا رکھی ہے۔ یہ تو ہمارا مکان ہے۔ یہاں پہلے اور پیچھے آنے والے کا کیا سوال یہ گاہک تو نہیں کہ بُرا مانیں گے۔ آؤ غصّے کو تھوک دو اور کباب دو۔ لیکن گھمی ہیں کہ اپنی ضد سے ایک انچ ہٹنا نہیں چاہتے۔ جواب دیا۔ میاں مکان ہو دکان ہو یا آسمان ہو، اپنی عادت کیوں بگاڑوں۔ پرائے شگون کے لیے ناک کٹوانا مجھے نہیں آتا۔ اگر آپ کو ان کی ایسی ہی خاطر منظور ہے تو آیئے بسم اللہ کباب لگایئے اور جس طرح جی چاہے دیجیے۔ گھمی تو اپنے ہاتھ سے دے گا، نمبروار ہی دے گا۔ یہ کہتے کہتے میاں گھمی کھڑے ہو گئے۔ اور تولیہ کندھے پر ڈال چلے۔ میں نے ہر چند سمجھایا، پھُسلایا۔ ٹھوڑیوں میں ہاتھ دیے لیکن اُن پر بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اِدھر یہ خیال کہ دعوت میں کھنڈت پڑ ہی چکی ہے۔ خدا نہ خواستہ کوئی اور حرکت نہ ہو جائے۔ حماقت کی شرارت سے ٹکر ہو گئی تو غضب ہی ہو جائے گا۔ اس لیے گھمی کو جانے دیا۔ لوگوں نے دُور تک اُنھیں شور مچاتے سُنا۔ گویا ریل کا انجن تھا کہ اکیلا دھواں چھوڑتا چیختا چلا جاتا ہے۔ اور میں دل ہی دل میں اپنے اوپر ملامت کرتا رہا آج بھی جب کبھی یہ واقعہ یاد آجاتا ہے تو اپنی بیوقوفی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ملّن نائی

ملّن نائی بچارے کی روح نہ شرمائے بڑے مزے کا آدمی تھا۔ اوزاروں سے زیادہ اُس کی زبان چلتی تھی۔ یوں تو سارے نائی باتون ہوتے ہیں۔ شیخ سعدی نے بھی گلستاں میں اُن کی تعریف میں ایک حکایت لکھ ڈالی ہے۔ الف لیلہ میں بھی ایک حجّام کا قصّہ پڑھا ہوگا۔ مگر اُس کے انداز سب سے نرالے تھے۔ پیشے کے لحاظ سے اُس میں کوئی خوبی نہ تھی۔ مگر اس کے سوا شاید اُسے کچھ نہیں آتا تھا۔ دادا کے وقت کی کِسوت۔ دقیانوسی اُسترے۔ کسی کا دستہ گھُن کھایا ہوا، کسی کا پھل زنگ آلود۔ وہ بھی آدھا۔ قینچیاں بھی ایسی ہی کُھنڈی، بال کاٹنے کی مشین دیکھو تو انجر پنجر ڈھیلا۔ پیتل کی کٹوری کے بدلے بال پڑی کنارے ٹوٹی ایک چھوٹی سی چینی کی پیالی۔ صابن اوّل تو کون رکھے اور رکھا بھی تو کپڑا دھونے کے صابن کی کرچ۔ کنگھے میں گنتی کے دانتے۔ میل سے اٹا ہوا۔ صورت پہ نحوست برستی۔ ایسی حالت میں بھلا کوئی شریف اِس کے آگے سر جھکاتا یا کسی اُجلے پوشش کی شامت آئی تھی کہ اپنے کلّوں پر ہاتھ پھِروا"!۔

لیکن ہم نے ملّن کی جوانی بھی دیکھی ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد یہ ایسا گھس کھُدا نہ تھا۔ سیتا رام کے بازار میں مرغوں والی گلی کے سامنے آپ نے بڑے ٹھاٹ کی دُکان کھولی تھی۔ ہم نے پہلے پہل وہیں ان کی زیارت کی خط بڑھ گیا تھا صاف ستھری دُکان دیکھی، ٹھوڑی میں کھجلی ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ

قریب پہنچا۔" آئیے بابو صاحب شیو بنوائیے گا۔ آپ کے لائق جگہ ہے۔ تشریف لائیے۔"

میں : بھئی تم تو ابھی لالہ کو مونڈ رہے ہو۔

مُلّن : اب دو ہاتھ میں انھیں مونڈا۔ آپ اتنے آرام کریں۔

میں بیٹھ کر سیر دیکھنے لگا۔

مُلّن : لالہ ہوشیار ہو جاؤ میں اب ہاتھ چلاتا ہوں۔ میاں بیٹھے ہیں۔ پہلے ہی دہلے میں لالہ کے کلّے پر چرکا دیا۔

لالہ : (جھجک کر) رام رام۔ ارے یار یہ کیا کیا۔

مُلّن : کیا ہوا؟ سیدھے کیوں نہیں بیٹھتے۔ (اتنے میں دوسرا چرکا ٹھوڑی پر لگا۔)

لالہ : خلیفہ تم تو کوئی بڑے اناڑی ہو۔ بھلی حجامت بنائی۔

مُلّن : تمھیں بھی تو اچک دم کی بیماری ہے۔ اُسترا ہی تو ہے بہک گیا۔

مجھے اس کی باتوں پر ہنسی آگئی۔ فرمانے لگے۔ میاں نائی کے سامنے بڑے ادب قاعدے سے بیٹھنا چاہیے۔ جب تک ہتوٹ کے داؤ یاد نہ ہوں اُسترے کی زد سے بچنا آسان نہیں۔ بچارے بادشاہی بال بروں (بار بر)۔ اسے اصلاح بنوائی کیا جائیں۔

میں : کیا حجامت بنوانے کے بھی قاعدے ہیں۔

مُلّن : جی قاعدے ہی نہیں بلکہ چہرہ مہرہ بھی ہونا چاہیے۔

میں : اچھا!

اتنے میں لالہ اپنے زخمی چہرے پر ہاتھ پھیرتے اور مُلّن کو بُرا بھلا کہتے چلے جاتے ہیں۔

مُلّن : جی ہاں نہیں تو اُسترا کاٹ کھاتا ہے۔

میں : تو یہ جو اس غریب کو تم نے زخمی کر دیا۔ تمھارا اناڑی پن نہیں؟

مُلّن : (اُسترے کو بھٹری پر لگاتے ہوئے) میرا اناڑی پن تو جب ہوتا کہ اس کی پیشانی درست ہوتی۔ خپ چول ٹھوڑی کلّے پھوڑے ہوئے۔ کہیں سے اونچا کہیں سے نیچا۔ اُسترے نے دو چار جگہ ٹھوکر کھائی۔ اچھا آپ آئیے بسم اللہ۔ اوزار تیار ہیں۔

میں : (ہچکچاتا ہوا آگے بڑھ کر) یار میری صورت دیکھ لو۔ ٹھیک ہے نا۔ کہیں تمہارا اُسترا ٹھوکر کی نہ لینے لگے۔

مُلّن : توبہ توبہ۔ استرے کو توڑ دوں۔ دیکھیے تو سہی۔ نیند نہ آجائے تو کہیے (ٹھوڑی کو پانی لگاتے ہوئے) میاں ڈاڑھی بنانا تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ خط کی اصلاح بڑی اُستادی کا کام تھا۔ سو میاں میرے، اصلاح تو شہر آبادی کے ساتھ گئی۔ اصلاح بنوانے والے نہ رہے تو بنانے والے کہاں رہتے۔ انگریزی راج نے بڑے بڑے مردوں کو زنانوں میں ملا دیا۔ جسے دیکھو انگریزوں کی ریس میں کلّا سوف تعلمون۔

میں : (بات کاٹ کر) ارے بھئی یہ تو بتاؤ دلی والوں نے ڈاڑھی کب سے منڈانی شروع کی؟

مُلّن : بابوجی۔ یہ تو آپ نے بڑی ٹیڑھی بات پوچھی۔ یہاں میں نے بھی کان پکڑے۔

میں : اپنے بڑوں سے سُنا تو ہوگا۔

مُلّن : بڑے اپنے حسابوں دیکھے کس نے ہیں۔

میں : کیوں کیا یتیم پیدا ہوئے تھے؟

مُلّن : واہ سرکار واہ! یتیم کیوں پیدا ہونے لگا تھا۔ مگر بڑوں کو بڑا کس نے سمجھا۔ باوا دادا کی سُنی کس نے؟ خدا کی شان ہے مُلّن اور کسوت سنبھالے!

میں : تو بھئی تم بگڑے ہوئے حجّام ہو؟

مُلّن : ہاں میاں اب تو حجّام ہوں۔ مگر بگڑا ہوا نہ کہیے۔ تھوڑے دنوں ہوا لگ گئی تھی۔ بات یہ ہے کہ نوابی بھی کر کے دیکھ لی۔

میں : بھئی بگڑا ہوا حجّام میرے مُنہ سے غلط نکل گیا۔ بگڑے ہوئے نواب کہنا چاہتا تھا۔

مُلّن : اجی نواب کیا شہزادہ۔ بلکہ جو میں نے اس شہر میں مزے اُڑائے ہیں شہزادے کیا کھا کر اُڑائیں گے۔ ساری چاوڑی میں مُلّن ہی مُلّن کے گیت گائے جاتے تھے۔

میں : کیا کہنا! پھر یہ دُکان کب کھولی؟
مُلّن : جب جیب خالی ہو گئی۔ جوانی کا نشہ اُترتے ہی۔
میں : اچھا کسی پر عاشق بھی ہوئے۔
مُلّن : حضت عاشق ہونے کی نہ پوچھیے (ٹھنڈا سانس لے کر) آپ کہیں گے مُلّن بڑا شیخی خورا ہے۔ مگر...... بس یہ سمجھ لیجیے کہ اس عاشق مزاجی نے دُنیا بھر کی خاک چھنوائی۔
میں : کیا مطلب؟
مُلّن : اجی ہزاروں روپے خاک میں ملا دیے۔ دکن گیا۔ بنگالے میں گانو گانو پھرا۔ کامروپ دیس کی ٹھوکریں کھائیں۔
میں : بڑی بڑی سیریں کیں! معشوقوں کے پیچھے پیچھے گئے ہو گے؟
مُلّن : وہ تو دِلّی سے کہاں جاتی؟ یہیں رہی۔
میں : پھر تم کس فراق میں دیس دیس پھرے۔
مُلّن : سرکار آپ بھی ماشاءاللہ بڑے بھولے ہیں۔ وہ ایک لکھ پتی لالہ کی لوکر تھی۔ مُلّن ٹھہرا نائی۔ وہاں دال کیا گلتی۔ لیکن دل آیا ہوا بُرا ہوتا ہے۔ دوسرے مجھے جھونجل آگئی کہ جسے مُلّن چاہے وہ اور کے ساتھ عیش اُڑائے۔ پہلے تو اپنی ہتو بتوں سے کام لیا۔ جب وہ سامان ہی میں نہ آئی اور معاملہ بکٹ ہوتا چلا گیا، تو حضت مرتا کیا نہ کرتا سفلی گروں کی تلاش ہوئی۔ شہر کا چپہ چپہ کھوند ڈالا۔ بیسیوں جادو ٹونے کرنے والے ملے پر جس کی دم اُٹھائی مادہ۔ جسے پایا ٹھگ۔ آخر لگی بُری ہوتی ہے اسے اور اس کے لالہ کو نیچا دکھانا تھا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔
میں : تھوڑی گھسے کب تک جاؤ گے کلّوں کو رگڑتے رگڑتے تم نے تو چھالوں بنا دیا!
مُلّن : سرکار کھونٹیوں کے اندر پانی اتار رہا ہوں۔
میں : صابن نہیں لگاتے!
مُلّن : صابن لگانے کے وقت پر صابن بھی لگاؤں گا۔ مگر آج تو مُلّن کا کمال دیکھیے۔

بغیر صابن کے آئینہ کر دوں گا۔

میں : اچھا پھر گھر سے چل پڑے۔ جادوگروں کی تلاش میں پہلے کہاں گئے؟

مُلّن : قصہ تو بہت لمبا ہے۔ ایک برس کی ٹھوکریں کھائیں۔ پورے ایک برس روپے کا کھلیان ہو گیا۔ کلکتہ میں پتا لگا کر کامروپ دیس میں بڑے بڑے جادوگر بستے ہیں۔ ایسے ایسے کہ آدمی کو مکھی بنا دیں۔ جو بیماری کہو لگ جائے۔ جس کو چاہیں مار ڈالیں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے ایسی موٹھ ماریں کہ انسان پڑا رہا کرے۔

میں : کیا یہ سچ ہے تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

مُلّن : واہ حضت دیکھنے کی ایک ہی کہی۔ اجی اپنے ہاتھوں سے یہ سارے کام کیے۔ لیکن محنتیں بھی وہ کیں کہ خُدا یاد آگیا۔ لونا چماری اگیا بیر، بھوت نانھ کالی مائی سب کی بھینٹیں چڑھائیں۔ پھر پھل بھی ملا۔ استاد کی دعا سے توبہ ہے اس وقت آپ کے شہر میں مُلّن ہی مُلّن ہے۔

میں : تو دو چار۔ انچھر تمھیں بھی آتے ہیں۔

مُلّن : (کانوں کو ہاتھ لگا کر) دو چار انچھر! توبہ کر کے کہتا ہوں۔ میرا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ کسی کے پاس ایک چیز ہوگی۔ یہاں بیسیوں اور سب ایسی تیز جیسے استرے کی دھار (اُسترا چلانا شروع کر دیا تھا۔ ہاتھ چلاتے ہیں دھیان جو بہکا تو کان کی لو میں چرکا لگ گیا۔

میں : ارے کان کاٹ دیا (کان کی لو کو ہاتھ جو لگایا تو خون) عجب اناڑی آدمی ہو۔

مُلّن : کچھ نہیں ہوا بابو جی۔ آپ کے کان کی لو ذرا زیادہ لٹک آئی ہے۔ بُری معلوم ہوتی تھی۔ میں نے سوچا اس کا ٹکڑ جانا ہی اچھا ہے۔ غصہ تو بہت آیا۔ مگر کیا کرتا۔ ضبط کیا اور ہنسی میں ٹال دیا۔

مُلّن : میاں نائیوں کو لوگوں نے ذلیل سمجھ لیا ہے۔ ہم تو اگلے وقتوں میں حکیموں کے داہنے ہاتھ تھے۔ حکیموں کے برابر ہماری عزت تھی۔ بادشاہوں نے ہمارے آگے سر جھکائے ہیں۔

میں : (ہنس کر) کیوں نہیں۔ اچھا تو وہ قصہ پورا کرو۔

مُلّن : بس سرکار قصہ وصہ کیا جو ہونا تھا ہو گیا۔
میں : لالہ کو نیچا دکھا دیا۔
مُلّن : اجی ایک لالہ کیا نہ جانے کتنے چکر بھتی بن گئے۔ جادو میں بڑی طاقت ہے۔
میں : جادو واقعی کوئی چیز ہے؟
مُلّن : آپ نے خوب کہی۔ سرکار نے سُنا نہیں، جادو برحق کرنے والا کافر ہے۔
میں : اب بھی کچھ کرتے کراتے ہو یا چھوڑ چھاڑ دیا۔
مُلّن : یہ چسکا کہیں چھوٹتا ہے۔ اور پھر میں تو کبھی کا چھوڑ دیتا۔ لوگ بھی چھوڑنے دیں۔
رات ہی کو ایک صاحب آکر سر ہو گئے مرگھٹ جانا پڑا۔ لینا ایک نہ دینا دو۔
میں : کیوں؟ کچھ ملا نہیں۔ کوئی مفتیوں کے خاندان سے تھے۔
مُلّن : اجی واہ، مُلّن کو آپ نے کیا سمجھا ہے۔ مفتی ہو یا قاضی۔ چھوڑنا کام چڑی مار کا ہے۔ بیس روپے کی مزدوری کی۔ مگر یا بوجی کام اچھا نہیں۔ ذرا دھیان بہکا اور جہنّم واصل۔ آپ جانیں کیسی کیسی ظلمی روحوں سے بھینٹا ہوتا ہے۔
پچھلی دیوالی کو بھیروں نے چیڑ غٹو کر ہی دیا تھا۔ اُس نے خون مانگا خون کی کٹوری کُنڈلی کے باہر رہ گئی تھی۔ اُٹھتا ہوں تو خرابی، نہیں اُٹھتا تو وہ مُنہ پھاڑے چلا آتا ہے۔
میں : پھر کیا کیا؟
مُلّن : کیا کیا؟ اوسانوں کی بات ہے۔ جھٹ اپنی چھنگلیا کاٹ اس کے مُنہ میں دے دی۔ اللہ نے خیر کر لی۔ لیا دیا سامنے آگیا۔ ورنہ آج مُلّن کو آپ نہ دیکھتے۔
میں : واقعی غضب ہوتا۔ دنیا سونی ہو جاتی۔
مُلّن : (دانت نکوس کر) دنیا تو سونی دو لی کیا ہوتی۔ میرے جیسے بلکن مجھ سے بھی بڑھے چڑھے نہ جانے کتنے پڑے ہوں گے۔ لیکن شہر میں جادو کی جوت جگانے والا کوئی نہ رہتا۔ یہ بات جاتی رہتی کہ جس نے جادو کو جھٹلایا اور مُلّن خم ٹھوک کر سامنے آیا۔
راتنے میں کُھنڈے استرے نے میرے رُخسار سے ٹکر کھائی، چھوٹا سا دانہ تھا وہ چھل گیا اور خون نکل آیا۔)

میں : ارے کیا زخمی کر دیا۔ آئینہ اُٹھا ذرا دیکھوں تو۔
مُلّن : آئینہ دیکھ کر کیا کیجیے گا۔ دانہ تھا بڑھ جاتا تو بُرا ہوتا۔ میں نے صاف کر دیا۔ اب کچھ ڈر نہیں۔ گندا خون نکل جائے گا۔ آپ ذرا ٹک کر بیٹھے رہیے۔ ہچکولے نہ کھائیے۔
میں : میرے ساتھ بھی تم نے لالہ کی سی حرکتیں شروع کیں (کسی قدر غصّے سے) دھیان سے کام کرو۔
مُلّن : ناراض نہ ہوں۔ کیا مجال جواب کھڑ پینچ آئے۔ بابوجی اگر فرمائیں تو اس طرح اُسترا چلے کہ نیند آنے لگے۔
میں : زیادہ باتیں نہ بناؤ (کھونٹی لینے میں ٹھوڑی پر خراش لگتی ہوئی محسوس کر کے) ارے ظالم ہاتھ سنبھال کر۔ تو نے تو چھیل ڈالا۔ بڑا کُھنڈا اُسترا ہے۔
مُلّن : سرکار استرے کو اُلاہنا نہ دو۔ یہ اُسترا تو بال کی کھال نکال کر رکھ دے۔ بال ذرا سخت ہیں۔ آپ ولایتی صابن لگاتے ہوں گے؟
میں : ولایتی صابن بالوں کو سخت کر دیتا ہے؟ تمھاری بھی وہی مثل ہوئی کہ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔
مُلّن : حضت ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھے کی تو یہ بات ہے کہ شبنم کا رومال مُنہ پر ڈال کر شیو بناتا ہوں۔ ان ہی ہاتھوں سے اور یہی میرٹھ کا بنا ہوا اُسترا ہوگا۔ رہا صابن تو میاں میرے نلّن ولایتی کا قائل نہیں۔ اس سے کھال روڑی اور بال روکھے ہوں۔ اور اپنے ہاں کا بنا ہوا صابن لگائیے پھر دیکھیے۔ مخمل پر ہاتھ رُکے اور چہرے پر نہ رُکے۔

خُدا خُدا کر کے ڈاڑھی مونڈنے کا کام ختم ہوا۔ اس عرصے میں مُلّن ہزاروں رنگ برنگ کی باتیں کر گیا۔ اپنا جادوگر ہونا بھی ثابت کر دیا۔ میرا گھر بھی دریافت کر لیا۔ گھر پر آنے کی اجازت بھی لے لی۔ ڈاڑھی تو کیا مونڈی تھی۔ سارا مُنہ چھیل ڈالا تھا۔ میں شیو کی غرض سے کیوں اُسے بُلاتا۔ لیکن تنتر منتر دیکھنے کی چیٹک میں میں نے چلتے وقت اسے کہہ دیا کہ ضرور آنا۔ چنانچہ تیسرے ہی دن۔ علی الصبح جناب مُلّن صاحب آدھمکے۔

میں : خلیفہ اوزار درست ہیں؟
مُلّن : فَرَوٹ بالکل فَرَوٹ۔

میں : بھائی میں پہلے ہی دُبلا پتلا آدمی ہوں۔ جہاں گندا خون پاؤ وہیں رہنے دینا مہربانی ہوگی۔

مَلّن : (کھی کھی کرکے ہنستے ہوئے) سرکار! اب تو مجھے سرکار کی ڈاڑھی کے رُخ معلوم ہوگئے ہیں۔

ڈاڑھی مُنڈاتے مُنڈاتے میں نے پھر جادو کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور میاں مَلّن ایران توران کی ہانکنے لگے۔ جوانی دیوانی کا زمانہ تھا۔ مجھ پر اس کا جادو اثر کر گیا۔ مہینوں الجھا رہا۔ جب وہ آتا طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر دو چار روپے لے جاتا۔ کیسے کیسے اس نے مجھے چکر دیے۔ اور کیا کیا میرے ساتھ داؤ کھیلے۔ اب کیا کہوں۔ حماقت تھی ہو گئی۔ جس کا نام جادو ہے وہ تو جیسی ٹھگ بدیا تھی ویسی ہی رہی۔ ہاں یہ منتر اس کا ضرور چل گیا کہ میں نے اسے اپنے ہاں باقاعدہ لگا لیا۔ جب تک وہ زندہ رہا میں نے اس کے سوا کسی سے حجامت نہیں بنوائی۔ حالانکہ غریب کو نہ بال کاٹنے آتے تھے نہ ڈاڑھی مونڈنی۔ اس کا کمال صرف باتیں بنانا تھا۔

مرزا چپاتی

خدا بخشے مرزا چپاتی کو، نام لیتے ہی صورت آنکھوں کے سامنے آگئی۔ گورا رنگ، بڑی بڑی اُبلی ہوئی آنکھیں، لمبا قد شانوں پر سے ذرا جھکا ہوا۔ چوڑا شفّاف ماتھا۔ تیموری ڈاڑھی، چنگیزی ناک، مغلئی ہاڑ۔ لڑکپن تو قلعے کی درو دیوار نے دیکھا ہوگا۔ جوانی دیکھنے والے بھی ٹھنڈا سانس لینے کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ڈھلتا وقت اور بڑھاپا ہمارے سامنے گزرا ہے۔ لٹے ہوئے عیش کی ایک تصویر تھے۔ رنگ روغن اُترا ہوا محمد شاہی کھلونا تھا جس کی کوئی قیمت نہ رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ دِلّی کے آخری تاج دار ظفر کے بھانجے تھے۔ ضرور ہوں گے۔ پوتڑوں کی شاہ زادگی ٹھیکروں میں دم توڑ رہی تھی، لیکن مزاج میں رنگیلا پن وہی تھا۔ جلی ہوئی رسّی کے سارے بل گن لو۔ جب تک جیے پرانی وضع کو لیے ہوئے جیے۔ مرتے مرتے نہ کبوتر بازی چھوٹی، نہ پتنگ بازی۔ مرغے لڑائے یا بلبل، تیراکی کا شغل رہا یا شعبدے بازی کا۔ شطرنج کے بڑے ماہر تھے۔ غائب کھیلتے تھے خدا جانے غدر میں یہ کیوں کر بچ گئے اور جیل کے سامنے والے خونی دروازے نے ان کے سر کی بھینٹ کیوں نہ قبول کی؟ انگریزی عمل داری ہوئی۔ بدامنی کا کوئی اندیشہ نہ رہا تو مراحم خسروانہ کی لہر اُٹھی۔ خاندانِ شاہی کی پرورش کا خیال آیا، پینشنیں مقرر ہوئیں۔ مگر برائے نام۔ ساڑھے تیرہ روپے مرزا چپاتی کے حصّے میں آئے۔ اللہ اللہ کیا زمانے کا انقلاب ہے۔ ایک ذرا سے چکّر میں تقدیر ہزار قدم پیچھے ہٹ گئی۔

لیکن صاحب عالم مرزا فخرالدین عرف مرزا فخرو الملقب بہ مرزا چپاتی نے مردانہ وار زندگی گزاری۔ گھر بار جب کبھی ہوگا، ہوگا۔ ہماری جب سے یاد اللہ ہوئی دم نقد ہی دیکھا۔ قلعے کی گود میں بازیوں کے سوا اور سیکھا ہی کیا تھا جو بگڑے وقت میں آبرو بناتا۔ اپنے والد رحیم الدین حیاؔ سے ایک فقط شاعری ورثے میں ملی تھی پڑھنا لکھنا آتا نہ تھا۔ پھر زبان توتلی مگر حافظہ اس بلا کا تھا کہ سوسو بند کے مسدس ازبر تھے۔ کیا مجال کہ کہیں سے کوئی مصرع بھول جائیں۔ گویا گراموفون تھے کوک دیا اور چلے۔

حاضر دماغ ایسے کہ ایک مرتبہ دہلی کی مشہور ڈیرہ دار طوائف دوتی جان جو ادھیڑ عمر کی عورت ہو چکی تھیں کہیں سامنے سے آتی نظر آئیں۔ انھیں دیکھ کر مرزا کے کسی دوست نے کہا کہ استاد اس وقت دوتی جان پر کوئی پھبتی ہو جائے تو مزہ آجائے۔ بھلا مرزا صاحب کہاں چوکنے والے تھے۔ فوراً بولے ؎

گھستے گھستے ہو گئی اتنی ملٹ
چار پیسے کی دوتی رہ گئی

اسی طرح ایک دن کسی شخص نے مرزا صاحب کے سامنے یہ مصرع پڑھا ع سر عدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب۔ اور اس پر مصرع لگانے کی فرمایش کی۔ مرزا صاحب نے اسی وقت بہترین مصرع لگا کر اس طرح ایک اعلا پایہ کا شعر بنا دیا ؎

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سر عدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب

قلعہ مرحوم کے حالات اور موجودہ تہذیب پر اُن کی نوک جھوک کی جتنی مزہ دیتی تھی، وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھے پتنگ بازی کے دنگلوں میں لے جاتے تھے۔ مُرغ اور بلبلوں کی پالیاں بھی دکھائیں۔ تیراکی کے میلوں میں بھی لے گئے۔ کبوتر بھی مجھے دکھا دکھا کر اُڑائے۔ سب کچھ کیا، میں جہاں تھا وہیں رہا۔ ہر جگہ اُن کا دماغ کھایا۔ انھیں بھی میری خاطر ایسی منظور تھی کہ بادلِ خواستہ یا ناخواستہ وہ سب کچھ مجھے بتاتے۔

ایک دن دوپہر کے کوئی دو بجے ہوں گے۔ برسات کا موسم تھا کئی گھنٹے کی موسلا دھار بارش کے بعد ذرا بادل چھٹے تھے کہ حضرت معمول کے خلاف میرے پاس تشریف لائے۔

مُنہ بنا ہوا۔ آنکھیں اُبلی ہوئی۔ چہرے سے غصّہ ٹپک رہا تھا۔ میں نے کہا خدا خیر کرے آج تو صاحب عالم کے تیور کچھ اور ہیں۔ کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے اور میں ان کا مُنہ تکتا رہا۔ ذرا سانس درست ہوا تو بولے "سیّد! اس پٹھا نچے کا تُرّا مغزا بن بھی دیکھا۔ بڑا افلاطون بنا پھرتا ہے۔ باوا تو جُھک جُھک کر مجرا کرتے کرتے مرگیا، یہ بالو بن کر۔ یا بو کی طرح دُلتیاں جھاڑتا ہے۔ ہے شرط کہ چار جامہ کس دوں، ساری ٹرفش نکل جائے گی۔"

میں : میں بالکل نہیں سمجھا۔ ہوا کیا؟ کون پٹھانچہ؟

مرزا : ایسے ننّھے سمجھے ہی نہیں۔ میاں وہی کالے خاں کا لڑکا جو کچہری میں نوکر ہے۔

میں : منیر۔ کیا اس نے کچھ گستاخی کی؟

مرزا : گستاخی! نہ ہوا ہمارا زمانہ خاندان بھر کو کولھو میں پسوا دیتا۔

میں : بڑا نالائق ہے کیا بات ہوئی؟

مرزا : ہوا یہ کہ میں کبوتروں کا دانہ لینے نکلا گلی کے نکڑ پر بنیے کی دُکان ہے۔ نالیوں میں دھائیں دھائیں پانی بہ رہا تھا۔ ساری گلی میں کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ محلّے والوں نے جا بجا پتھر رکھ دیے تھے کہ آنے جانے والے اِن پر پاؤں رکھ کر گزر جائیں۔ دیکھتا کیا ہوں وہ اکڑے خاں بیچ گلی میں کھڑے ہوئے ایک خوانچے والے سے جھک جھک کر رہے ہیں۔ گلی تنگ، کیچڑ اور پانی، پتھروں پر ان کا قبضہ۔ کوئی بھلا اس پر گزرے تو کہاں سے؟ میں نے کہا کہ میاں راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو۔ یہ کون سی انسانیت ہے کہ سارا راستہ روک رکھا ہے۔ تُرّا کر جواب دیا کہ پیچھے جاؤ۔ مجھے تاؤ آگیا۔ بولا کہ تمہارے سر پر سے جاؤں۔ بس پھر کیا تھا جامے سے باہر نکل پڑا۔ وہ تو پاس پڑوس کے دو چار آدمی نکل آئے اور بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ آج یا وہ نہیں تھا یا میں۔ خیر جاتا کہاں ہے۔ آج کے تھپیے آج ہی نہیں جلا کرتے۔

میں : صاحب عالم۔ آپ اپنی طرف دیکھیے۔ جو ظرف میں ہوتا ہے وہی چھلکتا ہے۔ آنے دیجیے وہ ڈانٹ بتاؤں کہ ہاتھ جوڑتے بنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سُنتا ہے کہ قلعے کے آخری دور ہی میں شہر کی حالت بدل گئی تھی۔ نہ چھوٹوں کا رکھ رکھاؤ رہا تھا نہ

بڑوں کا ادب۔

مرزا : توبہ توبہ تم نے تو دلی کو دم توڑتے بھی نہیں دیکھا۔ اس کا مردہ دیکھا ہے۔ مُردہ۔ وہ بھی لاوارث! میاں شہر آبادی کی باتیں قلعے والوں کے صدقے میں تھیں۔ جیسے جیسے وہ اُٹھتے گئے دلی میں اصلیت کا اندھیرا ہوتا گیا۔ اب تو نئی روشنی ہے نئی باتیں۔ اور تو خدا بخشے دلی کی صفتیں تم کیا جانو۔ پڑھے لکھے ہو۔ شاعری کا بھی شوق ہے۔ بھلا بتاؤ تو سہی اُردو کی کتنی قسمیں ہیں؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا "صاحب عالم اُردو کی قسمیں کیسی؟ یہ بھی ایک کہی۔ مجھ پر بھی داؤ کرنے لگے"۔ "واہ بھئی معلوم ہوا کہ تم دلی والے نہیں۔ کہیں باہر سے آکر بس گئے ہو"۔ میں شرمندہ تھا کہ کیا جواب دوں۔ میرے نزدیک تو صرف ایک ہی قسم کی اُردو تھی۔ زیادہ سے زیادہ عوام و خواص کا فرق سمجھ لو۔ مگر یہ قسمیں کیا معنی؟ مجھے چُپ دیکھ کر مرزا مُسکرائے اور کہنے لگے "سید پریشان نہ ہو۔ مجھ سے سُن اور یاد رکھ۔ بھولیو نہیں پھر پوچھے گا تو نہیں بتاؤں گا"۔ میں بڑے شوق سے متوجہ ہوا اور انھوں نے انگرکھے کے دامن سے مُنہ پونچھ کر کہنا شروع کیا۔ دیکھ اوّل نمبر پر تو اُردوے معلیٰ ہے جس کو ماموں حضرت اور اُن کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے بولتے تھے۔ وہاں سے شہر میں آئی اور قدیم شرفا کے گھروں میں آ چھپی۔ دوسرا نمبر قل اعوذی اُردو کا ہے جو مولویوں، واعظوں اور عالموں کا گلا گھونٹتی رہتی ہے۔ تیسرے خود رنگی اُردو۔ یہ ماں ٹینی باپ کلنگ والوں نے رنگ برنگ کے بچے نکالے ہیں۔ اخبار اور رسالوں میں اِسی قسم کی اُردو ادب کا اچھوتا نمونہ کہلاتا ہے۔ چوتھے ہٹر ذنگی اُردو، مسخروں اور آج کل کے قومی لیڈروں کی مُنہ پھٹ زبان ہے۔ پانچویں لفنگی اُردو ہے جسے آکا بھائیوں کی لٹھ مار، کرخدار کے وار، بولی کہو یا پہلوانوں، کرخن داروں، ضلع جگت کے ماہروں، پھبتی بازوں اور گلیروں کا روزمرہ۔ چھٹے نمبر پر فرنگی اُردو ہے جو تازہ ولایت انگریزہ۔ ہندستانیوں عیسائی ٹوپ لگائے ہوئے کرانی، دفتر کے بابو، چھاونیوں کے سوداگر وغیر بولتے ہیں۔ پھر ایک سربھنگی اُردو ہے یعنی چرسیوں، بھنگڑوں بینواؤں اور تکیے داروں کی زبان"۔ میں نے کہا آج تو بہرہ کُھلا ہوا ہے۔ بھئی خوب تقسیم ہے کیوں نہ ہو آخر شاہ جہانی

دیگ کی کھرچن ہے۔ میری طرف دیکھ کر ایک گہرا ٹھنڈا سانس بھرا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگے "سیّد! ابھی تم نے کیا دیکھا ہے اور کیا سُنا ہے۔ قلعہ آباد ہوتا، دربار دیکھے ہوتے تو اصلی زبان کا بناو سنگار نظر آتا۔ اب تو ہماری زبان بیسنی ہو گئی ہے۔ وہ چلبلی چوچلے کی باتیں، شریفوں کے انداز، امیروں کی آن، سپاہیوں کی اکڑفوں، وہ خادمانہ اور خوردانہ آداب وانکسار، شاعروں کے لچھے دار فقرے، شہر والوں کا میل جول، پرانے گھرانوں کے رسم و رواج، وہ مروت وہ آنکھ کا لحاظ کہاں؟ مجلسوں محفلوں کا رنگ بدل گیا، میلے ٹھیلے، پرانے کرتب، اگلے ہنر سب مٹتے جاتے ہیں۔ اشراف گردی نے بھلے مانسوں کو گھر بٹھا دیا۔ فیل نشین، پالکیوں میں بیٹھنے والے کھپریلوں میں پڑے ہوئے ہیں، مفلسی، ناداری نے رذالوں کے آگے سر جھکوا دیے۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھ گئی، کم ظرفوں، ٹینیوں کے گھر میں دولت پھٹ پڑی۔ زمانہ جب کمینوں کی پشتی پر ہو تو خاندانیوں کی کون قدر کرتا؟ پیٹ کی مار نے صورتیں بگاڑ دیں، چال چلن میں فرق آ گیا۔ ہمّت کے ساتھ حمیّت بھی جاتی رہی۔

مرزا نے یہ تقریر کچھ ایسے عبرت خیز لفظوں میں کی کہ میرا دل بھر آیا اور میں نے گفتگو کا پہلو بدلنے کی کوشش کی۔

میں : کیوں حضرت، غدر سے پہلے دلّی والوں کا لباس کیا تھا؟ دو چار پرانی وضع کے لوگ دیکھنے میں آتے ہیں، اُن کی برزخ تو کچھ عجیب ہی سی معلوم ہوتی تھی۔

مرزا : جھوٹے ہو تم نے کہاں دیکھا ہو گا۔ کوئی بہروپیا یا نقّال نظر آ گیا ہو گا۔ میاں اُن وقتوں میں ادنا اعلا میں یک رنگی نہ تھی ...... درباری اور بازاری لوگ لباس سے پہچانے جاتے تھے۔ عام طور پر اپنی شکل وشباہت، تن و توش، جسامت اور پیشے کے مطابق کپڑا پہنا جاتا تھا تاکہ دُور سے دیکھ کر پہچان لیں کہ کس خاندان کا اور کیسا آدمی ہے؟ اگر نوجوان ہے تو ایک ایک ٹانکے پر جوانی برستی ہے۔ بوڑھا ہے تو پیری اور سادگی ٹپکتی ہے۔ بانکوں کا بانک پن، چھیلاؤں، ملّاؤں کی ملّائی، پہلوانوں کی پہلوانی، رذالوں کی رذالت اور شریفوں کی شرافت لباس سے صاف بھانپ لی جاتی تھی۔ چھوٹے آدمی جس

پوشاک کو اختیار کر لیتے تھے، پہلے مالنس چھوڑ دیتے۔ دو پلڑی ٹوپیوں کا عام رواج تھا مگر چوگوشی، پچ گوشی، گول، مغلئی، تاج دار ٹوپیاں، مغل بچے اور شریف زادے پہنتے تھے۔ قلعے کے آنے جانے والوں میں مندیلیں، بنارسی دوپٹے، گوٹے دار پگڑیاں۔ مسلمانوں کا حصّہ تھا۔ درباری جامہ بھی پہنا کرتے تھے۔ اُمرا جیغہ سرپیچ اور شہزادوں میں کلغیاں بھی مروّج تھیں۔ ہندوؤں میں پہلے جامے کا زیادہ دستور تھا پھر نیم جامہ اور اُلٹی چولی کے انگرکھے پہننے لگے۔ علاوہ ازیں الخالق، اچکن، قبا، عبا، جُبّہ، چغہ، مرزئی وغیرہ بھی استعمال ہوتے تھے۔ پاپجامے یا تو تنگ موری کے یا اِک برے یا غرارے دار ہوتے تھے۔ ڈاڑھی مونچھوں کی وضع بھی ہر خاندان اور ہر پیشہ ور کی علاحدہ تھی۔ آج کی طرح نہیں کہ کوٹ پتلون نے تمیز ہی اُڑا دی۔ دوسروں کی پوشاک پہننے میں کوئی شرماتا ہی نہیں۔ علی گڑھ والوں کو شیروانی اور دو تکیوں کے غلاف والا پاپجامہ پہنتے دیکھا، اس کی نقل کر لی۔ پنجابی آئے تو اُن کی شلواریں اُڑا لیں۔ مونچھوں کی جگہ بھوپال لیے۔ ڈاڑھی کبھی چوپخ دار ہے تو کبھی صفاچٹ اور تھوڑے دن سے تو "ڈاڑھی کو مُنڈا ڈال تو مونچھوں کا بکھیڑا" سنتے آئے تھے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ہندو مسلمان کی پہچان تو ایک طرف، مردوں پر عورتوں کا دھوکا ہونے لگا ہے۔ اور کہاں تک سُناؤں۔ بس یہ سمجھ لو کہ دلّی کا نقشا ہی بدل گیا۔

میں : مگر یہاں والوں کو فضول کھیلوں، دولت کو لٹانے والی بازیوں اور بے کار مشغلوں کے سوا کام ہی نہ تھا۔

مرزا : تم کیا جانو کہ وہ بازیاں اور اُن کے مشغلے کیسے کمال کے تھے۔ ویسے ہُنر آج کوئی نہیں پیدا کر لینا۔ زہرہ پھٹ جائے زہرہ۔ بات یہ ہے کہ ساری چیزیں وقت سے ہوتی ہیں۔ نامردوں کا زمانہ ہے تو نامردوں کی سی باتیں بھی ہیں۔ شریفوں کا شغل ڈنڑ، مگدر، بانک، بنوٹ، پھکیتی۔ اکنگ، تیر اندازی، نیزہ بازی پنجہ کشی تھا۔ کہ دو بے کار تھا۔ تیراکی، کشتی، شکرے اور باز کا شکار، پتنگ لڑانا، کبوتر بازی وغیرہ سے دلچسپی تھی۔ کہ دو یہ بھی فضولیات ہیں۔

میں : فضولیات نہیں تو اور کیا ہیں۔

مرزا : جی ہاں فضولیات ہیں۔ خُدا کے بندے ان ہی باتوں سے تو دِلّی دِلّی تھی۔ ورنہ شاہجہاں کی بسائی ہوئی محمد شاہی دِلّی اور خورجہ بلند شہر میں کیا فرق۔ پھکیت اور بنوپٹے ایسے ہوتے تھے کہ موقع پڑتا تو رومال میں صرف پیسا یا ٹھیکری باندھ کر حریف کے سامنے آجاتے اور دو جھکائیوں میں ہتھیار چھین لیتے۔ تیراکی کا یہ حال تھا کہ پالتی مارے ہوئے پانی پر بیٹھے ہیں جیسے مسند پر۔ ایک زانو پر پیچوان لگا ہوا ہے، دوسرے پر رنڈی بیٹھی ہے۔ دُھواں اُڑاتے اور ملہار سنتے چلے جاتے ہیں۔ قلعے کی حمام والی نہر تو دیکھی ہوگی۔ گز سوا گز کا پاٹ ہے اور بالشت بھر سے زیادہ گہرائی نہیں۔ اس میں آج کوئی مائی کا لال تیر کر دکھائے تو میں جانوں۔ میر مچھلی تو خیر اُستاد تھے، ان کا سا کمال تو کسے میسر ہے۔ دو چار گز تو اتنے پانی میں تیر کر میں بھی دکھا سکتا ہوں۔

میں : اجی جناب آپ رہنے پر نیریے۔ جبالوں پر کھڑی لگا بیئے نتیجہ؟ کھیل ہی تو تھے۔ پھر یہ کبوتر بازی، پتنگ بازی، مُرغ بازی، مینڈھے بازی کیا بلا تھی؟ بچارے بے زبانوں کو لہولہان کرنا اور اپنا دل بہلانا کیا اچھے ہنر تھے۔

مرزا : ارے میاں ایرانی تورانی منچلے دہم ہو کر کیا چوڑیاں پہن لیتے۔ جنگ و جدال کا خیال انسانی قربانیوں، ملک ستانیوں کے چاؤ۔ خون کی پچکاریوں سے ہولی کا وقت تو لد گیا تھا۔ نہ ان پر کوئی چڑھ کر آتا تھا نہ یہ کہیں چڑھائی کرتے تھے۔ انگریزی عمل داری کی برکت سے نکسیریں بھی نہیں پھوٹتی تھیں۔ وہ جانوروں کو ہی لڑا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔ بس کچھ اور کہنے والا تھا کہ مرزا نے ایک جھرجھری لی اور یہ کہتے ہوئے کہ بھئی غضب ہو گیا شام ہونے آئی۔ کبوتر بھوکے میری جان کو رو رہے ہوں گے اور چوک کا وقت بھی آ لگا ہے۔ لال بند کا جوڑا لگانا ہے، یہ جا وہ جا۔

ان باتوں کو کوئی ایک مہینا گزرا ہوگا کہ صبح ہی صبح مرزا صاحب چلے آتے ہیں۔

آتے ہی فرمانے لگے "پرانی عیدگاہ چلنا ہوگا میں نے کہا "خیریت؟" "بولے لکھنؤوں سے پیچ ہیں۔ جالوں ڈھیری یا مالوں ڈھیری۔ پانچ روپے پینچ ٹھہرا ہے بڑا معرکہ ہوگا" میں نے عرض کیا "صاحب عالم مجھے نہ تو پتنگ بازی سے کوئی دل چسپی ہے نہ میرے پاس اتنا فضول وقت ہے کہ آپ کے ساتھ واہی تباہی پھروں"۔ تاؤ کھا کر آنکھیں نکال لیں اور حاکمانہ انداز سے کہنے لگے "تمہاری اور تمہارے وقت کی ایسی تیسی۔ بس کہہ دیا کہ چلنا ہوگا۔ دوپہر کو آؤں گا تیار رہنا" میں بہت پریشان ہوا مگر کرتا کیا، دوستی تھی یا مذاق۔ قہر درویش بجانِ درویش۔ اپنی ساری ضرورتوں کو طاق پر رکھا اور حضرت مرزا چپاتی کا منتظر تھا کہ ٹھیک بارہ بجے آواز پڑی "سیّد آؤ"۔ آگے آگے مرزا صاحب اور پیچھے پیچھے میں۔ اجمیری دروازے سے نکل قبرستان لانگتے پھلانگتے پرانی عیدگاہ پہنچے۔ وہاں دیکھا تو خاصا میلا لگا ہوا ہے۔ کبابی، کچالو والے، دہی بڑوں کی چاٹ، پان بیڑی، پانی پلانے والے سقے پوری خرافات موجود ہے۔ جا بجا پتنگ بازوں کی ٹکڑیاں بیٹھی ہیں مرزا صاحب کو دیکھتے ہی "صاحب عالم ادھر" "مرزا صاحب ادھر" "اُستاد پہلے میری سن لیجیے" میاں ادھر آنے دو۔ بات سمجھتے ہیں نہ بات کی دُم اُڑنے سے کام۔ حضرت آپ یہاں آئیے، میر کنکیا آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں"۔ چاروں طرف سے آوازیں پڑنے لگیں، مرزا چو کنّے ایک ایک کو جواب دیتے شامیانے کے نیچے جہاں میر کنکیا تشریف فرما تھے، پہنچے۔

میر کنکیا لکھنؤ کے واجد علی شاہی پتنگ باز تھے۔ کاکریزی رنگ، گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑی ناک، دانتوں میں کھڑکیاں، سر پر کڑ بڑے پٹھے۔ خشخاشی ڈاڑھی، چھالی کھلا سنجاف دار ڈھیلا ڈھالا انگرکھا، سر پر دو انگل کی کلابتّو کے حاشیے کی ٹوپی، پاؤں میں مخملی گرگابی، کلّے میں گلوری، اُٹھ کر مرزا چپاتی سے بغل گیر ہوئے۔ پھر جو پتنگ بازی کا ذکر شروع ہوا تو تین بج گئے۔ میں بے وقوفوں کی طرح بیٹھا ہوا ایک ایک کا مُنہ تک رہا تھا۔ پتنگ بازی کی ہوتی تو اُن کی اصطلاحیں سمجھ میں آتیں۔ آخر خدا خدا کر کے لوگ اپنی اپنی ٹکڑیوں میں گئے۔ آسمان پر چیل کوّے منڈلانے شروع ہوئے۔ میں مرزا صاحب کے ساتھ تھا۔ عیدگاہ کی دیوار کے نیچے سے اُنھوں نے بھی اپنا اختر کھول کر ایک انگارا ادھا اُڑایا۔ نچکا ایک لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ کوئی دس منٹ تک جھکائیاں دیتے رہے، پینچ ہوا۔ کبھی آگے بڑھتے تھے کبھی پیچھے ہٹتے تھے۔ ایک دفعہ

ہی جھلا کر لڑکے کو تماچا رسید کیا اور بولے "ابے اچکا پکڑنے کی سُرت بھی نہ تھی تو یہاں آن کیوں مرا آخر کٹوا دیا نا۔"

پھر ایک الفن بڑھائی اور اب کے اچکا پکڑنے کی خدمت مجھے انجام دینی پڑی۔ بدقسمتی سے یہ گڈی بھی کٹ گئی۔ بہت بگڑے کہ بس جب تم جیسے منحوس ساتھ ہوں تو ہم اُڑا چکے۔ غضب ہے سالوں لیا ہمیں اُستاد کہنے والا، میر گولنداز ہمارے ہاں کے شاگرد، شیخ پیچک جیسے برابر پیچ نکالے جاتے ہیں اور مرزا فخرد اوپر نیچے دو کنکوتے کٹوائے۔ سیمٹو میاں سیمٹو مجھے اپنی استادی کھوڑی گنوائی ہے۔" وہ کہتے رہے، میں تو وہاں سے ہٹ کر رومال بچھا کر الگ جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی اپنا اسبابِ جہالت لنگی میں باندھے میرے پاس آبیٹھے۔ تیوری پر بل تھے، چہرہ سُرخ آنکھیں اُبلی ہوئی۔ میں نے کہا مرزا صاحب ہوا کا کھیل ہے۔ اس میں کسی کی کیا پیری۔ آپ کی اُستادی میں کہیں فرق آتا ہے سلطنت ہی جب ہتھے پر سے کٹ گئی تو ان دو کاغذ کے ٹکڑوں کا کیا غم! آپ، آپ ہی ہیں۔ کہنے لگے "سچ کہتے ہو۔ میاں ہم قلعے والوں کی تقدیر ہی خراب ہے۔ ہوا بھی موافقت نہیں کرتی۔ میں نے اُن کے بشرے سے اُن کی دلی تکلیف کا اندازہ کرتے ہوئے اس ذکر کو موقوف کردیا۔ اور پوچھا "کیوں مرزا صاحب قلعہ جب آباد تھا اس وقت بھی پتنگ بازی کے ایسے ہی دنگل ہوتے تھے؟"

مرزا : اِک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔ اس وقت کا سماں کیوں کر دکھاؤں۔ میاں ہر بات میں اک شان تھی، ایک قاعدہ تھا اور ہزاروں غریبوں کی روٹیوں کے سہارے۔ معمول تھا کہ عصر کا وقت ہوا اور سلیم گڑھ پر جمگھٹ لگا۔ بڑے بڑے پتنگ، دوتادی اور سہ تادی تکلیں، ڈور کی چرخیاں لے کر شاہی پتنگ باز پہنچ گئے، خلوت کے امیر اور شوقین شہزادے مرزا ننو، مرزا کدال، مرزا کالیٹن، مرزا چڑیا، مرزا جھرجھری بھی آ موجود ہوئے۔ یہ سلاطین زادے بہت منہ چڑھے تھے۔

میں : (بات کاٹ کر) حقت یہ نام کیسے؟ کیا اسی بولی کا نام اُردوئے معلّیٰ ہے۔

مرزا : کچھ پڑھا لکھا بھی، یا گھاس ہی کھودتے رہے ہو۔ ارے زبان کی ٹکسال قلعے ہی میں تو تھی، وہاں محاورات نہ ڈھلتے تو کہاں ڈھلتے۔ طبیعتیں ہر وقت حاضر رہتی

تھیں۔ ہر بات میں جدّت مدِّ نظر تھی۔ ہنسی مذاق میں جو منہ سے نکل گیا گویا سکّہ ڈھل گیا۔ کسی کے پھٹے پھٹے دیدے ہوئے مرزا بٹّو کہ دیا۔ لمبا چہرہ اچگی ڈاڑھی دیکھی، مرزا اُچکّا یا مرزا کدال کہنے لگے۔ چکلے چہرے والے پر چوپال کی اور ٹھگنے پر گھٹنے کی پھبتی اُڑا دی۔ غرض کہ مرزا چیل، مرزا جھپٹ، مرزا یاہو، مرزا رنگیلے، مرزا رسیلے بیسوں اسم بامسمیٰ تھے۔ میں جمعرات کو چپاتیاں اور حلوا بانٹا کرتا تھا میرا نام مرزا چپاتی مشہور کر دیا۔

میں : بیجے ہمیں آج تک مرزا چپاتی کی وجہ تسمیہ ہی معلوم نہ تھی۔ یہ آپ کا خیر سے ٹکسالی نام ہے۔

مرزا : اب زیادہ نہ اِتراؤ۔ قصّہ سننے ہو یا کوئی پھبتی سننے کو جی چاہتا ہے۔

میں : اچھّا اب کان پکڑتا ہوں بیچ میں نہیں بولوں گا۔ فرمایئے۔

مرزا : سب سامان لیس ہو گیا تو بڑے حضرت کی سواری آئی۔ دعا سلام مجرے کے بعد حکم سے کر دریا کی طرف پتنگ بڑھایا گیا۔ دوسری جانب سے معین الملک نظارت خاں بادشاہی ناظر کا، مرزا یاور بخت بہادر یا جس کے لیے پہلے سے ارشاد ہو چکا ہے، پتنگ اٹھا۔ ریتی میں سوار کھڑے ہو گئے۔ پینچ لڑے، ڈھیلیں چلیں۔ پتنگ یا تکلیں جھپکتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ یا ہاتھ روک کر ڈور دی تو ڈوبتے آسمان سے جا لگیں۔ پیٹا چھوڑ دیا، ڈوریں زمین تک لٹک آئیں، سواروں نے دو شاخے بانسوں پر لے لیں۔ پتنگ کٹا تو دریا کے وار پار ڈور پڑ گئی۔ ڈوریں لٹیں، پتنگ کے پیچھے پیچھے غول کے غول شاہدرہ تک نکل گئے۔ جس نے وہ تکل یا پتنگ لوٹی پانچ روپے کی مزدوری کی۔ ڈور بھی بیس بیس تیس تیس روپے سیر بک جاتی تھی۔ بادشاہ کبھی تو خالی سیر ہی دیکھتے رہتے۔ کبھی جی میں آتا تو تختِ رواں سے اُتر پڑتے۔ مچھلی کے چھلکوں کے دستانے پہن لیے۔ پتنگ ہاتھ میں لیا ایک آدھ پینچ لڑایا اور ہنستے بولتے محل معلّیٰ میں داخل ہو گئے۔ سیّد! یہ بھی خبر ہے کہ وہ پتنگ یا تکلیں کتنی بڑی اور کیسی محنت سے بنائی ہوئی ہوتی تھیں؛ تکلیں تو تمھارے پیدا ہونے سے پہلے مر چکیں۔

خیر میں کبھی ان کی تصویر دکھاؤں گا۔ تو وہ قدِ آدم ہوتی تھی اور ایک ایک کی تیاری میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ ڈوریں بھی اِک بلی، دو بلی، تبلی، چوبلی کنکوّوں اور تکلوں کے زور کے موافق بنتی تھیں۔ مانجھوں کے نسخے بھی ہر گھرانے کے الگ تھے۔ تکلیں تو تکلیں آج ویسے پتنگ بھی نہ بنتے ہیں نہ کسی میں اتنا بوتا ہوتا ہے کہ اُن کی جھونک سنبھال سکے۔ چھوٹی تخیں رہ گئی ہیں یا بڑے نامی پتنگ بازوں کے ہاں اڈّھے۔ وہ بھی کنکوّے نہیں گڈّیاں ہوتی ہیں۔ لنڈوری بن پچھلّے کی۔

میں : بھئی واقعی لُطف تو بڑا آتا ہوگا۔

مرزا : جہاں اپنی حکومت، گھر کی بادشاہت اور پرانی دولت ہوتی ہے، یہی رنگ ہوا کرتے ہیں۔ عشرت گاہوں میں ہر وقت نمازیں نہیں پڑھی جاتیں۔ مجاہدے اور مراقبے نہیں ہوتے۔ یہ نہ اٹھائیں تو زندگی کی راحتیں کون اٹھائے۔ دنیا میں ہمیشہ یہی ہونا رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ سلطنتوں کی بھی عمریں ہوتی ہیں۔ جس طرح آدمی کوئی بیٹھ ہیں، کوئی پیدا ہوتے ہی، کوئی بچپن میں، کوئی جوان ہوکر، اور کوئی عمر طبعی طے کرنے کے بعد مرتا ہے، اسی طرح بادشاہتیں ہیں۔ کوئی ایک پُشت چلتی ہے، کوئی دو پُشت۔ کسی کا سلسلہ سو پچاس ہی برس میں ٹوٹ جاتا ہے اور کسی کی عمارت صدیوں کی خبر لاتی ہے۔ مغلوں نے چھ سو برس تخت کو سنبھالا۔ آخر بڑھاپا تو سب ہی کو آتا ہے۔ اُن کے کندھے بھی شل ہوگئے۔ دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔ آج اس کا تو کل اس کا زمانہ ہے۔ موت اور زوال بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ ہمارے لیے عیش و عشرت ہی بہانہ ہوگئی۔

میں سمجھتا تھا کہ مرزا نرے شہزادے ہیں اور ان کی معلومات میں بازیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آج معلوم ہوا کہ قلعے والوں کا دماغ بگڑی میں بھی کتنا بنا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "مرزا صاحب! یہ آپ نے کس فلسفی کا لکچر یاد کرلیا ہے۔ دو چار جملوں میں کیسے کیسے نکتے حل کرگئے۔" بولے۔ "پیارے

ہمارے احوال پر نہ جاؤ۔ جان کر دیوانے بنے ہوئے ہیں۔ نہیں تو کیا نہیں جانتے کیا نہیں آتا ؎

عالم میں اب تلک بھی مذکور ہے ہمارا
افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا

گنجے نہاری والے

آہ دلّی مرحوم جب زندہ تھی اور اس کی جوانی کا عالم تھا سہاگ بنا ہوا تھا، اس پر کیا جوبن ہوگا۔ اب تو نہ وہ رہی نہ اس کے دیکھنے والے رہے ہے۔ کلّو بخشو کے تکیے میں سوتے ہیں۔ اگلی کہانیاں کہنے والا تو کیا کوئی سننے والا بھی نہیں رہا۔ غدر نے ایسی بساط اُلٹی کہ سارے مُہرے تتر بتر ہو گئے۔ دِلّی کا نقشا بگڑ گیا۔ آن گئی۔ زبان دِلوائی ہنڈیا ہوئی۔ لباس بدلا، معاشرت کے ڈھنگ بدلے، پرانے رسم و رواج اور پرانی لکیروں کو نئی تعلیم نے مٹا دیا۔ قدیم ہنرمند در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگے۔ اہلِ کمال، کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی" ہو گئے۔ شریفوں نے گوشہ نشینی اختیار کی۔ لوٹ کیا مچی کہ سب کچھ لٹ گیا کہنے کو وہی شہر ہے، وہی بازار، وہی گلی کوچے، لیکن وہ زندگی کہاں؛ نہ وہ آدمی، نہ وہ باتیں، نہ وہ اپنی دلّی، نہ وہ اپنا تمدّن۔

زندگی نام ہے زندہ دلی کا۔ زندہ دلی نہیں تو زندگی کے کیا معنی؛ ہماری نئی تانتی کا دعوا ہے کہ وہ جمود کا زمانہ تھا، یہ حرکت کی دُنیا ہے۔ وہ تنزّل کی آخری منزل تھی، اب ترقی کا دور ہے۔ جو چاہے سو کہیں لیکن ہم تو یہی کہیں گے اور برابر کہے جائیں گے کہ ہمیں ہنسوں کی چال راس نہیں۔ گرم مُلک میں ٹھنڈی ہواؤں سے لقوہ مار جاتا ہے۔ پرائے شگون میں ناک بغیر کٹے کیا مجال ہے کہ رہے۔ قلعہ اجڑنے اور بہادر شاہی ٹینٹ اکھڑ جانے کے بعد آج سے پینتیس چالیس برس پہلے تک جیسے خوشحال دلّی والے جیتے تھے آج نہیں جی سکتے۔ شادی بیاہ، مرنے جینے کے سوا اتنی فضول خرچیاں

اور فیشن پرستیاں نہ تھیں۔ پھر اپنے ملک کی دولت اپنے بھائیوں کی کمائی اپنے ہی گھروں میں رہتی تھی۔ صرف روپیا مہنگا تھا اور ہر چیز سستی۔ ایک روپے کے بتّیس ٹکے اور ایک ٹکے کی ایک سو ساٹھ کوڑیاں دو کوڑی کا دام اور چار گنڈے کا چھدام۔ دام اور چھدام میں نون مرچ، ساگ پات خریدا جا سکتا تھا۔ کرکمینوں کی عموماً تنخواہیں نہ تھیں۔ شادی بیاہ تیج تہوار کی آس میں خدمتیں کرتے تھے اور مگن رہتے تھے۔ آج روپیا جتنا سستا ہے اتنی ہی زندگی گراں ہے اور بات فقط اتنی ہے کہ غیر ملکوں سے لین دین ہو گیا ہے۔ شرح تبادلہ اپنے ہاتھوں میں نہیں۔ بٹّا لگتے لگتے کھک ہو کر رہ گئے۔

شہر اُجلا ضرور ہو گیا ہے۔ بازار بجلی کے ہنڈوں سے جگ مگ کرتے نظر آتے ہیں مگر اصلیت کا اندھیر ہے۔ جھوٹا جھول چڑھا ہوا ہے۔ اجناس ہیں تو اجنبی، بولیاں ہیں تو بِسنی، مخلوق ہے تو بیچ رنگی۔ لباس دیکھو تو بھان متی کا تماشا۔ یہ دِلّی ہماری دِلّی تو رہی نہیں خاصا تھیٹر ہے۔ جب سے اس بوڑھی گھوڑی کو لال لگام کا شوق ہوا، ماں ٹیبنی باپ کلنگ بچّے نکلے رنگ برنگ والی مثل صادق آگئی۔ ٹھیٹ ہندستانی مذاق ہی نہ رہا۔ پہننے اوڑھنے کے ساتھ کھانے پینے کی ترکیبوں میں بھی فرق آگیا۔ شہر میں چپّے چپّے پر یہ ہوٹل کہاں تھے۔ بازاروں میں بیٹھ کر یوں کھلم کھلّا کون کھاتا تھا؟ گلیوں میں بھٹیاروں کی دُکانیں تھیں یا نان بائی تھے۔ یا شہر کے خاندانی باورچی جو شادی غمی کی پخت کرتے تھے۔ بھٹیارے غریبوں، مزدوروں اور کم استطاعت مسافروں کا دو تین پیسے میں پیٹ بھر دیتے تھے۔ نان بائیوں کے ہاں شیرمال، باقر خانی، کلچے اور خمیری روٹیاں پکتی تھیں لیکن چونکہ ان کا کام تیس دن کا نہ تھا اس لیے جاڑے بھر یہ نہاری کی دکان بھی لگاتے تھے۔

نہاری کیا تھی بارہ مسالے کی چاٹ ہوتی تھی۔ امیر سے امیر اور غریب سے غریب اس کا عاشق تھا۔ نہاری اب بھی ہوتی ہے اور آج بھی دِلّی کے سوا کہیں اس کا رواج ہے نہ اس کی تیاری کا کسی کو سلیقہ۔ دِلّی کا ہر بھٹیارا نہاری پکانے لگا، ہر نان بائی نہاری والا بن بیٹھا۔ مگر نہ وہ ترکیب یاد ہے نہ وہ ہاتھ میں لذت۔ کھانے والے نہ رہیں تو پکانے والے کہاں سے آئیں۔ سُنا ہے کہ جب سعادت خاں نے جمنا کی شاہ جہانی نہر

کو جو جابجا سے اُٹ کر خشک ہو چکی تھی دوبارہ شہر میں جاری کیا ہے تو علوی خان حکیم نے
ماتمی لباس پہن لیا تھا۔ محمد شاہ نے اس غم و افسوس کا سبب دریافت کیا تو کہا مجھے دِلّی
والوں کی تندرستی کا رونا ہے۔ اب یہ بیماریوں کا گھر ہو جائے گی۔ علاج پوچھا تو بتایا
کہ اگر لال مرچیں اور کھٹائی کا استعمال زیادہ کیا جائے تو شاید بچ سکیں۔ چنانچہ ہر گھر
میں مرچوں کی بھرمار ہو گئی اور آج تک دلّی کے قدیم گھرانوں مرچیں زیادہ کھائی جاتی
ہیں۔ چونکہ مرچوں کا دف گھی سے مرتا ہے اِس لیے جب تک گھی خالص اور سستا رہا مسالے
دار کھانوں سے کوئی نقصان نہ پہنچا۔

نہاری کا نام سن کر باہر والے لوٹ جاتے ہیں۔ ملنے والوں سے نہاری کی
فرمائش ہوتی رہی ہے۔ اب اگر میزبان سلیقے مند ہے تو خیر ورنہ کھانے والوں کو منہ پیٹنا
پڑتا ہے۔ چار آنے کی نہاری میں آٹھ آنے کا گھی کون ڈالے۔ پھر آج کل والے یہ
بھی نہیں جانتے کہ نہاری کے بعد تر تراتے حلوے یا گاجر کی تری سے مسالوں کی گرمی
کو مارا جاتا ہے۔ اس لیے نہاری بدنام ہو گئی ہے۔ اس کے سوا نہاری بیچنے والوں کو
بھی تمیز نہیں رہی۔ ایرے غیرے نتھو خیرے نہاری کی دُکانیں لے بیٹھے ہیں۔ پہلے
گنتی کے نہاری والے تھے۔ ایک چاندنی چوک میں۔ ایک لال کنوئیں پر۔ ایک حبش خاں
کے پھاٹک میں اور ایک چتلی قبر اور مٹیا محل کے درمیان۔ ان میں سے ہر ایک شہر
کا ایک ایک کونا دبائے ہوئے تھا۔ سب سے زیادہ مشہور گنجے نہاری والے کی دُکان
تھی جو گھنٹہ گھر کے پاس قابل عطار کے کوچے اور سیدانیوں کی گلی کے بیچ میں بیٹھتا تھا۔
جب تک یہ زندہ رہا نہاری اپنے اصلی معنوں میں نہاری رہی۔ یہ کیا مرا کہ نہاری کا مزہ ہی
مر گیا۔ نہاری کیا کھاتے ہیں کلیجا جلاتے ہیں۔

یہ دُکان ہم نے دیکھی ہے، بلکہ وہاں جا کر نہاری بھی کھائی ہے۔ شوقین دُور دُور
سے پہنچتے تھے۔ گرم گرم روٹی اور تُرت دیگ سے نکلی ہوئی نہاری۔ جتنی نلیاں چاہیں
جھڑوائیں۔ بھیجا ڈلوایا۔ پیاز سے کڑکڑاتا ہوا گھی، بلوم کی بے ریشہ بوٹیاں۔ ادرک کا لچھا۔
کتری ہوئی ہری مرچوں کی ہوائی اور کھٹے کی پھٹکار۔ سبحان اللہ نواب رام پور کا پورا
دسترخوان صدقے تھا۔ گھروں میں اس سامان کے لیے پورے اہتمام کی ضرورت ہے۔
اس لیے جو اصل میں نہاری کا لطف اٹھانا چاہتے تھے، انھیں دُکان ہی پر جانا پڑتا

تھا۔ شہر کے نہاری بازوں کی آج بھی نہاری والوں کے ہاں بھیڑ لگی رہتی ہے۔ صبح سے دس بجے تک تانتا نہیں ٹوٹتا، تو اس کا ذکر ہی کیا خصوصاً گنجے کی دُکان پر۔ سورج نکلا نہیں کہ لوگوں کی آمد شروع ہوگئی۔ دس اندر بیٹھے کھا رہے ہیں تو بیس پیالے، کٹورے بادیے، پتیلیاں لیے کھڑے ہیں۔ ایک پیسے سے لے کر دو روپے کے گاہک ہوتے تھے۔ لیکن مجال ہے کوئی ناراض ہو یا کسی کو اُس کی مرضی کے مطابق نہ ملے۔ زیادہ سے زیادہ نو بجے دیگ صاف ہوجاتی تھی۔ اُجلے پوشوں کے لیے بالاخانے پر انتظام تھا جہاں سب طرح کی آسانیاں تھیں۔

یہ دکان دار گنجے نہاری والے ہی کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی آن کا کیا کہنا۔ سُنا ہے کہ چھنّا مل والے دہلی کے رئیس اعظم اس کی دُکان کو خریدنا چاہتے تھے۔ ہزار کوششیں کیں۔ روپے کا لالچ دیا۔ جایداد کی قیمت دُگنی اور چوگنی لگادی، یہاں تک کہ دُکان میں اشرفیاں بچھا دینے کو کہا۔ دوسرا ہوتا تو آنکھیں بند کرلیتا۔ وہیں کہیں قابل عطّار کے کوچے میں، بلّی ماروں میں یا لال کنواں کے کوچے میں جا بیٹھتا۔ لیکن میاں گنجے مرتے دم تک اپنی اسی آن سے وہیں بیٹھے رہے۔

ہم پانچ چار دوست پیٹ بھر کر نہاری کے شوقین تھے۔ جاڑا آیا اور نہاری کا پروگرام بنا۔ یوں تو اتوار کے اتوار باری باری سے کسی نہ کسی کے گھر پر نہاری اُڑا ہی کرتی تھی لیکن ہر پندرھویں دن اور اگر کوئی باہر کا مہمان آگیا تو اُس معمول کے علاوہ بھی خاص دُکان پر جاکر ضرور کھالیا کرتے تھے۔ ہمارا دستور تھا۔ ہم پر کیا منحصر ہے نہاری بازوں کے یہ بندھے ہوئے قاعدے ہیں کہ صبح کے لیے رات سے تیاری ہوتی تھی۔ تازہ خالص گھی دو چھٹانک فی کس کے حساب سے مہیا کیا جاتا تھا۔ گاجر کا حلوا حبش خاں کے پھاٹک یا جمال الدین عطّار سے لیتے تھے۔ اور تو کیا کہوں اب ویسا حلوا بھی کھانے میں نہیں آتا۔ گندے نالے کی پھکسی ہوئی نیلی سفید، پھیکی سیٹھی، کچی یا اتری ہوئی گاجروں کی گلتھی ہوتی ہے۔ اب اور کیا تعریف کروں۔ خیر! صبح ہوئی، موذن نے اذان دی اور نہاری نے پیٹ میں گدگدیاں کیں۔ ہمارے دوستوں میں خدا بخشے ایک سید پونیے تھے۔ بڑے زندہ دل، یاروں کے یار، نہایت خدمتی۔ یہ اُن کی ڈیوٹی ہوتی تھی کہ اندھیرے سے اُٹھ کر ایک ایک دوست کے دروازے کی

گنڈی پیٹیں، گالیاں کھائیں، کوسنے سنیں اور ایک جگہ سب کو جمع کر دیں۔ سامان اسی غریب پر لادا جاتا۔

جب تک ہماری یہ ٹولی زندہ سلامت رہی اور میاں گنجے صاحب نیچی باڑ کی مسلی مسلائی لیس دار ٹوپی سے اپنا گنج ڈھانکے چھینٹ کی روئی دار کمری کی آستینوں کے چاک اُلٹے۔ رفیدہ سے چہرے پر لہسنیا ڈاڑھی لگائے، آلتی پالتی مارے، چمچہ لیے دیگ کے سامنے گدّی پر دکھائی دیتے رہے، نہ ہمارا یہ معمول ٹوٹا اور نہ نہاری کی چاٹ چھوٹی۔ دو چار مرتبہ کی تو کہتا نہیں ورنہ عموماً ہم اتنے سویرے پہنچ جاتے تھے کہ گاہک تو گاہک دُکان بھی پوری طرح نہیں جمنے پاتی تھی۔ کئی دفعہ تو تنور ہمارے پہنچنے پر گرم ہونا شروع ہوا اور دیگ میں پہلا چمچہ ہمارے لیے پڑا۔ دُکان کے سارے آدمی ہمیں جان گئے تھے اور میاں گنجے کو بھی ہم سے ایک خاص دلچسپی ہو گئی تھی۔ تین چار موقعوں پر اُس نے خصوصیت کے ساتھ ہمارے باہر والے احباب کی دعوت بھی کی اور یہ تو اکثر ہوتا تھا کہ جب علی گڑھ یا حیدرآباد کے کوئی صاحب ہمارے ساتھ ہوتے وہ معمول سے زیادہ خاطر کرتا۔ فرمایش کے علاوہ نلی کا گودا، بھیجا اور اچھی اچھی بوٹیاں بھیجتا رہتا اور باوجود اصرار کے کبھی ان چیزوں کی قیمت نہ لیتا۔ اب یہ اپنے شہر والوں کی پاس داری کہاں ؛ ہماری وضع میں کیا سلوٹیں آئیں کہ زندگی کی شرافت ہی میں جھول پڑ گئے۔

باتیں بڑے مزے کی کرتے تھے۔ مجھ کو پرانے آدمیوں سے پرانی باتیں سننے کا بچپن سے لپکا ہے۔ جب تک دُکان لگتی، گاہک آتے ہیں اُن کا دماغ چاٹا کرتا۔ ایک دفعہ سترھویں دیکھنے میرے چند دوست باہر سے آگئے اور آتے ہی فرمایش کی "یار نہاری نہیں کھلواتے" میں نے کہا "نہاری! کل صبح ہی سہی۔ وہیں سے نظام الدین چلے چلیں گے" شام کو سید پوریئے سے کہہ دیا اور سویرے ہی دُکان پر جا پہنچے۔ دیگ ابھی کھلی نہ تھی۔ تنور گرم ہو رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی گنجے صاحب کہنے لگے "حضت پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔ ذرا تنور کا تاؤ آجائے۔ مگر آج یہ آپ کے ساتھ کون صاحب ہیں پنجاب کے معلوم ہوتے ہیں۔ سترھویں میں آئے ہوں گے؟"

"ہاں خاص لاہور کے رہنے والے ہیں۔ میں نے کہا کیا یاد کریں گے۔ نہاری تو

کھلاؤ۔

"مگر میاں نہاری میں تو مرچیں زیادہ ہوں گی۔"

"جو کچھ بھی ہو۔ کوئی صورت ایسی نہیں کہ مرچوں کی جھونجھ کم ہو جائے۔"

"کھٹے اور گھی کے سوا اور کیا علاج ہے لیکن میاں تمھارے کھانے کا مزہ جاتا رہے گا۔ ہر چیز قاعدے سر کی ہونی چاہیے۔ خیر اللہ مالک ہے کھلاؤ تو سہی۔"

"بھئی مُنہ نہ پٹوا دینا۔ ایسا نہ ہو کہ نیکی برباد گناہ لازم ہو جائے۔"

"اپنی طرف سے تو کمی کروں گا نہیں پھر بھی ناک آنکھ بہنے لگے تو ان کی تقدیر۔"

"تم بھی سترھویں میں جاؤ گے۔"

"کئی کئی برس ہو گئے۔ جانے کو جی نہیں چاہتا۔ کہاں جائیں اور کیا دیکھیں؟ آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں، ایک سترھویں کیا کوئی میلا اب نگاہ میں نہیں جچتا۔ غدر سے پہلے کی سترھویاں بھی دیکھیں اور غدر کے بعد کی بھی۔ بادشاہی کا بڑھاپا تھا اور میرا بچپن مگر وہ رونق، وہ چہل پہل، وہ بہار کہیں بھولنے والی ہے۔ میاں اُن وقتوں کا تو کہنا ہی کیا گھر کا وارث زندہ تھا۔ دلی رانڈ تھوڑی ہوئی تھی۔ دس برس پہلے تک بھی ان میلوں میں گہما گہمی ہوتی تھی، اس کا بھی افسانہ ہی افسانہ سُن لو۔"

"اُن دنوں میں کیا انوکھی بات ہوگی۔ ایک بادشاہ نہ رہے اور تو سب کچھ وہی ہے۔ وہی شہر والے وہی محبوبِ الٰہی کا مزار۔"

"اب میں آپ سے کیا کہوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ دُولھا سے برات ہوتی ہے، پھر دلی کے وہ دل والے اور شوقین چھوڑے کہاں رہے۔"

"تو کیا یہ جتنے سترھویں میں جاتے ہیں دلی والے نہیں ہوتے؟"

"ہوتے ہیں لیکن سنو! میں بس۔ وہ بھی مزدور یا کارخانے دار ہے۔ شرفا وہ سادے دنوں میں زیادہ جاتے ہیں۔ سترھویں میں گئے تو چپکے سے فاتحہ پڑھی، ختم میں شریک ہوئے اور واپس چلے آئے۔"

"آخر غدر سے پہلے کی سترھویں میں کیا خوبی تھی جو آج نہیں۔"

"میاں بس خوبی یہی تھی کہ وہ عقیدت کا میلا ہوتا تھا۔ اب ایک تماشا ہے۔

چوتی پھینکی اور کھٹ سے تھیٹر میں جا بیٹھے۔ ناچ دیکھا گانا سُنا، تالیاں بجائیں، کچھ پھبتیاں اُڑائیں اور چلے آئے۔ یہ کیا مزے داری ہے کہ بھاگا بھاگ پہنچے۔ ریلتے پیلتے اندر گئے۔ قوالی میں ایک کے کندھے پر دوسرا سوار ہوا۔ اِدھر جھانکا اُدھر تاکا، کہنیاں مارتے دھکّے کھاتے باہر آئے۔ مدرسے میں جاکر گنبد میں آوازیں لگائیں، گھاس روندی، تاش کھیلے، پان کھائے، سودے اُڑائے اور خاک پھانکتے گھر آگئے۔ واہ بھئی واہ۔"

"تو کیا پہلے سترھویں میں جانے والے سر کے بل جاتے تھے؟"

"محبوبِ الٰہی کی اولیائی کو پہچاننے والے سر کے بل ہی جاتے تھے اور میاں آنکھوں والے آج بھی سر کے بل جاتے ہیں۔"

"تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا پہلے یہ باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ تم نے تو بادشاہی کی سترھویں بھی دیکھی ہے۔ آخر ہم بھی تو سنیں اُس وقت اس میلے کا کیا رنگ تھا۔"

"پچاس پچپن برس کی باتیں ہیں پوری پوری تو کہاں یاد۔ دوسرے اپنے ہوش میں غدر پہلے کی ایک ہی سترھویں میں نے دیکھی بھی تھی ہاں کچھ آنکھوں دیکھے اور کچھ کانوں سُنے حالات ملاکر سُناتا ہوں۔ سب سے پہلے درگاہ میں مشائخ جمع ہوتے تھے۔ سترھویں کی رات شہر کے عقیدت مند پہنچ گئے۔ اوّل ختم ہوا، رات کا وقت، قندیلیں روشن، اللہ والوں کا مجمع، برکات کی بارش، وہ سماں دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ کالے سے کالے دل نور سے بھر جاتے تھے۔ پھر قوالی شروع ہوئی۔ صاف ستھرے اہلِ دل قوالوں کی ٹولیاں، درد بھری آوازیں، اللہ ہو کے زمزمے، فارسی اُردو، بھاشا کا کلام جس سے پتھر موم ہو جائے۔ انسان کا کیا ہوتا ہے کہ چُپ بیٹھا رہے۔ جس کو دیکھو لوٹن کبوتر۔ رات بھر یہ ہوحق رہی۔ صبح کو بادشاہ آئے۔ سر جھکائے ہوئے مودّب، دست بستہ، پیچھے پیچھے امیر وزیر، شاہ زادے نیچی نگاہیں۔ خاموش۔ درگاہ میں فاتحہ پڑھی۔ چار اشرفیاں اور بتیس روپے نذر چڑھائی۔ دو سو روپے عُرس کی نیت کے خادموں کو دیے، ختم میں شرکت کی۔ اتنے میں خادم تبرک کی ہنڈیاں اور پھیٹنے لائے۔ حضور نے سر جھکا کر پھیٹنا بندھوایا ہنڈیاں چوب دار نے سنبھالیں اور ایک اشرفی تبرک کی دے کر سوار ہو گئے۔"

اب شہر کی خلقت آنے لگی۔ قوالی زوروں پر ہے، خلقت ٹوٹی پڑتی ہے، درگاہ

میں نذریں چڑھ رہی ہیں۔ خادموں کی گوڑی ہو رہی ہے۔ خادم اپنی اپنی اسامیاں تاک تاک کر لوگوں کو لپک رہے ہیں۔ جس کو دیکھو دو دو تبرک کی ہنڈیاں، کھیلیں، بتاشوں، شکر پاروں سے بھری آٹے سے منہ لپا ہوا، ہاتھوں میں لیے۔ دوہتہ کے سبز اور سفید پھلنے سر پر لپیٹے چلا جاتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطان جی کے دربار سے خلعت اور انعام مل رہا ہے۔ آج کل کی طرح یوں ہی بے کار نہیں سمجھتے تھے۔ خادموں کا بھی یہ حال نہ تھا کہ غریبوں کی بات نہ پوچھیں۔ امیروں کے گرد منڈلاتے پھریں۔

گیارہ بجے تک اچھے شہری اور عرس سے غرض رکھنے والے رخصت ہوئے۔ میلا دیکھنے والے بانکے ترچھے آ پہنچے۔ درگاہ شریف میں گانا ہو رہا ہے۔ ادھر باولی پر ہجوم ہو گیا۔ کوئی سیڑھیوں پر بیٹھا نہار رہا ہے۔ گداگی ہو رہی ہے۔ پیراکی کے کمال دکھائے جا رہے ہیں۔ دکان دار کھلونے والے، پٹوے بساطی، کاٹھ کے کھلونوں، بچوں کو لبھانے والی طرح طرح کی چیزوں سے دکانیں سجاتے۔ کچالو والے بڑے بڑے چھبیے، ہرے ہرے کیلے کے پتے بچھے ہوئے، ابلے ہوئے آلو کچالو ایک طرف، امرود، ناشپاتی، کمرک، نارنگیاں، کوری ہنڈیا میں مسالا۔ ترشے ہوئے کھٹے، لیموں، سُریلی آواز میں "چاٹ ہے بارہ مسالے کی" پکارتے کہیں کبابی گولے پسندے کے کباب۔ تنّی والے، گولی، کلیجی، بھیجے کے کباب گرم گرم تلتے، کسی طرف برف والے بڑے بڑے ہنڈے جن میں ربڑی، کھرچن، پستے کی قفلیاں، "آب خورے جمائے" "آنے والی ٹکے کو، ٹکے والی پیسے کو" کہہ کہہ کر غل مچا رہے ہیں۔ لونگ چڑے والے لمبی لمبی کاٹھ کی کشتیوں میں بیسن کی پھلکیاں کچھ پانی میں بھیگی کچھ ویسی ہی۔ انڈے کی ٹکیاں، مچھلی کے کباب لگائے۔ بیسیوں چھڑی والے کاغذ کے پھول، پنکھے، توتے، چڑیاں، روئی کے لنگور لیے، سقّے کٹوریاں بجاتے، ساقی حقہ پلاتے سیکڑوں فقیر مدار یے زنجیریں ہلاتے گرز کھڑکاتے۔ کہیں ہنڈولا گڑا، مدرسے کی سڑک پر خمریوں کے جتھے کے جتھے، یکّوں، گاڑیوں، رتھوں، بہیلیوں کے ساتھ ساتھ دوڑتی اور مانگتی جاتی ہیں: "اللہ خیریں ہی خیریں رہیں گی، تیرے من کی مرادیں ملیں گی۔ تجھے حق نے دیا ہے۔ دیا ہے۔ تیرے بٹوے میں پیسا دھرا ہے دھرا ہے۔ تجھے مولا نوازے دے جا۔ دے جا۔"

دو پہر ڈھلی تو میلا ہمایوں کے مقبرے میں جسے دلی والے مدرسہ کہتے ہیں، آیا۔

یہاں کی کیفیت ہی اور ہوتی۔ کہیں گانا بجانا ہے تو کہیں کھانا پینا۔ کبڈی کھیلی جارہی ہے، تاش اُڑ رہا ہے۔ کوئی بھول بھلیوں میں ہکّا بکّا چکراتا ہے، کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں لیٹا ہوا ہے، پتنگ بازی ہورہی ہے۔ بگلا، چیڑا، کل دُمہ، پری کنکوّے اور کل سری، لَل دُمی، کلیجہ جلی، الفن تکلیں بڑھ رہی ہیں۔ کہیں اِچم ہے کہیں ڈھیلیں چلنے لگیں۔ کسی نے کاٹا کوئی کٹ گیا۔ کسی کی کنچھی پھٹ گئی، کسی کا کنّا نکلا کسی کی دال جیتو ہوگئی۔

اسی اثنا میں کسی شہزادے کی سواری آئی۔ آگے آگے سپاہیوں کے تمن ہیں۔ باجا بجتا آتا ہے۔ نقیب چوب دار پکارتے آتے ہیں "صاحب عالم پناہ سلامت" عماری میں آپ بیٹھے ہیں۔ خواصی میں مورچھل ہورہا ہے۔ مقبرے کے دروازے پر فیل بان نے ہاتھی بٹھایا۔ سب جلوس ٹھیرا، سلامی اُتری، کہاروں نے پالکی لگادی۔ سوار ہوکر اندر آئے، دو خواص مورچھل لے کر اِدھر اُدھر ہوگئے "ہٹو بڑھو صاحب!" کی آوازوں کے ساتھ چلے۔ مقبرے کے چبوترے پر اُتر کر پیدل ہوئے۔ اوپر آئے۔ فرش فروش مسند تکیہ آراستہ تھا۔ سپاہیوں کا پہرہ لگ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھے۔ میلے کی سیر دیکھی۔ گانا سُنا اور سوار ہوگئے۔ یہ کیا چلے کہ میلا اُکھڑا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چمپت ہوئے۔ لیجیے صاحب سترھویں ختم۔

یہ صبح ہوتے کی خوابیدہ کہانی سُن کر میں نے چھیڑنے کو کہا "بھلا اس میں کون سی نئی بات ہوئی۔ اس وقت بے کار اور گھر پھونک تماشا دیکھنے والوں کی زیادتی تھی۔ ان ہی بیہودگیوں اور فضول خرچیوں کا تو آج خمیازہ بھگت رہے ہیں۔" چہرہ تمتما گیا جل کر کہنے لگے۔ "آپ پر تو نیا رنگ چڑھ رہا ہے۔ میاں وہ قلعے کا دسترخوان ہی اُٹھ گیا۔ اب کیا کہوں۔ میاں اُس وقت کی دِلّی جنّت تھی جنّت۔ اور دلی والے جنّتی۔ آج کل جیسی دوزخ نہ تھی۔ سچ ہے جیسی گنڈی سیتلا ویسے ہی پوجن ہار۔ یہی خیالات ہیں تو آکے سیر دیکھنا۔ اچھا اب آپ اوپر تشریف لے جایئے۔ آپ کے لائق روٹیاں اُتر آئی ہیں۔ گھی کڑکڑا رہا ہوں۔ نہاری بگھری اور میں نے کھانا بھیجا۔ بسم اللہ۔

یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں اگلی سی فارغ البالیاں نہیں رہیں۔ نہ دلوں میں اُمنگیں ہیں نہ جذبات میں زندگی۔ میلے ٹھیلے اوّل تو جاتے ہی رہے۔ نئی تعلیم نے انھیں دیس نکالا دے دیا اور جو دو چار مذہبی رنگ لیے

ہوئے باقی ہیں اُن پر برابر افسردگی چھاتی جاتی ہے پُرانے لوگ پُرانی باتوں کو جتنا روتیں بجا ہے کہ انھوں نے اپنی بادشاہت، اپنی حکومت اور اپنا گھر آباد دیکھا تھا۔ عید، بقرعید، شب برات، محرّم، سترھویں آج بھی ہوتی ہے۔ کہیں کہیں بسنتیں اور کبھی کبھی پھول والوں کی سیر بھی ہو جاتی ہے لیکن عشق و ہوس کا سا تفاوت ہے ۔

کیا پوچھتا ہے ہم دم کل کیا تھا آج کیا ہے
محفل اُجڑ گئی ہے افسانہ رہ گیا ہے

میر لوٹڑو

پُرانے بادشاہی شہر ہر طرح کی عجائبات کے نمونے ہوتے تھے۔ آج کی سی زندگی کی کش مکش نہ تھی۔ نہ اتنی اُلجھنیں تھیں نہ ایسی مشکلات اس لیے چھوٹے بڑے، امیر غریب کو جو دُھن سما جاتی عجائب المخلوقات بنا کر چھوڑتی جو لے لگ گئی بس اُسی کے ہو رہے۔ اچھے بُرے جس جذبے سے متاثر ہوئے، افسانہ بن گئے۔ مجال ہے کہ مرتے مرتے چھوٹ جائے۔ کیسی ہی تکلیفیں اٹھانی پڑتیں، کچھ بھی ہوتا وہ اپنے خیال سے نہ ٹلتے۔ بات یہ تھی کہ سچا زمانہ تھا۔ دوستی ہے تو دوستی، دشمنی ہے تو دشمنی۔ اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے ناممکن ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ٹلیں۔

دِلّی بھی غدر سے پہلے تک ایسی ہی مخلوق سے آباد تھی۔ کسی بہادر شاہی یادگار سے کہیں ملاقات ہو جائے تو اس قسم کی ہزاروں کہانیاں سُن لو، بلکہ وہ خود کسی نہ کسی افسانے کے ہیرو نکلیں گے۔ میر لوٹڑو کی تو آپ نے زیارت کی ہوگی۔ ملکہ وکٹوریہ کے دربار سے کوئی دو برس پہلے اُن کا انتقال ہوا ہے۔ دیکھا نہیں تو نام سُنا ہوگا۔ آثارِ قدیمہ میں سے تھے۔ لیکن شاید یہ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ مرے کیونکر؟ بیمار تو ہوئے نہیں۔ بس ایک دن جمنا میں لاش تیرتی ہوئی ملی۔

میر لوٹڑو بالکل لوٹڑو ہی تھے۔ چھوٹا سا قد، دُبلے پتلے، گول گول چہرہ، پرانی وضع کا صاف ستھرا خاکستری رنگ کا لباس۔ حسب نسب کی تو کوئی نے آج تک کرید کی نہیں مگر شہر کے اکثر لوگ اُن کی عزت کرتے کوئی چچا کہتا، کوئی بڑا بھائی۔ جب دیکھا

مسکراتے کہتے ہیں کہ اپنے حال میں ہمیشہ مگن رہتے۔ نہ اُن کی زبان سے کسی کا گلہ سُنا نہ کسی کی بُرائی۔ پہاڑ گنج کے آخری سرے پر ایک چھوٹے سے شکستہ مکان میں اکیلے رہا کرتے۔ سُنا ہے کہ توتے، مینا، لال، پدڑی کے پنجرے بنایا کرتے۔ جب دو چار بنا لیتے چوک پر آکر بیچ دیتے۔ یہی غالباً مدت سے اُن کے گزر اوقات کی صورت تھی۔

پُرانے لوگ یوں تو سب کے دوست ہوتے، جس سے ملتے بے لوث ملتے مگر حقیقت میں اصلی دوست کسی کو نہ بناتے اور جس کو بنا لیتے تو پھر ایک جان اور دو قالب ہو جاتے۔ دوست کہہ کر، دوستی کا حق ادا نہ کرنا ان کے مذہب میں کفر تھا۔ میر لوٹر و اپنے ہم عمر کئی شخصوں سے ملا کرتے۔ اِن کے بیٹھنے اُٹھنے کے دو چار ہی ٹھکانے تھے۔ بڑی بے تکلفی سے باتیں ہوتیں۔ میلے ٹھیلے میں بھی اکثر اُن کو ساتھ دیکھا ہے۔ ان عام دوستوں کے علاوہ میر صاحب کی ایک تھانے دار صاحب سے خاص دوستی تھی۔ کہاں وہ گرانڈیل ترش رو پولیس کا داروغہ اور کہاں یہ منحنی سے ہنس مکھ میر لوٹرو۔ ان دونوں کا کیا میل لیکن خدا کی قدرت یہ اسے اپنا سب سے زیادہ مخلص دوست جانتے تھے۔

میر صاحب غریب اور داروغہ جی امیر، غریب کسی کے ہاں کھائے تو بھوکا۔ کسی سے کچھ مانگے تو بے شرم۔ امیر کی دُور بلا۔ یہ سب باتیں بے تکلفی اور سادگی میں داخل۔ پھر میر لوٹرو ان معاملات میں بہت ہی بے لاگ۔ گز بھر کی ناک والے اور داروغہ جی ٹھہرے دوست۔ یہ تو اُن کے ہاں کبھی کبھار ہی جاتے وہ بھی کھڑے کھڑے۔ دروازے پر پہنچے، سپاہی سے خیریت پوچھی یا داروغہ جی ہوئے تو دو ایک باتیں کیں اور آگے بڑھ گئے۔ بچّے کہتے رہ جاتے کہ چچا بیٹھو۔ داروغہ کا کیسا ہی پیام آتا کہ بھائی کیا ہمارے ہاں بیٹھنے کی قسم کھائی ہے۔ پان تو کھاتے جاؤ۔ مگر یہ اپنی وضع سے مجبور۔ برخلاف اس کے داروغہ جی جب آتے بغیر کھائے نہ جاتے۔ میر لوٹرو نقد دم۔ زبان چٹخارے بھرتی ہوئی خود پکاتے اور جو چیز پکاتے خوب پکاتے۔ داروغہ صاحب کی تیسرے چوتھے دن کوئی نہ کوئی فرمائش رہتی۔ کبھی کبھی بچّوں کو بھی ساتھ لے آتے۔ میر صاحب خاطر میں بچھے جاتے ہیں اور داروغہ جی کی فرمائش پر فرمائش ہو رہی ہے۔" بھئی کریلوں کے ساتھ

گڑانبہ خوب مزہ دیتا ہے۔ میر صاحب ہیں تو دوستی کے معنی بے تکلفی سمجھتا ہوں۔ بیگنوں کی تلاذی آپ کے ہاتھ کی بے مثل ہوتی ہے۔" میر صاحب فرماتے "مجھ سے پوچھتے ہو تو تکلف آدھی دشمنی ہے۔ اچھا تو بیگن اور وہی لے آؤں"۔

داروغہ جی : دوستی اور بیگانگی۔ لوگ دراصل دوستی کو جانتے ہی نہیں۔ ذرا زیادہ بنائیے گا۔ آپ کی بھاوج کو بھی چکھانی ہے۔

میر صاحب : لعنت ہے جو دوست سے دوئی رکھے۔ کریلے بھی دو چار نوالوں کے لیے جانا۔

داروغہ جی : مگر میر صاحب آج کل یہ باتیں کہاں۔ بس ایک میں اور تم ہی رہ گئے ہیں۔ مر گئے دوستی کی قدر کرنے والے اور کیا گڑانبہ نہیں دو گے۔

غرض کہ داروغہ جی کھاپی، مونچھوں پر تاؤ دے تھانے یا گھر روانہ ہوتے ساتھ ساتھ اردلی خوان لیے ہوئے ہوتا۔ بچے آجاتے تو ایک دو تجربے بھی منگوا لیتے۔ وہ بھی اچھے سے اچھے جو زیادہ قیمتی ہوتے۔ چلتے وقت داروغہ جی یہ فقرہ ضرور کہتے "دوست کا ملنا خدا کی عنایت ہے۔ بھئی میر صاحب واللہ والد مرحوم کہا کرتے تھے۔ کہ دوست اسے سمجھو جو دوست کی ہر چیز کو اپنا سمجھے"۔ میر لوٹرو یہ سن کر سر ہلاتے اور مسکرا کر کہتے "بے شک وہ سچ فرماتے تھے" اور دل ہی دل میں خوش ہوتے کہ کیا خدا کی شان ہے پولیس والا دوستی کا دم بھرے۔ مجھ سے بڑھ کر کون قسمت کا دھنی ہوسکتا ہے"۔

پاس پڑوس والوں کو اُس زمانے میں اوّل تو اِس وقت جیسی تاک جھانک نہ تھی۔ بلاوجہ کسی کو کھاتا کھلاتا دیکھ کر جلنا، خواہ مخواہ کسی کے میل ملاپ میں سُرنگ لگانا وہ لوگ پاجی پنا سمجھتے تھے۔ دوسرے میر صاحب کا برتاوا اور داروغہ جی داروغہ جی ٹھہرے۔ پھر بھی ملنے جُلنے والوں کو اچنبا ضرور تھا کہ عجب دو قسم کی دوستی ہے۔ میر لوٹرو کی مدارات کے بدلے داروغہ صاحب امیر ہوتے ہوئے بھی غریب کے ساتھ کوئی سلوک نہیں کرتے۔ ان کے اشارے میں سب کچھ ہے۔ مگر میر صاحب۔ بچارے، پر فاقے گزر جائیں کیا مقدور کہ داروغہ جی کی آنکھ پر میل آئے، ان کا دل پگھلے۔ اگر کبھی اتفاق ہوتا بھی کہ میر صاحب اپنے دوست کی کوئی فرمایش پوری نہ کرسکتے تو بجائے عملی ہمدردی

کے وہ ہمیشہ سچّی اور بے غرض دوستی پر وعظ کہنے لگتے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے برسات کا موسم تھا۔ پہلی سی بارشیں اب کہاں پندرہ پندرہ دن کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ سارے کاروبار پٹ۔ گھر سے نکلنے کی دہات نہیں۔ گلیوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی موسلا دھار پانی پڑ رہا ہے۔ میر لوٹر و پہلے ہی نازک آدمی۔ گھر کھنڈر چھت میں ٹپکا لگا ہوا ہے۔ یہ دیوار گری وہ پاکھا چلا۔ بچارے کبھی اوپر دوڑتے ہیں کبھی دیواروں پر بورے ڈالتے ہیں۔ پنجرے بنانے کی کب فرصت اور بنائیں تو چوک تک جائیں کس طرح خریدار کہاں سے لائیں۔ دو دو وقت سوکھے گزرنے لگے۔ ایسی حالت میں اور دوستوں کا تو کیا ذکر داروغہ جی نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ گھر میں بیٹھے حقّہ گڑگڑایا کرتے۔ داروغن کی زبان پر کسی کھانے کا چٹخارا آتا اور وہ میر صاحب کو یاد کرتی تو کہہ دیتے "مینہ بوندی کے دن ہیں وہ بچارا خود اپنے حال میں مبتلا ہوگا۔"

درونن : اے ہے تم بھی کیسے بے مروّت ہو۔ جا کر پوچھا تو ہوتا۔ آخر اپنے لیے بھی تو کچھ پکاتے ہوں گے۔

داروغہ : کیا پکاتے ہوں گے۔ میں تو جانوں فاقوں کی نوبت ہوگی۔

درونن : سچ، پھر تو ضرور خبر لینی چاہیے۔

داروغہ : تمھیں تو باولے کتّے نے کاٹا ہے۔ کیوں خبر لوں۔ کیا فائدہ؟

درونن : آخر تمھارا دوست ہے۔ اگر اسے کوئی تکلیف ہو تو کام آؤ۔ خدا نے تم کو اس لایق کیا ہے۔

داروغہ : پاگلوں کی سی باتیں نہ کرو۔ جب کسی کو تکلیف ہو چپ چاپ چھوڑ دینا چاہیے۔ اسی میں راحت ہے۔ ناحق شرمندہ کرنے سے کیا حاصل۔ اور یہ جو کہو کہ مجھے خدا نے سب لایق کیا ہے تو کام آؤ مطلب؟ میں اسے کچھ دوں۔ خدا تو نہ دے اور میں دوں؟ سبحان اللہ! پھر میر صاحب کی آن بان بھی دیکھی ہے۔ وہ میری خاطر کریں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ اُن کی مشکلات میں اضافہ کروں اور خالی جانے اور آنے کا کیا نتیجہ؟

درونن : وہ بچارا تو تمھاری دوستی کا دم بھرتا ہے اور تم اُس کے بُرے وقت

میں پوچھتے تک نہیں۔

داروغہ : یہ کس نے کہہ دیا کہ میں انھیں دوست نہیں سمجھتا۔ واقعی وہ میرے اور میں اُن کا مخلص دوست ہوں۔ لیکن دوستی کے متعلق کم ازکم میرا نظریہ تو یہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ہے بھی بالکل دُرست۔ اس لیے برسات بھر تو میں کسی طرح اُن سے ملنے کے لیے تیار نہیں۔ موسم کھُل جانے دو، اُن کے پنجرے پکنے لگیں۔ چولھا گرم ہونا شروع ہو جائے پھر ہم ویسے ہی دوست ہم پیالہ وہم نوالہ۔ دراصل اُنھیں جتنی خوشی مجھ کو کھلانے میں ہوتی ہے میرا کھانے میں نہیں اور میں اُن کی خوشی چاہتا ہوں۔ سچّی دوستی کے یہی معنی ہیں کہ دوست کی خوشی اپنی خوشی پر مقدم سمجھے۔

دروغن : (ٹھنڈا سانس لے کر) خدا جنّت نصیب کرے نانا ابا کو، اُن کا بھی یہی طور طریق تھا۔ آج وہ ہوتے تو داد دیتے۔ اللہ اللہ! اتنی بے غرض محبّت! میں مرد ہوتی اور کسی کو اپنا دوست بناتی تو تمھارے جیسی سچّی دوستی رکھتی۔ دوستی کے متعلق تم نے کیسے اچھّے اصول بنا رکھے ہیں۔

داروغہ : ایسی با اصول دوستی میں تکلیف مطلق نہیں ہوتی۔

دروغن : تکلیف ہوئی تو وہ موئی دوستی کس کام کی۔

داروغہ : مگر کیا پھر آدمی دشمنی ہی نہ کرے۔

دروغن : مگر تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی ہے۔

داروغہ : (چٹکی بجا کر) تالی نہ سہی چٹکی تو بجتی ہے۔

دروغن : اے جاؤ بھی! تھانے دار ہو کر تم بڑے خود مطلب ہو گئے ہو۔ داروغہ جی کا چھوٹا لڑکا بھی پاس بیٹھا باتیں سن رہا تھا۔ نہ جانے اس کے ننھے سے دل میں کیا آیا بولا۔

بچہ : امّاں مینہ برستے میں چچا لوٹڑو کے گھر ہم کیوں کر جا سکتے ہیں۔ انھیں یہاں بُلا لو نا۔ وہ بیٹھے ہوئے پکوان تلیں گے۔ مینا کا پنجرا منّی نے توڑ دیا ہے اسے بھی ٹھیک کر دیں گے۔

دروغن : اور جو بیٹا اُن کے آنے کے بعد مینہ زیادہ برسنے لگا تو پھر اپنے گھر جائیں گے

کیسے؟

بچّہ : یہیں رہ جائیں گے۔ ہمارے ہاں کیا جگہ نہیں۔

دروغن : اور ان کے کھانے کو روٹی کہاں سے آئے گی؟

بچّہ : تم نہیں دو گی؟ اُن کا کھا جاتی ہو۔

دروغن : (مسکرا کر) یہ بات نہیں۔ انھوں نے کبھی ہمارے ہاں کا پان بھی کھایا ہے؟

داروغہ : اور کیا۔ وہ ناک پر مکھّی تو بیٹھنے دیتے نہیں۔ ہمارے ہاں بیٹھ کر کھائیں گے؟

بچّہ : میں اپنے حصّے کا کھانا کھلادوں گا۔ اچھا جیسے وہ اپنے گھر پکاتے ہیں یہاں پکالیں۔ اچھی اماں۔ انھیں بلالو۔ وہ بچارے اکیلے ہوں گے۔ مکان بھی اُن کا ٹوٹا ہوا ہے کہیں گر نہ پڑے۔ ابّا اردلی سے کہ آؤں۔ ایسے میں مینہ کا زور بھی کم ہو گیا ہے۔

داروغہ : (بچّے کو گھُرک کر) ہشت اتنا بڑا ہو کر بھی گدھا رہا۔ پانچویں میں پڑھ کر بھی ڈبویا۔

دروغن : یہ کیونکر؟

داروغہ : میں تو اس عمر میں بڑے بڑوں کے کان کاٹتا تھا۔

دروغن : ایک تم ایسے ہو گئے۔

داروغہ : تخم تاثیر صحبت کا اثر مشہور مثل ہے۔ لیکن اس نالائق میں تو میری ایک ادا نہیں۔

دروغن : وہ کیا تم کہا کرتے ہو نظریے و زریے۔ مجھے تو ٹھیک نام بھی نہیں آتا۔ یہاں بھی کوئی لگادو۔

داروغہ : (ہنس کر) یہ تمھاری گود کا اثر ہے۔

دروغن : رہنے بھی دو۔ تمھاری زبان سے کون جیتے۔ آخر خدا رکھے سدو نے کون سا شتابہ لگا دیا کہ ایسے چراغ پا ہو گئے۔ بچّے تو محبت کے یار ہوتے ہیں میرصاحب اس سے محبت کرتے ہیں۔ کوئی چیز پکائیں سدو کے بغیر حلق سے نہیں اُترتی۔ اس وقت ذکر آیا۔ اپنے چاہنے والے کو سب ہی چاہتے ہیں۔ اس نے اگر کہہ دیا کہ میرصاحب کو بلالو تو کیا خطا کی۔ اُلٹا چور کو توال کو ڈانٹنے لگا۔ ایک تو اپنے

دوست کی مصیبت میں کام نہ آؤ۔ بچہ ہمدردی کرے تو اُلٹے اس پر بھبکو۔ نیکی بھلائی کی ترغیب دینے سے تو رہے۔ اس کے دل میں جو خُدا ترسی پیدا ہوئی ہے اُسے بھی مٹاتے ہو۔

داروغہ : میں کہہ چکا ہوں کہ تم سدا کی بے عقل ہو۔ ایک تم کیا عورت کی ذات ہی بے عقل ہے۔ اس میں سمجھ کا مادّہ ہی نہیں ہوتا۔ اس پر غضب یہ کہ ضد۔ ارے ناقص العقل۔ ہم دُنیا دیکھتے اور دنیا کو برتتے ہیں یا تم چار دیواری کے اندر بیٹھنے والیاں۔

درو غن : یہ سب کچھ ہے لیکن میں پوچھتی ہوں کہ بچے نے کون سی بے عقلی کی بات کہی؟

داروغہ : (مسکرا کر) عقل کی دشمن۔ تم کیا جانو کہ لڑکے نے کتنی نادانی کی باتیں کی ہیں۔

دروغن : اُوئی۔ کسی پر ترس کھانا، اپنے پیاروں کو یاد کرنا، نادانی کی باتیں ہیں، تو اللہ تم پر رحم کرے۔

داروغہ : بھئی برسات کیا آئی مصیبت آئی۔ گھر میں کیا بیٹھنا ہوتا ہے، شامت آجاتی ہے۔ ہر بات میں حجت۔ خدا کی بندی یہ نفسیات کے مسئلے ہیں، تمھاری سمجھ سے بہت دور۔

دروغن : جی ہاں مولویوں سے بڑھ کر۔ مولوی حفیظ اللہ خاں کا وعظ سُنا مولوی عبدالرّب کے درس میں گئی۔ سب کی باتیں سنیں اور سمجھیں۔ تم ایسے کہاں کے مولانا ہو کہ تم جو کہو گے وہ نہیں سمجھوں گی۔ ہاں یہ تمھاری نفسی، نظریہ کیا بلا ہیں۔ میں کیا میرے باپ بھی ہوتے تو نہ سمجھتے۔

داروغہ : ارے بی یہ علمی مسائل ہیں تمھارے سمجھنے کے نہیں تم اُٹھو اپنا چولہا پھونکنا شروع کرو۔

دروغن : چلو گھر بیٹھے بیٹھے زبان کُند ہو چلی تھی تم نے کہا کہ آؤ ذرا سان لگالو۔ بچارے بچے ہی کو پاگل بنانے لگے۔

داروغہ : یہ بات نہیں۔ واقعی سدّو نے جو کچھ کہا بے وقوفی سے کہا۔ آخر بچہ ہی ہے۔ وہ ابھی دنیا داری اور بے غرض دوستی کے برتاو کیا جانے۔ لیکن یہی عمر سیکھنے کی ہے۔ اور گھر میں نہ سیکھے گا تو باہر یہ تجربے کی باتیں کون بتاتا ہے۔

دروغن : تم نے تو کُتّے کا بھیجا کھایا ہے۔ میرا تو سر چکرا گیا۔ اتنی باتیں کیں اور اصل بات

نہ بتائی۔

داروغہ: نیک بخت میں پھر کہتا ہوں کہ تمھاری سمجھ میں خاک نہیں آئے گا۔

دروغن: تمھاری بلا سے۔

داروغہ: (مسکرا کر) عورت بھی جب پٹتی ہے تو بلا سے بڑھ کر۔ اچھا بتا ہی دوں۔

دروغن: یا اللہ۔

داروغہ: تو سُنو! فرض کرو، خو نخواستہ اگر میاں سدّو کی حماقت سے میر ٹوٹرو کو یہاں بلا بھی لیا جائے۔ یہ نہیں کہ میرے مکان میں جگہ نہیں یا دو روٹیاں نہیں کھلا سکوں گا۔

دروغن: پھر بُلا کیوں نہیں لیتے؟

داروغہ: ہونا نری آپا شبّو! وہ آئے تو کیا ہم اپنی حالت پر پردہ ڈال لیں گے۔ ہمارا رہنا سہنا، کھانا پینا، آمدنی خرچ سب اُن کے سامنے ہوگا۔ وہ سوچیں گے کہ داروغہ جی کیسے عیش میں ہیں، کتنا بڑا مکان ہے، کیسی راحتیں، بیسوں سپاہی خدمت میں حاضر، شہر بھر پر حکومت، کسی چیز کی کمی نہیں۔ آدمی ہی تو ہیں یہ دیکھ کر حسد کرنے لگے۔ دل میں رشک پیدا ہوگیا تو کیا ہوگا۔ اور رشک وحسد جانتی ہو انسان کے لیے کیسی بلائیں ہیں؟ ایسی بے درماں بلاؤں سے اُن کی فطرت خراب ہونے دوں گا؟ ہرگز نہیں، قیامت تک نہیں خواہ وہ مصیبت میں مر ہی کیوں نہ جائیں۔ دوستی ہے ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ میں میر صاحب کا حقیقی دوست ہوں۔ کب گوارا کروں گا کہ وہ طمع اور حرص کے جال میں پھنسیں اور بفرض محال میں نے غلطی سے انھیں بلایا اور وہ حماقت سے آبھی گئے۔ شیطان نے انھیں ورغلایا، ناداری، بے روزگاری اور مصیبت میں شیطان خوب کام کرتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ مجھ سے کچھ قرض مانگ بیٹھے۔ افلاس میں وضع داری کی آنکھیں اندھی ہوجاتی ہیں تو کیا میں انھیں قرض دے دوں گا۔ توبہ توبہ، لاحول ولا قوۃ۔ جو چیز میں اپنے لیے پسند نہیں کرتا دوست کے لیے کس طرح پسند کروں۔ دوست اور چیز ہے اور قرض اور خدا کی نعمت اور لعنت ہرگز ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتی۔ آیا سمجھ میں؟

داروغہ: (ہنستے ہوئے) تمھیں کیا خبر کہ داروغہ کے لیے ایسی باتوں کی کتنی ضرورت ہے۔ مولوی بچارے حرام حلال کے سوا اور جانتے کیا ہیں۔

دروغن: اور تم ؟

داروغہ: (قہقہہ لگا کر) میں، میں دنیا کو احمق بنانا جانتا ہوں۔

دروغن: شہر کے داروغہ بن آئی ہے۔ جتنا چاہے اپنے مُنہ میاں مٹھو بن لو۔ اللہ بُرا وقت نہ دکھلائے، ساری عقل مندی رکھی رہ جاتی ہے۔

داروغہ جی کو بیوی کا یہ آخری فقرہ کچھ ناگوار سا معلوم ہوا اور تو کچھ بس چلا نہیں۔ بچّے کو ڈانٹ بتائی "ابے تو کیا سُن رہا ہے کیا آج مدرسے نہیں جائے گا۔ کھڑا ہو۔ مینہ برس رہا ہے تو کیا ہوا کہیں دُنیا کے کاروبار رُک جاتے ہیں"

آج تو زمانے کی رفتار کا ٹھکانا ہی نہیں بجلی کے کندھوں پر سوار دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں نکلا جاتا ہے۔ مگر اس وقت بھی ریلیں نکلنی شروع ہو گئی تھیں۔ یہ دوسری بات تھی کہ میر لوٹر و جیسے آگ پانی کے میل سے ڈرے ہیں۔ داروغہ جیسی مخلوق تو ہوا کا رُخ دیکھتی ہے۔

لڑکا جب ٹل گیا تو داروغہ صاحب پھر بیوی کی طرف مخاطب ہوئے۔ حقّے کے دو چار کش لیے اور متین صورت بنا کر کہنے لگے۔ "بیگم تم زمانے سے بہت پیچھے رہ گئی ہو۔ وقت کو بالکل نہیں پہچانتیں۔ زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ قلعے میں پہلے بادشاہ تھے اب گورے رہتے ہیں۔ دوبارہ بہادر شاہ آنے سے رہے۔ رنگون سے اب اُن کی خبر آنی بھی مشکل ہے۔ تم چڑے چڑیا کی کہانی سننے والی کیا جانو کہ کیونکر زندگی بسر کرنی چاہیے۔ میں پولیس کا داروغہ ہوں داروغہ۔ بادشاہی کے قصّے بھی سُنے۔ اب انگریزوں کی کہانیاں بھی میرے سامنے ہیں۔ میں اگر تم جیسا نادان بن جاؤں تو کان پکڑ کر نکال دیں۔ حاکموں سے روز میری مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ میں اُن کی چال نہ چلوں، اُن کی بولی نہ بولوں تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔

دروغن بیچاری میاں کا مُنہ تکنے لگی اور جب اُس نہ ختم ہونے والی تقریر سے اُکتا گئی تو "اونہہ! ہوگا! تم جانو اور تمہارا کام" کہتی ہوئی داروغہ جی کے آگے سے اُٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور داروغہ صاحب بیٹھے ہوئے حقّہ پیتے رہے۔

برسات ختم ہو گئی۔ دھوپ نکلنے لگی۔ کاروبار کُھلے۔ موسم خوشگوار تھا۔ گرمی جا رہی اور سردی آ رہی تھی۔ داروغہ جی دوپہر کو آرام کرنے کے بعد شام کو مٹرگشت کے لیے نکلنے

والے تھے۔

دروغن : رات کو کیا کھاؤ گے۔ نگوڑی ماما کے ہاتھ میں تو مزہ ہی نہیں۔ بہت دن سے کوئی مزے کی چیز ہی نہیں پکی۔ جتنی لاگت لگاؤ بے کار۔

داروغہ : مزہ تو میر صاحب کی ہنڈیا میں ہوتا ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے اُن کی چٹنی پر پلاو صدقے۔

دروغن : پھر آج ہو آؤ نا۔

داروغہ : (مسکرا کر) جانا تو اور طرف ہے مگر تم کہتی ہو تو اُدھر بھی ہوتا آؤں گا۔

دروغن : ہاں بہت دن ہوئے۔ ان غریب کا تمھارے سوا اور کون ہے؟

داروغہ : ارادہ تو کئی دن سے تھا اور آج تو صبح سے ان ہی کا خیال ہے۔

دروغن : آخر ہیں بھی تو وہ تمھارے پُرانے دوست۔ لیکن آج ان سے کوئی فرمایش نہ کرنا۔

داروغہ : وہ تو خود ٹوک کر پوچھتے ہیں۔ انھیں خاطر داری کا مرض ہے۔ کہو نہ کہو ضرور مجھے دیکھتے ہی کچھ نہ کچھ پکائیں گے۔

دروغن : میں تو کہتی ہوں کہ تم منع کر دینا۔

داروغہ : یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ اپنے دوست کی دل شکنی کروں۔

لڑکا : مینا کا پنجرا ٹوٹ گیا ہے۔ چار توتے اور آ گئے ہیں۔ ان کے لیے کوئی پنجرا نہیں۔

دروغن : اے ہاں۔ پنجرے تو انھوں نے بہت سے بنا لیے ہوں گے برسات میں کہیں جانا نہ آنا۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے یہی کام کیا ہو گا۔ دو چار پنجرے اچھے اچھے چھانٹ کر ضرور لیتے آنا۔ تم بھلکڑ ہو بھولنا نہیں۔

میر ٹوٹرو میں دو مہینے کے بعد جان میں جان آئی تھی۔ کام چلنا شروع ہوا تھا۔ نواب چڑیا نئے بگڑے ہوئے کوئی رئیس زادے تھے۔ شوق ہی تو ہے۔ رنگ برنگ کے پرند جمع کرنے کی لت لگ گئی۔ ہزاروں روپیا اس میں برباد کر دیا۔ اسی لیے لوگ انھیں نواب چڑیا کہنے لگے۔ میر ٹوٹرو کے پنجرے مشہور۔ انھوں نے کئی درجن پنجروں کی فرمایش کر دی۔ میر صاحب کا اکیلا ہاتھ۔ سہولت سے کام کرنے والے۔ اس پر اوزاروں کی کمی۔ برسات میں چاقو چھریاں بیچ کر کھا گئے۔ ایک لوہے کی پتی پر دھار لگائی تھی۔

اسی سے کام لیتے تھے۔ مغرب کے بعد دالان میں بیٹھے بانس چیر رہے تھے۔ انگیٹھی پر ہنڈیا چڑھی ہوئی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔

میر صاحب: کون صاحب ہیں؟

آواز: واہ حضرت۔ برس نہ دو برس، ایک ہی برسات میں بھول گئے۔ آواز تک نہیں پہچانتے۔

میر صاحب: آیئے آیئے تشریف لایئے، زہے نصیب کہ دوست دوست کے گھر آئے (دروازہ کھلا داروغہ جی اندر آئے) داروغہ جی، واللہ میں کچھ ایسا بے دھیان بیٹھا تھا کہ آپ کی آہٹ کان میں پڑی ہی نہیں ورنہ آپ کی دستک کا طرز ہی الگ ہے۔ آپ کی کنڈی کواڑوں پر نہیں دل پر بجتی ہے۔

داروغہ: بھئی ہم تو تمھاری صورت کو ترس گئے۔

میر صاحب: علیٰ ہٰذالقیاس۔ اب کی برسات بھی غضب کی تھی۔ پریشان کر دیا۔

داروغہ: خیریت تو رہی؟

میر صاحب: جینے جی خیریت کیسی؟ پیٹ کو روٹی، تن کو کپڑا اور پڑنے کو جھونپڑا سب ہی کچھ چاہیے۔

داروغہ: یہ تو بھئی زندگی کے لوازمات ہیں۔

میر صاحب: ہیں تو سہی مگر یہ برکھا تو بالکل ہی خراب رہی۔ مکان کا یہ حال کہ آسمان ٹپکے بارہ گھنٹے تو یہ چوبیس گھنٹے۔ وہ تو کچھ لیا دیا کام آگیا ورنہ قبر ہی بن گئی تھی۔ کپڑوں سے سیل ٹپکنے لگا۔ سوکھی لنگوٹی باندھنے کو نہیں رہی۔ اور چولھا تو ٹھنڈا رہنا ہی تھا۔

داروغہ: سچ کہتے ہو۔ تمھارا تو خیر چھوٹا سا اور مدت سے بے مرمت مکان ہے۔ بڑی بڑی حویلیاں بول گئیں۔ لیکن تمھیں تو خاصا شغل ہاتھ آگیا ہوگا۔ مثل مشہور ہے کہ خالی سے بیگار بھلی۔ یہ تو اپنا کام تھا۔ رہے کپڑے وہ تم گھر میں پہنتے کب ہو اور برسات میں تو کچھ ننگا رہ کر ہی چین ملتا ہے۔ کھانا تم جیسا موجی، سیل کے دنوں میں کیا پکاتا۔ چٹخے مٹخے اُڑائے ہوں گے۔

میر صاحب: اجی حضرت! چٹخے مٹخے کے لیے گانٹھ گرہ میں کس کے پاس تھا۔ یہاں تو

درچکھ ڈال مال دھن کو کوڑی نہ رکھ کفن کو" پر سدا عمل رہا۔ جو کھایا پیا برابر۔
داروغہ : دوست یہی تو عادت تمھاری ہمیں پسند ہے۔ اللہ پر بھروسا اتنا تو ہو۔
میر صاحب : میں کس لائق ہوں۔ گنہگار بندہ۔ مگر خیر اچھی یا بُری گزر گئی۔ اچھا کہو کیا کھاؤ گے؟
داروغہ : میر صاحب سچ پوچھو تو میں اسی لیے ساری برسات نہیں آیا کہ تم کھانے پینے میں اصرار کرو گے۔ میں مروت والا ٹھہرا زیادہ کھا جاؤں گا۔ موسم خراب ہوتا ہے مفت میں تمھیں بھی پچھتانا پڑے اور مجھے بھی۔
میر صاحب : اس وقت اور تو کوئی سامان تھا نہیں۔ جمعہ کی دکان پر بڑے کا گوشت اچھا دکھائی دیا۔ آدھ سیر کے پسندے لے آیا ہوں، ابھی بھُنے جاتے ہیں۔
داروغہ : (بھرّبھرائے ہوئے دل سے) ایسا ہی ہے تو گھر بھیج دینا۔ یوں تم کب ماننے والے ہو۔ مگر میری جان کی قسم ہو۔ بس چکھنے ہی کے قابل۔ یہ نہیں کہ ساری پتیلی اُلٹ دو۔
میر صاحب : (مُسکراکر) بھائی کو کیا نہیں چکھاؤ گے؟ ٹھہرو میں ذرا بازار تک ہو آؤں۔
داروغہ : سیّد۔ بھئی زیادہ تکلف رہنے دو۔ میں آیا ہوں تم کو دیکھ کر خوش ہونے یا تکلیف دینے۔
میر صاحب : جناب داروغہ صاحب ایسی "تکلیف دینے والے بھی آیندہ میسّر نہیں آئیں گے۔
داروغہ : قسم ہے وحدہٗ لاشریک کی کیا بات کہی ہے۔ بندہ نواز اس عاجز کا بھی یہی ایمان ہے۔
میر صاحب : دوستی، بچپن کی ٹنی ہوئی بات ہے، دل کا بھید ہے۔ برتاو کی اُلجھن کا نام نہیں۔
داروغہ : یہ بھی کسی کا کتنا فلسفیانہ قول ہے۔ اس سبب سے تو میں ذرا بُرے موسموں اور خراب حالات میں دوستوں سے ملا نہیں کرتا۔ ممکن ہے نادانستہ معاملات کی اُلجھن پڑ جائے اور دلوں کا بھید کھُلنے لگے۔
میر صاحب : میں سمجھ گیا۔ اچھا کہا جو مینہ پانی میں نہ آئے۔ آتے تو مجھے شرمندہ

ہونا پڑتا ۔

داروغہ : لیکن آپ تقریباً ہر صبح شام خصوصاً کھانے کے وقت ضرور یاد آتے تھے ۔

میر صاحب : شکر ہے کہ آپ کے ہاں میری یاد کا تو گزر تھا ۔ ورنہ کون کسی کو یاد بھی کرتا ہے ۔ مُنہ دیکھے کی دوستیاں رہ گئی ہیں ۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ۔ سامنے سے ہٹے اور بھول گئے ۔

داروغہ : اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون ۔ میر صاحب آپ اور ایسی کچھ پینڈیوں کی سی باتیں ۔ یارِ عزیز ! دوستی اور بھول چہ معنی دارد ؟ ہائے سچی دوستی کی عجیب وغریب خاصیتوں کو کسی نے سمجھا ہی نہیں معاف کرنا شاید تم دوستی کے نازک پہلوؤں اور زندگی کی شاعرانہ باتوں پر غور کرنے کے عادی نہیں ۔ ہاں بھئی ۔ خوب یاد آیا تمھارے بھتیجے نے کئی پہاڑی توتے منگائے ہیں اور مینا کا پنجرا بھی جا بہ جا سے خستہ ہوگیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ پنجرے تو خوب بنائے بڑے استاد ہو ۔

میر صاحب : ہاں تو اب چڑیا سے تو واقف ہو ۔ اُن کے لیے بنا رہا ہوں ۔ چھے بن گئے ہیں چار کا ڈول ڈال رکھا ہے ۔ دس ہو جائیں تو لے جاؤں ۔ اوزار نہیں کہ کام جلدی ہو ۔ بانس گٹھیلے ہیں ۔ رات دن میں بہ مشکل ایک پنجرا تیار ہوتا ہے

داروغہ : ہیں اوزار کیا ہوئے ؟ تمھارے پاس تو بڑے بڑے عمدہ چاقو اور چھُریاں تھیں ۔ مرزا بابر والی یشب کے دستے کی پیش قبض تو ایسی پر ہین تھی کہ کئی دفعہ میرے مُنہ میں پانی بھر بھر آیا ۔

میر صاحب : غضب کیا ۔ کیوں نہ لے لی ۔ پُرانی یادگار تھی ، تمھارے پاس تو رہتی ۔

داروغہ : پھر ہوئی کیا ۔

میر صاحب : ہوتی کیا ۔ بنیے کے پاس پہنچی اور بنیے نے کھیں اور سر کا دی ۔

داروغہ : کیا مطلب ؟ کیا بیچ ڈالی ۔ بڑی بے وقوفی کی ۔

میر صاحب : بے وقوفی کی یا عقل مندی ۔ اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا ۔ پیٹ کی مار بُری ہوتی ہے اور کسی کے آگے ہاتھ پسارنا اس سے بھی زیادہ بُرا ۔ تم جانتے ہو میرے پاس سونا نہیں چاندی نہیں ۔ یہی دو چار غدر پہلے کی چیزیں تھیں ۔ مرزا بابر والی پیش قبض ۔ خضر سلطان کا نیمچہ ۔ ایک ولایتی دہ پھل کا چاقو ، ان ہی

کی بدولت برسات ٹیر ہوگئی۔

داروغہ : کیا کہا خضر سلطان والا پنجہ بھی غارت کر دیا۔ ارے ایسی جوہر دار اصفہانی تلوار دیکھنے میں بھی نہیں آتی۔ عجب ناقدرے ہو۔

میر صاحب : جو کہو کم ہے۔ لیکن خدا نے آبرو رکھ لی۔ اب یہ بکیں گے۔ اللہ نے چاہا چھری چاقو سب خرید لوں گا۔

داروغہ : اللہ مبارک کرے مجھے تو بڑی خوشی یہ ہوئی کہ تم نے اپنا بُرا وقت چُپ چُپاتے گزار دیا۔ جان کا صدقہ مال۔ چیزیں گئیں بلا سے بات تو رہ گئی۔ خیر اب تم چاقو چھری کی تو فکر کرو نہیں۔ میرے پاس ایک شکاری چاقو ہے۔ کرنل صاحب نے دیا تھا۔ وہ ولایت سے لائے تھے۔ دستہ ٹوٹ گیا ہے۔ بچوں نے پتھر مار مار کر دانتے ڈال دیے ہیں۔ چاہے دھار لگوا لینا چاہے آری کا کام لینا۔ چیز اچھی ہو تو اس سے دو کام آسانی کے ساتھ لیے جا سکتے ہیں۔ بہر حال میں وہ تمھیں دے دوں گا۔ انعام کی چیز پھر کرنل صاحب کی تحفہ دی ہوئی۔ دینی تو نہیں چاہیے۔ مگر تم جیسے مخلص دوست سے کیا دریغ۔ جیسی میرے پاس رہی ویسی تمھارے پاس۔ سرکاری ملازم تو ضرور مجھے بے وقوف سمجھیں گے کہ انگریز بہادر کے عطیے کی میں نے قدر نہ کی تاہم میں دنیا کے اور لوگوں کی طرح نہیں ہوں میری رائے میں اس قسم کا ایثار ہی دوستی کی روح ہے۔

میر صاحب : لیجیے پنسدے بھی تیار ہیں۔

داروغہ : اچھا تو اب جانا چاہیے۔ بھئی تمھیں ہمارے سر عزیز کی قسم اپنے واسطے بھی رکھنا۔ لو خدا حافظ۔ لاحول ولا قوۃ۔ سدّو میاں کے پنجرے تو بھول ہی گیا۔ لایئے ساتھ ہی لوائے جاؤں۔ یہ کہتے ہوئے داروغہ جی نے اردلی کو آواز دے کر کہا چاروں پنجرے اٹھا لو میر صاحب ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ چپ اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے۔ نواب چڑیا کی فرمائش کے پنجرے۔ بڑی محنت و ریاضت سے تیار کیے ہوئے۔ کم سے کم دو دو روپے کی مالیت غریب ان دس روپوں میں خدا جانے کیا کیا امیدیں باندھے بیٹھے ہوں گے۔ مگر دوستی کا قدم درمیان تھا۔ دبی زبان سے بولے۔

میر صاحب : پانچوں آج ہی لے جاؤ گے۔ یہ نہیں کرتے کہ دو آج لے جاؤ۔ دو اگلے جمعے کو اور ایک اتوار کے دن۔ کچھ نواب چڑیا کے گھر بھی پہنچانے چاہییں۔

داروغہ : گاہک اور دوست کا فرق شاید تم بھول گئے۔ یہ میں اس لیے جتاتا ہوں کہ تمھیں پھر افسوس نہ کرنا پڑے۔ دوست کا ہاتھ روک کر ایک سچّے دوست کو ہمیشہ پچھتانا پڑتا ہے۔ ہماری دوستی بالکل مخلصانہ ہے۔ ضرور تمھیں کل رنج ہوگا کہ پانچ کی جگہ دو کیوں دیے۔ اور اب تو مجھے مانگنے کا حق بھی ہو گیا ہے۔ پوچھو کیوں؟ میں اتنے بڑے انگریز کرنل بہادر کا انعام میں دیا ہوا چاقو بھی تو تم کو دوں گا۔ بُرا نہ ماننا، اجی بے ریا دوستوں میں بُرا ماننے کی رسم ہی نہیں ہوتی۔ چاقو انگریز کا دیا ہوا جاگیر سے بڑھ کر سمجھو۔ ممکن ہے میرا خیال غلط ہو۔ لیکن دوستی اور پھر سچّی دوستی میں اس قسم کی خود غرضی کا دخل نہ ہونا چاہیے۔

میر صاحب : قصور ہوا۔ معاف کرو۔ میں کب ہاتھ پکڑتا ہوں۔ یہ ڈول پڑے ہوئے بھی تیار ہوتے ہی پہنچا دوں گا۔ دوستی کے مقابلے میں پنجرے بھی کوئی حقیقت رکھتے ہیں۔ بھلا میں اپنے دوست کے آبگینۂ دل کو ٹھیس لگا سکتا ہوں۔

پھر دونوں بڑے تپاک سے گلے ملے۔ داروغہ جی پنجروں سمیت اپنے گھر کی طرف روانہ اور میر لوٹ کر کھانا کھا، مسجد گئے اور وہاں سے آکر سونے کے لیے پلنگ پر دراز ہوئے۔ سچّی ذہنیت، سچّی ملنساری تھی۔ داروغہ کی باتوں کا رات بھر خواب دیکھتے رہے۔ آنکھیں بند ہوتے ہی چاقو سامنے تھا۔ کبھی تلوار بن گیا۔ کبھی خنجر کی صورت اختیار کرلی۔ کبھی تبر سا چلتا دیکھا، کبھی آری کی طرح بانسوں کی پوریاں اُڑاتا نظر آیا۔ چاقو کیا تماشا ہو گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو چاقو کا تصوّر موجود۔ نماز پڑھتے ہیں بھی یہی خیال کہ داروغہ واقعی کتنا اچھّا دوست ہے۔ ایسا چاقو جو اُن کے انگریز افسر نے دیا ہے۔ اس طرح دے دینا معمولی بات ہے پنجرے لے گئے تو کیا ہوا چاقو بھی تو دے گا، اور چاقو بھی کیسا! آری کی آری۔ اب کیا ہے ایک ایک دن میں دو دو پنجرے لے لو۔

نماز سے فارغ ہو کر میر صاحب گھر آئے۔ پتّی کو پتھر چٹایا۔ دھار درست کی۔ بانس چھیلنے شروع کیے۔ اتنے میں خاصا دن نکل آیا۔ تیلیاں بناتے جاتے اور نامکمل پنجروں پر نظر ڈالتے تھے کہ داروغہ جی ہواخوری کرتے ہوئے آدھمکے۔

داروغہ : میر صاحب کیا ہو رہا ہے؟

میر صاحب : تشریف لایئے! تعظیم کاری گراں معاف۔
داروغہ : پنجرے بن رہے ہیں۔ بھئی سدّو کہیں سے کبوترے آیا ہے بڑی مصیبت ہے۔ اب تو اُن کے لیے جال ہے نہ کابک۔
میر صاحب : پنجرے تو کبوتروں کے ہوتے نہیں۔
داروغہ : یہی میں بھی کہتا ہوں۔ جال بن جاتا تو اچھا تھا۔ تم سے بہتر کون جال بنا سکتا ہے۔
میر صاحب : مگر مجھے تو شام تک ان پنجروں کو پورا کرنا ہے۔
داروغہ : ہاں بھئی روزی کا معاملہ ہے لیکن ذرا سوچو تو میں نے تمھیں چاقو چھری وغیرہ سے کیسا بے نیاز کر دیا ہے۔ ایسی چیز دینا چاہتا ہوں جو ایک ہی وقت میں سارے آلات کا کام دے۔ اور دو چار روپوں کی خاطر اپنی اور اپنے دوست کی خوشی پر لات مار رہے ہو۔ ہوگی یہ بے مروّتی۔ آگے تم جانو۔ بچہ تمھیں چچا کہتا ہے وہ کیا کہے گا۔
میر صاحب : میں اور تمھارے ساتھ بے مروّتی۔ بھاڑ میں جائے روزی۔ دوست کی خوشی میں روزہ اچھا۔ اچھا آپ کے ہاں بالنسوں کے ٹکڑے بھی ہیں۔
داروغہ : یہ آپ کے بانس کس کام آئیں گے؟ انھیں اٹھا کر لیے چلو۔
میر صاحب : انھیں اگر کبوتروں کے جال میں لگا دیا تو پنجرے رہ جائیں گے۔
داروغہ : پنجرے اچھے ہیں یا میاں سدّو کا شوق؟ ہاں خوب یاد آیا۔ ہمارے ماموں شہزادوں کی تکلیں بنایا کرتے تھے۔ اس وقت کے بچے ہوئے بہت سے بانس پڑے ہوئے ہیں۔ بانس بھی پوریئہ کے جس کی خدا جھوٹ نہ بلوائے گز گز بھر کی پوری ہوتی ہے۔ سمجھ لو بادشاہی تکلوں کے ٹھڈے اور کانپیں بنا کرتی تھیں۔ یوں تو اُن کا مول کیا لیکن میں وہ سارے کے سارے بانس تمھیں دے دوں گا۔ وہ نفیس پنجرے بنیں کہ آدمی دیکھا کرے۔ چلو اٹھاؤ۔ اس کوڑے کو وہاں لگا دو۔ اور پوریئہ والے بانس آتے وقت لیتے آنا۔ نہ کہنا لیا چیز دی ہے۔ یہ سب دوستی کے پھل ہیں۔

میر صاحب بالکل سادہ لوح۔ خوشی خوشی کھڑے ہو گئے۔ بانس کپچیاں وغیرہ اُٹھا داروغہ جی کے ساتھ ہو لیے۔ گھر پہنچ کر داروغہ جی نے پردہ کرایا، کوٹھے پر لے گئے، جال باندھنے

کی جگہ بتائی اور یہ کہ کر کوتوالی روانہ ہوئے کہ شام سے پہلے پہلے ٹھاٹر تیار ہو جائے۔عورتوں کو پردے میں تکلیف ہوگی۔ کام میں سُستی کی تو دوستی میں فرق آنے کا اندیشہ ہے۔

غریب سیّد بیگاریوں کی طرح جُٹ گئے۔ اور بھوکے پیاسے شام تک کام کرتے رہے۔ نہ گھر میں کسی نے پوچھا، نہ داروغہ جی آکے پھرے۔ اندھیرا ہو چلا تو داروغہ جی آکر فرماتے ہیں "ارے ابھی تک دروازہ بھی نہیں لگا۔ بڑے سُست ہو خیر! تمھیں ابھی کھانا بھی پکانا ہوگا۔ کل دیکھا جائے گا۔ اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تمھاری عادت بگڑ جائے گی تو دونوں دوست مل کر کھانا کھا لیتے۔ لیکن میں ایسا دوست نہیں کہ دوست کی عادت بگاڑوں۔ اس کے علاوہ یاد رکھو جہاں ایسی چھچھوری چیزیں درمیان میں آنے لگیں دوستی نہیں رہتی" میر ٹوٹی کمر سیدھی کر کے باہر نکلے۔ اور سلام علیک کر کے چلنے ہی کو تھے کہ داروغہ جی نے حاکمانہ لہجے میں کہا۔

داروغہ : کیسے آدمی ہو، پوری بات ہوئی نہیں اور منہ اٹھا کر چلے۔ میاں اتنا خیال نہیں کہ میں کرنل صاحب والا چاقو اور پودینہ کے بانس دینے والا ہوں۔

میر صاحب : بھئی میں تو سیدھا مسلمان ہوں اور "رشتہ در گردنم افگندہ دوست" کا قائل۔ اچھا فرمایئے۔

داروغہ : (نرم لہجے میں) میر صاحب "ناز براں کُن کہ خریدار تست" آپ نے سُنا ہوگا۔ دوست، دوست ہی پر دل کا بخار نکالتے ہیں دشمنوں سے کیا سروکار۔ دیکھنا دو پہاڑی کوّے ایک جگہ سے آ گئے ہیں، کس شان کے بتاؤں۔ قلعہ نہ رہا۔ بادشاہ نہ رہے، اور ہمارے ہاں ایسے شاہ پسند جانوروں کی کیا قدر۔ ذرا اپنے نواب چڑیا کو دکھا دیتے۔

میر صاحب : ہاں اُن کی نظر پہ چڑھ گئے تو ضرور خرید لیں گے۔

داروغہ : پھر لپک جاؤ۔

میر صاحب : اس وقت ؟

داروغہ : چہ خوش! اور کیا قیامت کو؟ میں نہیں جانتا کہ دوستوں میں محبت کہاں تک جائز ہے۔ بے غرض دوست تو بے کہے دوست کے کام پر دوڑ جاتے ہیں۔ دیکھو چاقو اور پودینہ کے بانس میں نے تمھارے لیے الگ رکھ چھوڑے ہیں۔

میر صاحب دن بھر کے بھوکے، تھکن سے چور، جی میں تھا کہ کھانا پکانے کا سودا لیتے ہوئے گھر جائیں گے۔ کمائی تو گئی داروغہ جی کے اٹنگے میں چولھا تو چل کر گرم کریں۔ مگر داروغہ جی کب چھوڑتے تھے۔ دوستی بلائے جان ہوگئی۔ جواب دیتے ہیں تو بات بیں فرق آتا ہے۔ دوست کی ہر چیز مشترک ہوتی ہے۔ داروغہ جی کا یہ فلسفیانہ مقولہ اُنھیں یاد تھا۔ پھر دوستی بیں یہ کچھ نئی مصیبت نہ تھی۔ داروغہ جی ہمیشہ یوں ہی ستایا کرتے اور پھر یہ بچارے دوستی بیں مارے جاتے۔ بہرحال قہرِ درویش بجانِ درویش، میر صاحب کوّے لے کر چلے۔ نری گاودی نہ تھے کہ سر جھاڑ مُنہ پہاڑ سیدھے نواب چڑیا کے پاس جا پہنچتے۔ پہلے اپنے گھر گئے۔ مُنہ ہاتھ دُھوئے اُجلے کپڑے پہنے۔ ایک پنجرا کسی کا مرمّت کا آیا ہوا تھا اُس بیں دونوں کوّوں کو ڈال اور پنجرے پر سفید رومال کی بستنی سی چڑھا، خراماں خراماں نواب چڑیا کو جا سلام کیا۔ وہاں اکثر پرانی وضع کے لوگ جمع رہتے تھے۔ میر صاحب کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ پوچھا گیا "پنجرے بیں کیا ہے؟" میر صاحب کم سخن، جھوٹ سے نفرت، دبی زبان سے بولے "قاف کے کوّے انھیں کہتے ہیں"۔ بگڑی ہوئی دولت کا دربار تھا۔ اُٹھ اُٹھ کر لوگ دیکھنے لگے۔ تعریفیں شروع ہوگئیں۔ نواب صاحب کو پسند آ گئے۔ حکم دیا کہ میر ٹوٹرو کو سَو روپے گن دو، اور دس روپے الگ دے کر فرمایا کہ ان پرستان کے جانوروں کے لیے پنجرا ابھی بنا کر لاؤ۔

رات کے گیارہ تو بج گئے مگر میر ٹوٹرو نے سودا اچھا کیا۔ دکانیں اب کہاں کھلی تھیں کہ پکانے کا سامان لیتے۔ بھوکے گھر پہنچے۔ خوش تھے کہ دوست کا کام بھی خوب ہوا اور پنجروں کی سائی بھی اچھی ملی۔ پلنگ پر بچھونا کیا اور لیٹ کر یہ خیال کرتے کرتے کہ "آج کا دن بڑا بُرا گزارا۔ لگاتار محنت اور پورے چوبیس گھنٹے کا فاقہ تاہم اچھا ہوا۔ محنت کے بعد آرام مل سکتا ہے۔ کھانا آج نہ ملا تو انشاء اللہ کل ملے گا۔ دوست کا دل اگر لوٹ جاتا تو کس طرح جڑتا؟ داروغہ جی اپنے کو میرا دوست کہتے ہیں۔ میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ میں ان کا کہنا نہ مانتا تو غالباً عمر بھر مجھے افسوس رہتا۔ سو گئے۔ تھکا ہوا جسم اور دیر بیں سوئے تھے۔ سویرے آنکھ بھی نہ کُھلی۔ نماز بھی

بھی قضا ہوگئی

داروغہ جی تمام گنوں میں پورے تھے۔ دوسروں پر اعتبار جماتے اور آپ کسی کا اعتبار نہ کرتے۔ میر ٹوٹرو کو کتوں کا جوڑا بیچنے کو دیا تھا رات بھر خیال رہا کہ مفلس آدمی کی نیت کا کیا اعتبار بیچ میں سے کچھ کتر لیا تو خواہ مخواہ جھیں جھیں ہوگی۔ سیکڑوں قسم کی بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ خدا خدا کرکے صبح ہوئی کوئی پانچ سو قدم کے فاصلے پر دو گلیاں بیچ تو میر صاحب کا مکان ہی تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے جا پہنچے۔ اتفاق سے میر ٹوٹرو کنڈی لگانی بھول گئے تھے۔ کواڑوں پر جو ہاتھ مارا تو چوپٹ۔ دیکھا تو میر صاحب خرّاٹے لے رہے ہیں۔ ڈھیلا زمین پر زور سے مار کر کہنے لگے "سستی کا دوسرا نام بدنصیبی ہے۔ میں کہتا ہوں نحوست کے سر پر سینگ تو نہیں ہوتے۔ میں جتنا چاہتا ہوں کہ تم زیادہ محنت کرو، اسی قدر تم کاہل ہوتے جاتے ہو۔ نواب چڑیا کے ہاں رات کو کیا گئے کہ صبح کی نماز بھی غائب۔ مجھ سے کم از کم یہ برداشت نہیں ہوسکتا کہ تم میرے دوست ہوکر نماز نہ پڑھو۔ خدا تمھیں مسجد میں بلائے اور تم پلنگ پر پڑے ہوئے اینڈو۔ خدا کے ساتھ تمھارا جب یہ معاملہ ہے تو بندے کیا سمجھیں۔ تم ہی ایمان سے کہو ایسا آدمی دیانت دار اور امانت کے قابل ہوسکتا ہے۔ کم اوقات، بے آس اولاد، اوپر سے بے نمازی کام چور، میں اعتبار نہ کروں تو کیا گلہ۔ اور شک کا سبب بھی ظاہر ہے۔ کتوں کی قیمت تمھیں رات ہی پہنچانی چاہیے تھی۔ رات نہ سہی صبح ہی میرے پاس پہنچتے۔ تم نے مجھے بدگمانی کا موقع دیا۔"

میر صاحب : تمھاری ملامت سر آنکھوں پر۔ کیا کہوں کم بخت آنکھ ہی نہیں کھلی۔

داروغہ : بُرا نہ ماننا تمھیں سمجھانے کو یہ بُری بھلی باتیں کہ رہا ہوں۔ اگر رقم کا معاملہ نہ ہوتا تو شاید میں اتنا صاف نہ کہتا۔ لیکن دوستی کس مصرف کی اگر دوست سے دل کی بات نہ کہ سکے۔ جھوٹ موٹ تعریف کرنا، ریاکاری، مکاری اور خوشامد سے آپ ایسے اور آپ ڈبل پیسے کہتے رہنا کیا مشکل ہے۔ مردوں کا کام تو ہمیشہ کھری کھری سُنانا ہے بلکہ سچے دوست کی بڑی نشانی یہی ہے کہ وہ ہمیشہ کڑوی ہی باتیں کہے گا۔ یوں کہ دوست، دوست کو نیکی کی راہ پر چلانا چاہے گا اور نیکی کی راہ تم جانتے ہی ہو کہ خاردار ہوتی ہے۔

میر صاحب : (سَو روپے کوّوں کی قیمت دے کر) مجھے تو ان کا بڑا خیال رہا۔ اکیلا گھر چوری چکاری کے دن۔ وہ تو کسی کو کیا خبر کہ آج میر کے ٹینٹے میں تھیلی اُڑسی ہوئی ہے۔

داروغہ : لیجیے پانچ نہ دس لکھے سو روپے۔ تم نے تو دوستی کے نام کو قیامت تک کے لیے بٹّا لگانا چاہا تھا۔ وہ تو خدا نے خیر کر لی۔ تم نے تو جیتے جی مرجانے کی صلاح کرہی لی تھی۔ نادان کی دوستی اور جی کا جنجال اسی کو کہتے ہیں۔ مردِ خدا سَو روپے لے کر وہ بھی پرائے اس طرح دُھت پڑے سویا کیے۔ کواڑ تک بند کرنے کا ہوش نہ آیا۔ کم از کم نماز ہی کے بہانے سے لوگوں کے جاگنے سے پہلے تو اُٹھ بیٹھتے۔ میاں تقدیر کے اچھے تھے ورنہ میری بے لاگ دوستی کا تقاضا شاید کیا ضرور یہ ہوتا کہ میں تمھیں حوالات میں بند کر دیتا۔ پوچھو کیوں؟ تمھیں بہت سی ان بُرائیوں سے بچانے کے لیے جو دوزخ میں جھونکنے والی ہیں۔

میر صاحب : سچ کہتے ہو، واقعی رات کو تو میں کچھ ایسا بے سُرت ہوا کہ کیا کہوں۔ اللہ نے بڑا کرم کیا۔ ناک کٹنے میں کسر ہی کیا رہی تھی۔ اگر ایسی ویسی ہو جاتی تو کیا میں منہ دکھانے کے قابل رہتا؟

داروغہ : اجی چھپ کر کہاں جاتے۔ ہاں ہوتی بُری۔ خیر، رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت، تو اب کب تک پڑے رہو گے۔ چل کر پہلے جال تو پورا کر دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کبوتر بلیوں کے نوالے ہونے لگیں اور یہ ایک نیا عذاب تمھاری گردن پر پڑے۔

میر صاحب : تم چلو میں آتا ہوں۔ مچھلی کو جی کئی دن سے چاہ رہا ہے۔

داروغہ : مچھلی، بھئی کیا چیز یاد دلائی ہے اور پھر تمھاری پکائی ہوئی۔ مگر دو سیر تو ہو تمھاری بھاوج روکھی کھاتی ہیں۔

میر صاحب : دو سیر لو۔

داروغہ : اچھا میں چلوں، جلدی آنا۔ آج جال پورا کر دینا ہے۔ اور دیکھنا جال میں جو سامان لگے اُسے نہ بھولنا۔ دوست کا کام ہے۔ پھر دوست بھی ایسا جو تم سے کرنل صاحب کا چاقو اور شاہی تُکلوں کے بانس تک سے دریغ نہیں کرتا۔

میر لوٹڑو مچھلی لائے، دو گھنٹے اس کے پکانے میں لگے۔ اس کے بعد جال کے لیے ضروری سامان۔ کوکے، گنڈی، چھپکے وغیرہ خریدے اور لدے پھندے داروغہ جی کے ہاں پہنچے۔ اور باقی سارا دن جال کا کام کیا۔ اِدھر جال تیار ہوا اُدھر داروغہ جی آئے۔

داروغہ : کیوں بھئی جال تیار ہو گیا؟

میر صاحب : دیکھ لو کیسا نایاب بنا ہے۔

داروغہ : ایک بات میں عجیب دیکھتا ہوں۔

میر صاحب : وہ کیا؟

داروغہ : وہ یہ کہ آدمی کو اپنے کام کی بہ نسبت دوسروں کا کام کرنا زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے مگر یہ صرف دوستی کی برکت ہے۔

میر صاحب : (ماتھے سے پسینا پونچھتے ہوئے) جی تو یہ چاہتا ہے کہ دوستی کے متعلق تم باتیں کیے جاؤ اور میں سُنے جاؤں۔ تمھارے جیسے خیالات کبھی میرے بھی ہو سکیں گے؟

داروغہ : (مسکرا کر) کیوں نہیں، وہ دوست کیا جو دوست کو اپنے جیسا نہ بنالے۔ آہستہ آہستہ سب باتیں سیکھ جاؤ گے۔ ذرا توجہ سے سُنا کرو۔ اور عمل سے جان نہ چراؤ۔ البتہ تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں گی ابھی دوستی قائم رکھنے کی عادت پڑی ہے۔ کسی دن یہ اصول بھی عقل میں آجائیں گے۔

میر صاحب : میں آپ کی دوستی سے باہر کب ہوں؟

داروغہ : بس تو اب تم اپنے گھر جاؤ۔ سارے دن کے تھکے ہوئے ہو۔ آرام کرو۔ کل سے تمھیں میاں سندو کے کبوتروں کی دیکھ بھال کرنی ہے۔

دوستی کا اخلاص درمیان تھا۔ میر لوٹڑو کیا جواب دیتے چپ ہو گئے اور دوسرے دن سے پنجروں و نجروں کا دھندا بالائے طاق رکھ صبح ہی سے داروغہ جی کے گھر موجود ہوتے۔ جال صاف کرنا، دانا ڈالنا، پانی دینا، انڈے بٹھانا، شام تک یہی شغل رہتا۔ نہ کھانے کے رہے نہ پکانے کے اور داروغہ جی کی کڑوی کسیلی باتیں سُنتے سو الگ۔ چند دنوں میں میر صاحب اپنے آپ کو ایک قسم کا بندھوا محسوس کرنے لگے۔ کیونکہ ان کی آزادی میں فرق آگیا۔ اُنھیں بڑا غم یہ تھا کہ اُن کے گاہک کیا سمجھیں گے۔ نواب چڑیا کو کہیں شبہہ نہ ہو جائے کہ سید اُن کے روپے کھا گئے۔ اور لوگ ان کی دیانت داری پر الزام نہ لگانے لگیں۔ لیکن

پھر دل ہی دل میں وہ اپنے آپ کو تسلّی دے لیا کرتے کہ آخر دُنیا میں ایک مخلص دوست تو ہے اور کیسا فیّاض دوست جو میری خاطر لوگوں میں نکّو بن گیا ہے۔ میں جانتا ہوں آج اگر نہیں تو کل ہماری یہ بے تکلف دوستی کہانیوں میں کہی جائے گی۔

قصّہ مختصر سنگ دل اور خود غرض داروغہ میر لوٹرو کی ایسی جان کو آیا کہ رات دن چین نہ لینے دیتا۔ مگر یہ حماقت کے پتلے ہر حال میں فرماں بردار تھے۔ بعض ملنے والوں نے انھیں جتایا بھی کہ "حضت ایسی دوستی پر لعنت بھیجو۔ آخر اس خدمت کا کوئی صلہ بھی۔ اس سے تو کسی کے مرید ہی ہو جاتے۔ اللہ سے ملنے کا تو کوئی ذریعہ ہوتا۔ داروغہ نے تو تمھیں نہ دنیا کا رکھا نہ دین کا۔" میر صاحب کیا سننے والے تھے۔ دُھن کے پکّے۔ سمجھتے کہ لوگ ہماری دوستی پر رشک کرتے ہیں۔ مدّت العمر میں ایک دوست ملا ہے۔ اس سے بھی چھڑانا چاہتے ہیں۔

اسی حال میں مہینوں گزر گئے۔ جاڑا آیا اور جاڑے کے ساتھ مہاوٹیں برسنے لگیں۔ میر صاحب کے پاس نہ جڑاول نہ ٹھنڈی ہواؤں سے بچنے کا سامان۔ رات آئی گھر کا کوڑا سمیٹ کر الاو لگا لیتے اور تاپ تاپ کر صبح کر دیتے۔ ایک دن سرِ شام اولوں کی کئی چھالیں پڑیں۔ ایسی ٹھر کہ اللہ کی پناہ۔ کوئی نو بجے ہوں گے کہ میر لوٹرو کوٹھری میں بیٹھے کانپ رہے ہیں۔ کواڑ کا ایک سیلا ہوا ٹکڑا دُھواں دے رہا ہے۔ کہ بڑے زور سے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ بغلوں میں ہاتھ دیے ہوئے میر لوٹرو اُٹھے دیکھا تو داروغہ جی۔

میر صاحب : دوست اس سردی میں کہاں؟

داروغہ : بھئی کچھ نہ پوچھو بڑی مصیبت میں ہوں۔

میر صاحب : یا اللہ! خیریت تو ہے؟

داروغہ : سدّد کے کبوتروں کا ستھراؤ ہو گیا۔

میر صاحب : کیا اولوں کی جھال جال کے اندر پہنچ گئی۔

داروغہ : جی نہیں ایک کالا بِلاؤ گھس گیا ہے۔

میر صاحب : کالا بِلاؤ؟

داروغہ : ہاں تمھاری بھاوج کہتی ہیں کہ کوئی جن ہے۔ بلّے کی کیا مجال کہ اتنے کبوتروں کا خون کر ڈالے۔

میر صاحب: بھئی کہتے تو سچ ہو پھر؟
داروغہ: جمنا کے پار سُنا ہے کوئی فقیر جنی آئے ہوئے ہیں۔ اُن کو بُلا لائیں تو یہ آفت ٹلے۔ اندھیری رات، سردی کی یہ شدّت۔ دوسرے میرا گھر پر رہنا بھی ضروری ہے۔ بال بچّوں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ میری بجائے تم بھی تو جاسکتے ہو۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔ دوستی آخر عاقبت میں تو کام آنے سے رہی۔ اس کے علاوہ میں نے کرنل صاحب والا چاقو اور پوریئہ کے بانس دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ایسے عجیب تحفوں کے مقابلے میں اتنا کام کیا حقیقت رکھتا ہے۔
میر صاحب: (باوجود سردی سے ٹھٹھرے ہوئے ہونے کے اکڑ کر) کیوں نہیں ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی

مرنا ایک ہی بار تو ہے۔ گھڑی گھڑی تو موت آنے سے رہی۔ میں ابھی جاتا ہوں۔ فقیر جنی آ بھی جائیں گے؟
داروغہ: نہ آنا کیا معنی؟ میرا نام لینا۔ فقیر ہے یا بادشاہ۔ مقدور ہے کہ نہ آئے۔ اور نہ آیا تو تمھاری دوستی کس کام آئے گی۔
میر صاحب: اچھا تو اپنی قندیل مجھے دے دو۔ اندھیری رات دور کا جانا۔ پھر رستے میں کیچڑ پانی۔
داروغہ: واہ صاحب واہ۔ نئی قندیل ہے۔ اوے پڑنے لگے یا تم ہی کہیں گڑھے وڑھے میں جا پڑے تو چورا ہو جائے گی۔ تم تو اٹکل سے بڑے بڑے مرحلے طے کر جاتے ہو۔ ایسی بات کیوں کرو کہ دوست کا نقصان ہو اور تمھیں شرمندگی۔
میر صاحب: ہاں ہاں۔ دریا کے پار جاتے ہوئے تو قندیل چھوڑنی ہی پڑے گی۔ اُسے لیے لیے تو تیرنا ممکن نہیں۔

میر صاحب بڑی مستعدی سے ایک پھٹا ہوا کمبل جسم سے لپیٹ اور لکڑی ہاتھ میں لے چل پڑے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ بوندا باندی جاری۔ ہوا کے سناٹے اور یہ منحنی سے آدمی اُڑے چلے جاتے ہیں۔ پہاڑ گنج سے سیدھے جامع مسجد اور جامع مسجد سے قلعے کے نیچے نیچے فصیل کی کھڑکی سے اُتر دریا پر جا پہنچے۔ اتنا لمبا اور کیسا کٹھن سفر، دوستی کا خبط

اگر نہ ہوتا تو انسانی طاقت ہیچ تھی۔ دریا کو دیکھ کر میر لوٹرو کو پھریری آئی۔ ہچکچائے کہ اس سردی اور پانی میں اتر کر پار جانا۔ لیکن دوستی سے کس طرح ہاتھ اُٹھاتے، جان جائے بلا سے آن میں فرق نہ آئے۔ بسم اللہ مجریہا و مرساہا کہہ کر دھم سے جمنا میں کود پڑے۔ اُن دنوں دریا آج کل جیسا نالا نہ تھا پوری ندی تھی۔ گھاٹ کے ایک چوکیدار نے کسی کو دریا میں کودتے، تھوڑی دُور تک ہاتھ پاؤں مارتے اور پھر غوطے کھاتے ضرور دیکھا مگر وہ کیا جانتا تھا کہ آدھی رات کے وقت میر لوٹرو داروغہ جی کی دوستی کے شہید ہوں گے۔ صبح ہوئی تو شاہ بڑے کے آنے جانے والوں نے کانس میں اُلجھی ہوئی ایک لاش دیکھی اور دو چار نے پہچانا بھی۔ میر لوٹرو کا خالی پنجرا رہ گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں چرچا ہو گیا۔ بڑی دھوم سے جنازہ اُٹھا۔ سچ یہ ہے کہ داروغہ جی کی بدولت میر لوٹرو کی آج تک کہانی کہی جاتی ہے۔

بیرجی کوّے

بیرجی کوّے جو آج بگلا بھگت بنے ہوئے نبی کریم کے قبرستان میں رہتے ہیں، کبھی بڑے حضرت تھے۔ بدمعاشی کا کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں یہ اُستاد نہ ہوں، لیکن آج، کل جیسے یار مار، بے مروّت اور عزیزوں کو ستانے والے نہیں بلکہ اصلی معنوں میں شریف ڈاکو۔ ان کی ساری زندگی ٹٹول ڈالیے، کسی دن جو کسی کمزور پر طاقت آزمائی ہو جہاں رہے سارے محلّے کی حفاظت کی، بےکسوں کے والی وارث رہے، پیٹ بھروں کو لوٹا اور بھوکوں کو بھرا۔ جس نے چچا کہا وہ ہمیشہ کے لیے بھتیجا ہو گیا۔ جسے انھوں نے بھانجا بنا لیا عمر بھر کے لیے وہ بھانجا تھا۔ بیسوں بگڑے ہوئے گھر بنا دیے۔ مجال تھی کہ ان کی جان پہچان والوں کا کوئی لڑکا بدچلن یا آوارہ ہو جائے۔

بات یہ تھی کہ جس زمانے میں انھوں نے ہوش سنبھالا معیارِ شرافت کچھ اور تھا۔ اس دور کے ہر شخص میں ایک وضع داری تھی۔ جسے دیکھو عہد کا پکا۔ قول کا دھنی۔ آن کے آگے جان کو قربان کرنے والا۔ چوروں، جواریوں، ڈاکوؤں کے دستور بھی نرالے تھے۔ بیرجی کوّے کا لڑکپن انتہائی بدچلنی میں گزرا۔ باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ رانڈ کے سانڈ بنے پھرتے۔ ہندستانیوں کی بڑی محبت یہ ہے کہ لڑکا ذرا جوان ہوا اور بہو لانے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ اس سے واسطہ نہیں کہ بیٹے کے ڈھنگ کیسے ہیں۔ پرائی بیٹی کو کون کھلائے گا۔ چنانچہ ممتا کی ماری ماں نے آنکھیں بند کر کے ان کی شادی بھی کر دی۔ خیال تھا کہ بیوی کا بوجھ پڑے گا تو بیٹے صاحب چار پیسے کمانے کی سبیل کریں گے لیکن وہاں کیا

پروا تھی۔ خدا دے کھانے کو تو بلا جائے کمانے کو۔

اس کے بعد کیا دھرا تھا، جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ ماں بچاری کو لوچنا کھسوٹنا اور اس کا گلا گھوٹنا تو عادت تھی۔ بیوی پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ مگر یہ کام آسان نہ تھا۔ اس کے میکے والے رتی رتی کی خبر رکھتے تھے۔ ان کی بدعنوانیوں کی اطلاع ملتے ہی سارا کنبہ چڑھ آیا۔ خوب تھکّا فضیحتی ہوئی۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ دُلھن اپنے میکے چلی گئی۔ ادھر ماں نے تنگ آکر صاف کہہ دیا کہ "بیٹا مار یا جلا اب میں ان حرکتوں کی روادار نہیں۔ برادری میں ناک کٹ گئی۔ میرے پاس کھانے کو ہے نہ کھلانے کو۔"

بیٹا: کوئی روزگار نہ ہو تو میں کیا کروں؟

ماں: تمھارے ہی لیے روزگار کو بھی آگ لگ گئی۔ دنیا آخر دھندے سے لگی ہوئی ہے۔ اور کچھ نہیں تو ٹوکری ڈھونے لگو۔

بیٹا: ٹوکری تو مجھ سے نہیں ڈھوئی جاتی۔

ماں: ٹھوسنا آتا ہے۔

بیٹا: تم کو میری صورت بری معلوم ہوتی ہے تو میں اپنا مُنہ ہی کالا کر لوں گا۔

ماں: مگر کچھ کروگے نہیں۔ جوان جورو اور بڑھیا ماں کو چھوڑ کر دربدر کی ٹھوکریں کھانی ہے تمھاری قسمت میں ہیں، تو جاؤ مُنہ کالا کرو۔ میں سمجھوں گی کہ جہاں تمھارے باپ مر گئے تم بھی مر گئے۔

مثل مشہور ہے کہ بوڑھا ڈرائے مرنے سے اور جوان ڈرائے بھاگنے سے۔ میاں کلو جو آگے چل کر اپنی سیاہ رنگت کی وجہ سے پیر جی کوّے مشہور ہوئے، تیہے میں آ گھر سے نکلے۔ اس دور میں دِلّی والے بالکل بے غیرت نہ تھے۔ نکھٹّو سے نکھٹّو اور بدمعاش سے بدمعاش بھی ناک والا تھا انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ اب دلّی میں رہنے والے پر بھی تین حرف، دیس چوری پردیس بھیک۔ جدھر سینگ سمائے چل نکلو۔ گرمی کا موسم تھا اور عشا کا وقت۔ اندھیری رات۔ محلّے والوں سے بچتے بچاتے چلے کہ شکرموں کے اڈے پر جا کر جو پہلے جائے اسی میں بیٹھ لیں۔ گلی کے نکڑ پر پہنچے تھے کہ مرزا نبّو بازار کی طرف سے آتے دکھائی دیے۔ مرزا نبّو کی شخصیت بھی عجیب دعزیب تھی۔ جوانی بھر دُنیا کے بڑے سے بڑے کرم کیے۔ مدّتوں پولیس کے ہاتھوں دیس پردیس بھاگتے پھرے۔

بڑھاپا آیا تو مُلّاجی بنے ہوئے وطن آئے۔ ماتھے پر گٹّا۔ لمبی ڈاڑھی۔ پانچوں وقت کے نمازی۔ جب دیکھو تسبیح ہاتھ میں لیکن ان کا گھر جوئے کا پورا اڈّا تھا۔ بڑی بڑی دُور سے جواری آتے اور روزانہ رات کے دس بجے سے صبح تک پھڑ جمی رہتی۔ ہزاروں روپے اِدھر سے اُدھر ہو جاتے۔

محلّے میں ان کا رعب بھی بہت تھا۔ چھوٹے بڑے سب ان کو دیکھ کر تھرّا جاتے۔ میاں کلّو اپنی شوریدہ سری سے محلّے میں سانڈ مشہور تھے ہر شخص اُن سے گھبراتا مگر مرزا نبّو کی صورت ان کے لیے بھی ہوّا تھی، کیا مجال کہ آنکھ ملا کر بات تو کرلیں۔ دیکھا اور کنّی کاٹی، چنانچہ یہ منہ چھپا کر نکلنا ہی چاہتے تھے کہ مرزا نبّو کی نظر پڑ گئی۔ پڑوس میں گھر تھا۔ واقعات کی خبر۔ دوسرے میاں کلّو کی ماں بہن بنی ہوئی تھیں، کوئی بات چھُپی کیسے رہتی۔ تاڑ گئے کہ اس وقت معمول کے خلاف محلّے کا بچّہ کہاں چلا ہے۔ کھنک کے آواز دی "اے اندھیری رات میں کدھر جانا ہے؟"

کلّو : (سہمی ہوئی آواز میں) ماموں ذرا یوں ہی نکل آیا تھا۔

نبّو : کیوں ہم سے بھی اڑان گھائی۔ اِدھر آ۔

کلّو : (قریب آکر) آج ابھی سے ساری دُکانیں بند ہوگئیں۔

نبّو : یہ پوٹلی بغل میں کیسی ہے؟

کلّو : (گھبراکر) میلے کپڑے ہیں۔

نبّو : دُھت۔ لگاؤں چھانپڑ جھوٹ بولتا ہے۔

کلّو : (خاموش)۔

نبّو : گھنّی کیوں سادھ لی۔ مُنہ سے پھوٹ۔ سرِ شام کہیں سے ہاتھ مارا یا رستہ چلتے کسی کا مال اُچکایا؟

یہ کہتے ہوئے مرزا نبّو میاں کلّو کی طرف بڑھے کہ پوٹلی چھینیں۔ دیکھا تو آنسو جاری ہیں۔

نبّو : ہائیں۔ روتا ہے۔ ایسا بودا تھا تو چوری کیوں کی؟

کلّو : (روتے ہوئے) ماموں چوری نہیں کی۔

نبّو : پھر یہ کیا ہے؟

کلّو : میرے کپڑے ہیں۔
نبّو : کپڑے کیسے؟
کلّو : پہننے کے۔
نبّو : اچھّا انھیں لے کر چلا کہاں؟
کلّو : جہاں خُدا لے جائے۔
نبّو : کیا گھر چھوڑ کر بھاگ رہا ہے؟ جوان جورو اور بڑھیا ماں کس کی جان کو روئے گی؟
کلّو : (چُپ)۔
نبّو : ابے زبان کس نے کیل دی۔
کلّو : پھر یہاں کروں کیا؟
نبّو : اتنے بڑے شہر میں تجھے کوئی دھندا ہی نہیں۔ ابے تُو تو مُنہ کالا کر جائے گا، مگر تیری سسرال والے کیا کہیں گے کہ مرزا نبّو کے محلّے والے کیا سب مر گئے تھے۔ بیٹی بیاہنے تو آگئے اور اپنے لڑکے کو نہ روکا۔
کلّو : (چُپ)
نبّو : پھر وہی چُپ۔ ابے کچھ تو بول۔
کلّو : ماموں۔ اب تو مجھے جانے دو۔
نبّو : بڑا ہنر والا ہے نا۔ بیٹا حرام ڈبل پینا چھوڑ دے تو یہیں کیا کمی ہے۔
کلّو : نہیں ماموں میں تو باہر ہی جاؤں گا۔
نبّو : جا مُنہ کالا کر۔ دیکھوں گا کیا کمالے کر آتا ہے۔ شریف کا بچّہ ہے تو خالی ہاتھ صورت نہ دکھا ئیو۔ چل لمبا بن (کلّو گردن ڈالے چُپ آہستہ آہستہ چلا)
نبّو : (جیب میں ہاتھ ڈال کر) ارے کچھ ٹکا پیسا گرہ میں بھی ہے۔ جائے گا کس طرح؟ اور کھائے گا کیا؟ لے یہ تین روپے لیتا جا۔ بیٹا اب کچھ کر کے آنا۔

تین رُوپے کلّو کے ہاتھ پر رکھ مرزا نبّو بڑبڑاتے ہوئے گلی کے اندر اور کلّو لمبے لمبے ڈگ بھرتے لاہوری دروازے کی طرف چل دیے۔ پانی پت جانے والی شکرم تیار تھی اس میں سوار ہو گئے۔ غدر سے پہلے جب تک ریلوں کا سا جال نہیں پھیلا تھا۔

شہروں کے ماما پُختریاں کھانے والوں کو دس بیس کوس کا سفر بھی ایک بڑی مہم تھی۔ ایسی ہی کوئی مصیبت آپڑتی تو گھر سے نکلتے۔ کلکتہ، بمبئی، کراچی وغیرہ جانا تو بڑے دل گُردے کا کام تھا۔ دِلّی سے جب کوئی بیزار ہوتا تو مُلّا کی دوڑ مسجد۔ اِدھر ہاپوڑ، میرٹھ، علی گڑھ اُدھر سونی پت، پانی پت، کرنال اور لمبا دھاوا مارا تو آگرہ یا لکھنؤ۔ الغرض میاں کلّو پانی پت پہنچے۔ وہاں کیا کرتے رہے؟ یہ تو خبر نہیں لیکن رہے پورے چار برس۔ اچھا کام تو کوئی کیا نہ ہوگا کیونکہ پانچویں سال عید سے چند روز پہلے جو آئے ہیں تو آٹھوں گانٹھ کمیت تھے۔ روپیا پیسا مال ٹال تو خیر کچھ لائے نہیں ہاں نرے سینہ زور اور کورے شہدے بھی نہیں رہے۔

پُرانے وقتوں کے آدمی، اچھوں کا تو کیا کہنا، بُرے سے بُرے میں بھی ایک خاص بات ہوتی تھی۔ یوں کہنا چاہیے کہ اُس زمانے کا ہر شخص اپنا کیریکٹر الگ رکھتا تھا۔ میاں کلّو کو عیب دار کرسکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہیکڑ، مفلس اور بے روزگار لفنگے تھے۔ مگر اس چال چلن پر بھی اپنی سسرال والوں کا اتنا لحاظ، بیوہ ماں کا ایسا ڈر اور محلّے کے بڑوں کا اس قدر خیال تھا کہ سارا دن لاہوری دروازے کے باہر سرہندی مسجد میں بیٹھ کر کاٹ دیا۔ رات ہوگئی تو دبکتے دبکاتے مُنہ پر رومال ڈالے شہر میں گھُسے۔ نو بجے ہوں گے کہ اپنے محلّے کی مسجد کے سامنے سے گزرے۔

قضائے کار مرزا نبّو بھی روند کے سپاہی کی طرح محلّے کی خبر لیتے گھر آرہے تھے۔ اس زمانے میں چراغ جلے گلیاں سنسان ہونی شروع ہوجاتی تھیں اور نو دس بجے تو قبرستان کی خاموشی چھاجاتی تھی۔ انھوں نے جو ایک خنگرے کو دبے پاؤں گلی میں آتے دیکھا، چونکے۔ چال ڈھال پر شبہ ہوا، ٹھٹھک کر کھڑے ہوگئے۔ کلّو کی ماموں پر نظر پڑی تو جان سی نکل گئی۔ دل دُھکڑ پکڑ کرنے لگا۔ دبکنے کی جگہ نہیں، بھاگنا دشوار تھا۔ سٹّی گم۔ اتنے میں مرزا نبّو نے لپک کر ہاتھ پکڑ لیا۔ "کیوں بے یہاں کیا کرنے آیا ہے۔ جانتا نہیں مرزا نبّو یہاں رہتے ہیں؟"

کلّو : (چپ)

نبّو : کیوں نبّو کا نام سُن کر سانپ سونگھ گیا۔ ابے مُنہ تو کھول۔ دیکھوں تو کس ٹولی کا ہے۔ بتاتا ہے یا کچھ کھا کر بتائے گا۔

کلّو : (سٹپٹا کر) ماموں میں ہوں۔
نبّو : (آواز پہچان کر) کلّو؟ ارے آگیا۔ کب آیا؟
کلّو : چلا ہی آتا ہوں۔
نبّو : رہا تو مزے میں۔ اچھا لایا کیا؟
کلّو : (نیچی نگاہ کر کے) لانے کو وہاں کیا رکھا تھا۔ دن گزار دیے۔
نبّو : آخر ٹکڑے کھائے دن بہلائے کپڑے پھٹے گھر کو آئے۔
کلّو : نہیں ایسا تو نہیں ہوا۔ مگر جُٹ نہیں ملی۔ اکیلا چنا کیا بھاڑ کو پھوڑتا۔
نبّو : پھر بھی؟
کلّو : یہی دو چار چیزیں ہیں اور چالیس ایک رُوپے۔
نبّو : (کِھل کر) ہاں! شاباش میرے بہادر! تو اب مُنہ کیوں چُھپاتا ہے چل میرے ساتھ۔ لیکن بھئی ایک کام کر۔ پہلے اپنی سُسرال جا۔ بیوی سے مل۔ اپنے بچّے کو دیکھ عین بین تیری صورت کا ہے اسے لے کر گھر آئیو۔

کلّو یہ سُن کر دل میں کہنے لگا یہ اور غضب ہوا۔ روٹی کپڑے کا تو سہارا تھا نہیں جاپے کا خرچ کہاں سے چلا ہو گا۔ بیوی تو خیر بُڑھیا ساس کھا کھا جائے گی۔ اس وقت جا کر مفت میں جھائیں جھائیں کرنی ہے۔ بولے "ماموں صبح کو نہا دھو کر ہو آؤں گا۔"

نبّو : نہیں ابھی جا!
کلّو : اجی اب کہاں جاؤں۔ سب سو گئے ہوں گے۔
نبّو : سو گئے ہوں گے تو کیا ہے جاگ جائیں گے۔
کلّو : اس حال میں کہاں جاؤں۔
نبّو : (غصّے میں) گدھا ہے نا۔ ہم کہتے ہیں ابھی جا۔ (دھیمے ہو کر) بیٹا بڑوں کی مان لیا کرتے ہیں۔ بس خیر اسی میں ہے (پھر تیز ہو کر) جاتا ہے کہ ڈنڈا ڈولی کر کے لے جاؤں۔ اچھا یوں نہیں ملنے کا۔ (ہاتھ پکڑ کر) تیرا کیا اعتبار رستے میں کھو رو لے آیا تو بنی بنائی بات بگڑ جائے گی۔ چل میں تجھے پہنچا آؤں۔

کوئی دو آنے ڈولی میاں کلّو کی سُسرال تھی۔ دونوں ماموں بھانجے چلے اور

باتیں کرتے ہوئے تھوڑی دیر میں جا پہنچے۔ مکان سامنے آیا تو مرزا بنو نے کہا۔ جاؤ کنڈی کھٹکھٹاؤ۔ گھبراؤ نہیں۔ جب تک تم اندر نہ بلا لیے جاؤ گے میں یہیں کھڑا ہوں۔

کلو کیسا ہی آوارہ، بدچلن، نکھٹو، رانڈ کا سانڈ سہی مگر ہندستانی ماں کا بیٹا تھا۔ دلی کی آب و ہوا میں پرورش پائی تھی۔ جہالت کے باوجود شرافت کے آثار بالکل نہیں مٹے تھے۔ دل میں خیال کہ اتنے دن تک پوچھا نہیں۔ ساس کیا کہے گی۔ سسر سے صاحب نہ جانے کس طرح پیش آئیں۔ بیوی بچاری تو خیر کچھ کہے یا نہ کہے۔ قدم بڑھاتا اور رُک جاتا۔ بڑی مشکل سے دروازے پر پہنچا۔ کچھ ندامت کچھ ڈر۔ آخر ہمت کرکے کواڑوں پر ہاتھ مارا۔ خسر حُقّہ پی رہے تھے، ساس کچھ سی رہی تھی۔ بیوی کی گود میں بچہ تھا۔ بڑے میاں نے جو دستک کی آواز سُنی چونک کر کہنے لگے۔

بڑے میاں: دیکھنا کوئی کنڈی کھٹکھٹا رہا ہے۔

بڑی بی: اوئی میں دیکھوں۔

بڑے میاں: اس وقت کون آگیا؟

بڑی بی: جاکر دیکھو۔

بڑے میاں بڑبڑاتے اُٹھے۔ دروازہ کھولا۔ اندھیرا تھا۔ داماد کے آنے کا سان گمان بھی نہ تھا پوچھنے لگے "کیوں بھئی کس کو پوچھتے ہو؟"

کلو: (نیچی نگاہ کرکے خاموش)

بڑے میاں: ارے میاں گھنّے کیوں سادھ لی۔ بولتے کیوں نہیں؟

کلو: (دبی ہوئی آواز سے) میں ہوں چچا میاں۔

بڑے میاں: میں کون؟

کلو: اجی کلو!

کلو کا نام سُن کر ادھر تو بڑے میاں کو اچنبا سا ہو گیا اور اُدھر بڑی بی کے کان لگے ہوئے آواز جو سُنی تو چراغ لے کر دوڑی۔ صورت دیکھتے ہی داماد کو پہچان لیا۔

بڑے میاں: (خوشی کے مارے بےتاب ہوکر) اماں کلو بیٹا کب آئے۔ ہمیں خبر بھی نہ کی۔

بڑی بی : میرا چاند آگیا۔ بھئی تم نے تو صورت کو ترسا دیا۔ واری اچھے رہے۔
بڑے میاں : بس یہیں کھڑی رہو گی۔ اندر چلو۔ دیکھو تو سہی بچارا۔ لاحول ولا قوۃ۔ تم بھی سٹھیا گئی ہو۔ آؤ میاں تمھارا گھر ہے۔ اللہ نے ہماری سُن لی۔ اری نصیرا تیرا دولھا آگیا۔ بچے کو تو ذرا دکھا۔
بڑی بی : یہ تم سٹھیائے ہوئے ہو یا میں۔ یہیں سب کچھ ہو جائے۔ اندر آنے دو بچے کو کیوں نہ دیکھیں گے۔

ساس سسرے دونوں کا عجیب حال ہے۔ صدقے اور قربان ہو رہے ہیں۔ ایک آگے پھرتا ہے تو دوسرا پیچھے۔ بیوی چپ بیٹھی کبھی ماں کی شکل دیکھتی ہے کبھی خوشی کے جذبات دبانے کے لیے بچّے کو پیار کرنے لگتی ہے۔

بڑی بی : بیٹا اتنے دن پردیس میں رہنا تھا تو تم رہتے۔ مرد ذات ہو۔ اللہ رکھے کمائی کے سر روزگار کو سب جاتے ہیں، مگر ایسا بھی نہیں کرتے کہ اُلٹ کر خبر بھی نہیں لیتے۔ پانی پت کوئی کالے کوسوں تو نہ تھا کہ آنا جانا مشکل ہوتا۔ روز شکریں آتی جاتی رہتی ہیں۔
بڑے میاں : بھئی یہ مجھے بھی حیرانی ہے کہ جب سے تم گئے خرچ سے تنگ نہیں رکھا۔ ہر مہینے تمھارے ماموں آکر مٹھی بھر روپے دے جاتے تھے۔ جاپے کے دن آئے تو اس کے واسطے تم نے الگ خرچ بھیجا لیکن صورت آج چار برس بعد دکھائی ہے۔ میاں لڑائی ہوئی تھی تو اپنی اماں سے ہم نے کیا خطا کی تھی؟
بڑی بی : اب تم نے یہ گلے شکوے کہاں کے نکالے۔ میں تو کہتی ہوں کہ ایسا داماد خدا سب کو نصیب کرے۔ آپا مرزائی کو نہیں دیکھا، ننھے کے دودھ چھٹنے میں آئی تھیں تو گودیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں دے رہی تھیں۔ بھلا انھیں امید تھی کہ بیٹا اس طرح انھیں رنڈاپے میں راج کرائے گا۔
بڑے میاں : ایمان کی تو یہ ہے کہ کلوے نے ہماری آبرو رکھ لی۔ ہمارا روزگار تھک گیا تھا بڑی بُری بن گئی تھی۔ یہ اگر ہمیں سہارا نہ دیتا تو جانے کیا بیت جاتی۔ مگر میاں یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمھارا پیسا اپنے کام میں لاتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے تمھارا پیسا تمھارے ہی نیگ لگا۔ جو بھائی نبو دے گئے، تمھاری بیوی کے

حوالے کر دیا۔ اس نے جس طرح چاہا اُٹھایا۔ ہم تو فقط ایک ہاتھ سے لے کر دوسرے ہاتھ میں دے دینے تک کے گنہگار ہیں۔

دلّی والوں کی شرافت، غیرت اور وضع داری دیکھی۔ کہنے کو میاں کلّو کے ساس سُسرے کارپیشہ چھوٹی اُمّت میں سے تھے، مگر اس مڑک کا کیا کہنا۔ اسی طرح مرزا نبّو بدمعاشوں کے گرو گھنٹال، پکّے جواری ڈھنڈاری لیکن کیا کہنا ہے۔ آج یہ باتیں بڑے بڑے شرافت کے نام لیواؤں کو میسّر نہیں۔" اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے:" دلّی کیا مٹی دلّی والوں کی ہر خوبی مٹ گئی۔ مرزا نبّو نے کلّو کو بھانجا بنایا تھا تو ماموں کا حق ادا کیا۔ اِدھر تو اس کی سُسرال والوں کی زبان بند کر دی انھیں یہ کہنے کا موقع نہ دیا کہ داماد روزگار لگنے پر بیوی سے لاپروا نہیں اُدھر اس کے اپنے گھر کا خیال رکھا۔ مکان کا کرایہ مکان دار کو انتیسویں دن پہنچاتے رہے اور بُڑھیا کی ساری ضروریات پوری کیں۔ ساتھ ہی سُسرال والوں پر بھی آفریں ہے۔ غریب ہونے کے باوجود داماد کی کمائی کو ہاتھ نہیں لگایا۔

یہ تھے اگلے وقتوں کے طور طریق اور محلّے داری کی باتیں۔ غرض کہ میاں کلّو ساس سُسرے کی گفتگو سُن سُن کر حیران تھے۔ مرزا نبّو کی شرافت اور راپٹ پاجی پن پر آنکھ اُٹھانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ جی بھر بھر آیا۔ آخر نہ رہا گیا۔ بچّے کو گود میں لے کر خوب پیار کیا اور جیب میں سے ایک پوٹلی نکال کر بیوی کے آگے رکھ دی۔

بڑی بی : (کھڑے ہو کر) لو اب اُٹھو۔ آدھی رات آگئی ہوگی۔ بیٹے سونے دو۔

بڑے میاں : کون منع کرتا ہے۔ لیٹیں سوئیں۔

بڑی بی : تم بھی ٹلو۔

بڑے میاں : کیوں بھئی پوٹلی میں کیا ہے؟

بڑی بی : خدا کی سنوار۔ تم کو کیا، کچھ ہوگا؟ بیوی بچّے کے لیے کوئی سوغات لائے ہوں گے۔

بڑے میاں : ہم بھی تو دیکھیں۔

بڑی بی : توبہ ہے۔ بالکل بچّے ہی بن گئے۔ پھر دیکھ لینا۔

بڑے میاں : ارے بی ہم خوش ہونے والے ہیں۔ بیٹی پوٹلی کھولتی کیوں نہیں؟

نصیرًا پوٹلی کھولتی ہے۔ ایک سونے کی چمپا کلی، چار پتّے بالیاں کنگنوں کی جوڑیاں اور دو انگوٹھیاں نکلتی ہیں

بڑی بی : اے میں دیکھوں۔ اللہ مبارک کرے۔ دشمنوں کی آنکھوں میں خاک۔ ایسا بیوی کا مان رکھنے والا کوئی ہو تو لے۔

بڑے میاں : جاؤ نا۔ اب کیوں بیٹھ گئیں۔ (چمپا کلی اُٹھا کر) ذرا پہن کر دیکھنا؟

بڑی بی : اے تمھیں ہو کیا گیا۔ داماد کا بھی لحاظ نہیں۔

بڑے میاں : اچھا لو آؤ ذرا اپنے دالان کی طرف چلتے ہوئے) میرا تو حقہ بھی جل گیا ہوگا۔ یہ کہتے ہوئے دونوں بڈّھے بُڑھیا بیٹی داماد کو اکیلا چھوڑ اپنے پلنگوں پر آجاتے ہیں۔

مرزا ننّو کے جیتے جی تو میاں کلو اُن کے شاگردی میں رہے۔ کچھ تو ماں کی دُعائیں کچھ اُستاد کی نگرانی۔ سارے کرم کرتے۔ کوئی آنکھ ملانے والا نہ تھا۔ لیکن اِدھر اُن کی آنکھ بند ہوئی، ماں بھی چل بسیں اُدھر انھیں اپنے زور وطاقت کا گھمنڈ۔ ساتھ ہی ذرا رنگین مزاج بھی تھے اور اس کے لیے ہر وقت کھنکتی جیبوں کی ضرورت۔ لمبے ہاتھ مارنے لگے۔ کوئی رات واردات سے خالی نہ جاتی۔ انجام یہ ہوا اور ہونا چاہیے تھا کہ پولیس تاک میں رہنے لگی۔ چاروں طرف جال بچھ گئے۔

زمانہ کیسا ہی سلطنت گردی کا سہی پھر بھی ڈاکوؤں اور خونیوں کو آزاد تو چھوڑا نہیں جاتا۔ دوسرے انگریز ملک میں قدم جما رہے تھے اور ان کا پہلا کام امن میں خلل ڈالنے والوں کی روک تھام تھا۔ جہاں ان کی حکومت ہوئی، تھانے بٹھا دیے۔ چوروں اور سینہ زوروں کو پکڑنا شروع کر دیا۔ دلّی میں بھی قلعے کے باہر اُن کی عمل داری تھی۔ پولس میاں کلّو کے سر ہو گئی۔ کئی مرتبہ گھیر لیا مگر یہ ہاتھ نہ آئے۔ تاہم انھیں تنگ ایسا کیا کہ شہر چھوڑتے ہی بنی۔ چنانچہ میاں کلو اپنے پٹھّے کو لے جھجر کی طرف نکل گئے۔ اور وہاں کے جنگل میں ڈیرے ڈال دیے۔ لوٹ مار کرتے اور مزے اُڑاتے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ قصبے کے باہر دور میدان میں درختوں کے نیچے ایک دس گیارہ برس کی لڑکی اپنی گائے کو لیے کھڑی تھی۔ اس نے دیکھا کہ کوئی شخص ڈھاٹا باندھے

گھوڑے پر سوار آرہا ہے۔ لڑکی نے ڈر کر بھاگنا چاہا لیکن گائے کو چھوڑ کر کہاں بھاگتی۔ سوار کی خوفناک صورت دیکھ کر سہم گئی۔ اتنے میں سوار اس کے قریب آپہنچا۔ لڑکی پریشان تھی کہ کیا کرے۔ اس نے ڈاکوؤں کے چرچے سُنے تھے۔ ڈری کہ یہ بھی کوئی ڈاکو ہے۔ گائے چھین کرلے جائے گا۔ روہنسی سی ہوگئی۔ سوار نے گھوڑے سے اُترا اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور چمکار کر کہا۔

سوار : بیٹی! ڈرو نہیں۔ میں تمھاری گائے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔

لڑکی : (سوار کا مُنہ تکتے ہوئے) میری گائے تو نہیں لوگے؟

سوار : نہیں مُنّی۔ تمھاری گائے مجھے کیا کرنی ہے۔

لڑکی : اچھا تو پھر کیا پوچھتے ہو؟

سوار : کوئی سوار تو ادھر سے نہیں گزرا۔ دیکھا ہو تو بتادو۔ کدھر گیا ہے۔

لڑکی : نہیں میں نے تو کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔

سوار : تم کب سے یہاں کھڑی ہو؟

لڑکی : بڑی دیر سے۔

سوار : تو کوئی سوار اس طرف نہیں آیا۔

لڑکی : میں تو جانوں نہیں آیا۔ (لڑکی کا خوف دور ہو چلا تھا وہ بولی) تم یہ کیوں پوچھتے ہو؟

سوار : بیٹی میرا ساتھی کھو گیا ہے۔

لڑکی : تم کون ہو؟ ڈاکو تو نہیں۔

سوار : (ہنس کر) ہوں تو ڈاکو۔

لڑکی : (گھبرا کر) کون ڈاکو؟ کلّو!

سوار : ہاں کلّو۔ تم نے کیوں کر جانا۔

لڑکی بڑی حیرت سے کلّو کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

لڑکی : تم کلّو ہو؟ نہیں نہیں تم کلّو نہیں ہوسکتے۔ وہ تو بڑا ہتھیارا، ظالم، ڈراونا ہے۔ میرے لالہ اس کو بہت بُرا کہتے ہیں۔

کلّو : تم جھوٹ سمجھتی ہو؟ نہیں میں سچ مچ کلّو ڈاکو ہوں۔ مگر چھوٹے بچوں کو مجھ سے کس بات

کا ڈر۔

لڑکی : (تعجب سے اِدھر اُدھر دیکھ کر) اگر سچ مچ تم کلّو ڈاکو ہو تو بھاگ جاؤ۔ جلدی کرو نہیں تو سپاہی پکڑ لیں گے۔ سب لوگ، سارا گاؤں تمھاری تاک میں ہے۔ کوئی دیکھے گا تو تمھیں پکڑوا دے گا۔ اچھی نگوڑے سپاہی تمھارے کیوں دشمن ہیں۔ تم تو مجھے بڑے اچھے آدمی لگتے ہو۔

بھولی بھالی لڑکی کی باتیں کلّو کو بڑی پیاری معلوم ہوئیں۔

کلّو : (ٹھنڈا سانس لے کر) بیٹی تمھارا کیا نام ہے۔ تم کہاں رہتی ہو؟

لڑکی : میرا نام لالی ہے۔ میں یہیں سامنے والے گاؤں میں رہتی ہوں۔ میرے باپ دُکان کرتے ہیں۔ تم کو کیا۔ ہم امیر نہیں۔ میرے باپ کی چھوٹی سی آٹے دال کی دُکان ہے۔ ہمارے پاس کوئی گہنا بھی نہیں۔ ہم کو لوٹ کر کیا کروگے۔

کلّو : (ہنستے ہوئے) اری مورکھ ڈاکو کہیں غریبوں کو بھی لوٹا کرتے ہیں۔

لڑکی : غریبوں کو ستاتے بھی نہیں؟

کلّو : غریبوں کو ستا کر کیا لیں۔ دوسرے . . . . .

لڑکی : (بات کاٹ کر) اچھا ہوا رام نے ہمیں امیر نہیں بنایا۔

کلّو : مگر اب چاہے تم کیسی ہی امیر ہو جاؤ تمھارا گھر ہمارا گھر ہے۔

لڑکی : یہ کیا؟ میرے لیے تم ساہوکار ہو جاؤ گے۔

کلّو : بیٹی! اچھے ڈاکو۔ بہادر چور جس کو اپنا سمجھ لیتے ہیں اس کو کبھی نہیں لوٹتے بلکہ اس کی پوری حفاظت کرتے ہیں۔

لڑکی : (تعجب سے) کیا چور ڈاکو بھی بھلے مانس ہوتے ہیں؟

کلّو : ہاں۔ کیوں نہیں۔ اللہ نے اُن کو بھی سب قسم کا بنایا ہے۔

لڑکی : تم تو مجھے بہکاتے ہو۔ کہیں چوری کرنا اور ڈاکہ مارنا بھی بھلے مانسوں کا کام ہے؟

کلّو لڑکی کے سوالات سے حیران تھا کہ کیا جواب دے اور کیونکر اُسے سمجھائے کہ اس ذلیل پیشے میں بھی ایک قسم کی شرافت ہوتی ہے۔ اور انسان کو ڈاکو بننے کے لیے کیا مجبوریاں لاحق ہوا کرتی ہیں۔ لوگوں کی بدسلوکیوں اور ناروا داریوں کو ان کے جذبات مشتعل کرنے میں کس قدر دخل ہے۔ آخر بولا۔

کلّو : بیٹی تم بچہ ہو۔ اس بات کو نہیں سمجھ سکتیں (ٹھنڈا سانس لے کر) یاد رکھو۔ ایک شریف ڈاکو اُن ساہوکاروں، تلک دھاریوں، تسبیح ہلانے والوں سے لاکھ درجے اچھا ہے جو یتیموں کا مال ہڑپ کر ڈکار تک نہیں لیتے۔ غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ کیا سود خوار مہاجن اور کچہری کے ناخدا ترس حاکم ہماری برابری کر سکتے ہیں۔ کمزوروں کو ستانے والے، قانون کے نام پر رشوتیں لینے والے اور انصاف کے چوروں سے بھی ہم ڈاکو گئے گزرے ہو گئے؟

بھلا ایک گاؤں کی لڑکی ان فلسفیانہ باتوں کو کیا سمجھتی۔ میاں کلّو کہہ رہے تھے۔ اور وہ اُن کا مُنہ دیکھے جاتی تھی۔ اتنے میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سی آئی۔ لڑکی کی نظر جو اُٹھی تو دو سوار دکھائی دیے وہ گھبرا کر چلّائی ”بھاگو بھاگو! سپاہی گھوڑوں پر آرہے ہیں میں بھی اپنے گھر جاتی ہوں۔“

کلّو نے مڑکر دیکھا تو پولیس کے سوار تھے۔ سنبھل کر گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ لڑکی اپنی گائیں ہانکتی ہوئی گاؤں کی طرف بھاگی۔ اور درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپ گئی۔ سوار قریب آئے۔

ایک سوار : (کلّو کو دیکھ کر) جوان تم کون ہو؟

کلّو : تمہارا جنوائی۔

سوار : کیا بکتا ہے۔ ہمیں جانتا ہے۔

کلّو : ہاں، پولس کے کُتّے ہو۔

سوار : (دوسرے سوار سے) جمعدار سنتے ہو اس بے ایمان کی باتیں۔

جمعدار : معلوم ہوتا ہے قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ لگا ایک ہاتھ۔

کلّو : جمعدار! اپنے داماد کو ابھی پہچانا نہیں بیٹی رانڈ ہو جائے گی۔ میرا نام کلّو ہے۔

کلّو نے اِدھر تو یہ کہہ کر قہقہہ لگایا اور اُدھر دونوں سواروں کے مُنہ پر ہوائیاں سی اُڑنے لگیں۔ ہاتھ پاؤں کی جان نکل گئی۔

کلّو : (مسکرا کر) کیوں اپنے بہنوئی کا خیال آگیا۔ میری تلاش میں آئے ہو نا بڑا انعام ملے گا۔ آؤ پھر دو دو ہاتھ ہو جائیں۔

پولس والے مردوں کے مُنہ کب چڑھتے ہیں۔ اُن کی بہادری آبرُو داروں تک محدود ہوتی ہے۔ مارتے خان کا مقابلہ کون کرتا۔ پھر کلّو جیسا جیوٹ ڈاکو۔ نام کی دھاک دلوں پر بیٹھی ہوئی۔ ارادہ تو یہ تھا کہ موقع ملے تو رعب بٹھا کر نکل جائیں۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ جھوٹی سچی رپورٹ کر دیں گے۔ لیکن موت کا سامنا تھا۔ قضا آگئی تھی۔ کلّو کب نکلنے دیتے تھے۔ رستہ روک لیا۔ ناچار تلواریں نکالنی پڑیں۔ ادھر مردہ دل، پست ہمتیں اُدھر منجھا ہوا ہاتھ۔ بیسوں کا خون چاٹے ہوئے تلوار۔ پلک جھپکتے دونوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔

دونوں سواروں کو موت کے گھاٹ اتار کر کلّو نے تلوار صاف کی اور بڑے اطمینان کے ساتھ درختوں کے اُس جُھنڈ کی طرف چلا جہاں لڑکی کو چھپتے دیکھا تھا۔ لڑکی سہمی ہوئی باہر آئی۔

لڑکی : تم بڑے پاپی ہو۔ دونوں کو مار ڈالا۔

کلّو : (مسکراتے ہوئے) پاپ کیسا؟ یہ کیسے بھونکتے بھونکتے کاٹنے لگے تھے۔ میں نے ان کا پاپ کاٹ دیا۔

لڑکی : واہ یہ تو آدمی تھے۔

کلّو : مگر کتّوں سے زیادہ ذلیل۔ چاندی کی ہڈیاں چچوڑنے والے۔ چار چار روپے کے غلام۔

لڑکی : پر تم ہو بڑے ظالم۔ مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔

کلّو : (ہنس کر) مجھ سے ڈرتی ہو۔ ان سے نہیں جو حکومت کے پردے میں روز غریبوں کا خون کرتے رہتے ہیں۔

لڑکی : اچھا تم نے انھیں کیوں مارا۔ انھوں نے تمھارا کیا لیا تھا؟

کلّو : وہ مجھے پکڑنے آئے تھے۔ میں اکیلا وہ دو تھے۔ انھوں نے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے اپنی جان بچائی۔ ان کی موت آگئی۔

لڑکی : نہیں تم نے انھیں مارا۔

کلّو : میں اگر نہ مارتا تو وہ مجھے مار ڈالتے۔

لڑکی : (کلّو کو گھور کر) تم ہو بڑے کوئی۔

کلّو نے مسکراتے ہوئے اپنی کمر سے روپوں کی ایک تھیلی نکالی اور لڑکی کی طرف بڑھا کر کہا۔

کلّو : بیٹی۔ یہ لو اس میں بہت سے روپے ہیں۔ تم غریب ہو نا اب امیر ہو جاؤ گی۔ دیکھو بھلے مانس ڈاکو دولت مندوں کو لوٹ کر غریبوں کو اس طرح دیا کرتے ہیں۔

لڑکی : واہ جی تم نے ہم کو چوری کا مال کھانے والا سمجھا ہے۔ ہم غریب ہیں تو کیا اتنے غریب بھی نہیں کہ تمھارے آگے ہاتھ پساریں۔ کلّو نے بہت کوشش کی کہ لڑکی روپے لے لے لیکن وہ برابر انکار کیے گئی۔ تھیلی کو چھوا تک نہیں۔ ہار کر کلّو کہنے لگا " اچھا بیٹی تمھاری مرضی۔ خیر نہیں لیتیں نہ لو۔ مگر یہ نہ بھولنا کہ کلّو نے تم کو بیٹی کہا ہے۔ ہم ڈاکوؤں میں بات کی بڑی پچ ہوتی ہے۔ آج سے تم میری بیٹی ہو۔ جب تمھیں ضرورت ہو ضرور یاد کرنا۔ اللہ تمھیں خوش رکھے۔ جاؤ رات ہونے کو آئی۔ میں بھی جاتا ہوں۔"

لڑکی اور کلّو دونوں اپنے اپنے رستے لگے۔ اور جب تک ایک دوسرے کو دکھائی دیتے رہے کلّو لڑکی کو اور لڑکی کلّو کو پھر پھر کر دیکھتے رہی۔

میاں کلّو کا جتھا اور اس کی طاقت برابر بڑھتی جاتی تھی۔ دولت مند پریشان اور غریب خوش تھے۔ وہ کلّو پر دانت پیستے تو یہ دعائیں دیتے۔ کلّو نے بھی ٹھان لیا تھا کہ زندگی تو چند روزہ ہے نام تو ہو جائے گا۔ لوگ کیا یاد کریں گے۔ نمود ہو کسی طرح کی سہی۔ بھوکی لومڑیوں اور بلیوں کی زندگی بسر کرنی کس کام کی، جب تک جیو شیر بن کر جیو۔ دنیا میں ایسے جواں مرد کے جھنڈے کی سلامی کو بڑے بڑے سورما جمع ہو گئے۔ دھوم کے ڈاکے پڑنے لگے۔ گویا آس پاس کے سارے جنگلی علاقے پر اسی بے آئین گروہ کی حکومت تھی۔ حکومت لاکھ جتن کرتی مگر ان کی ہوا تک نہ لگتی۔

گانو کی لڑکی لالی کے واقعے کو تین چار برس گزر چکے تھے اور ڈاکوؤں کی سرشوری دن بدن بڑھتی جاتی تھی، لیکن جس گانو میں لڑکی رہتی تھی وہاں کیا بلکہ اس سے دو دو چار چار میل تک بھی کوئی ڈاکے کی واردات نہیں ہوئی۔ لوگ حیران تھے کہ ڈاکوؤں نے اس مالدار گانو کو کیوں چھوڑ رکھا ہے؟ یہاں ہر طرح کا امن تھا۔ اسی اثنا میں گوڑ گانوہ کے ایک اچھے دولت والے گھرانے میں لالی کی سگائی ہو گئی۔ لالی اپنے

ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ ہندستان میں یہی ایک تقریب دیوالہ نکالنے والی کہلاتی ہے۔
کہتے ہیں۔ جس نے بیٹی دی اس نے اپنے لیے کیا رکھا۔ دل کے حوصلے نکالنے اور
برادری میں نام کرنے کا یہی موقع سمجھا جاتا ہے۔ لالی کے بیاہ کی تیاری ہوئی۔ بڑے ٹھاٹ
سے برات آئی۔ تین روز کے بعد رخصت کی ٹھہری۔ لٹنے کا سامان گمان بھی نہ تھا۔ لالی کے
باپ نے دل کھول کر جہیز دیا

بنیے کی برات۔ ادھر تو ہزاروں روپے کا ٹھوس جہیز ادھر براتیوں میں بڑے
بڑے سیٹھ، موٹے موٹے ہار گلے میں ڈلے، سونے کی تاگڑیاں باندھے رتھوں میں سوار،
عورتیں گاتی بجاتی چلی جا رہی تھیں۔ کوئی چار پانچ کوس یہ برات پہنچی ہوگی کہ چاروں
طرف سے ہتھیار بند ڈاکوؤں نے آگھیرا۔ جھٹپٹا وقت تھا۔ دُور دُور تک کوئی بستی نہ تھی۔
برات میں آدمی تو سَو سے زیادہ نہ تھے مگر سب نہتّے۔ وہ گدّی پر بیٹھے بیٹھے غریب
اسامیوں کی کھال کھینچنا جانتے تھے۔ انھوں نے ننگی تلواریں کب دیکھی تھیں۔ رام رام کرکے
کوئی رتھوں اور بہلیوں کے پردے میں چھپا کسی نے لہنگا پہن کر گھونگھٹ نکال لیا۔ برات
تتر بتر ہوگئی۔ لالی کا دولھا ذرا اکڑا تھا کہ دو ہاتھ میں وہ بھی زخمی ہو کر زمین پر لمبا
لیٹ گیا۔

جب روتی پیٹتی عورتوں کے سوا برات میں کوئی مرد نہ رہا تو ڈاکوؤں نے لوٹنا
شروع کیا۔ ایک ایک عورت کی تلاشی لی۔ سب سے آخر دُلھن کی نوبت آئی۔ ایک
ڈاکو نے رتھ کا پردہ اُلٹ دیا۔ رتھ بان بوڑھا آدمی تھا وہ کچھ بولا تو اسے دوسرے ڈاکو
نے نیزے سے چھید ڈالا۔ دو دن کی بیاہی بچاری لالی سہمی بیٹھی تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کے
نیچے گھسیٹ لیا۔ نہ کسی کو اس کے سہاگ پر رحم آیا نہ اسے بلکتا دیکھ کر کسی نے ترس
کھایا۔ لوٹم چھلاّ گہنا پاتا جو اس کے بدن پر تھا گالیاں دیتے جاتے تھے اور کھسوٹتے
جاتے تھے۔ اسی چھینا جھپٹی میں ڈاکوؤں کی اس ٹولی کے سردار جسونت کی نظر لالی پر گئی۔
لالی بڑے پیارے ناک نقشے کی لڑکی تھی۔ پھر نوجوانی کا روپ۔ دیکھتے ہی جسونت کے
مُنہ میں پانی بھر آیا۔ نیت بگڑ گئی۔ اپنے ساتھیوں سے یہ کہتا ہوا کہ تم دوسری عورتوں کو
سنگواؤ۔ اس شریر لڑکی سے میں سُلٹتا ہوں۔ لالی کی طرف بڑھا اور خدا جانے چپکے سے کیا
کہا کہ لالی کانپتے ہوئے چیخ کر بولی۔

لالی : پرے ہٹ۔ ہمارا دھن دولت لوٹ لیا۔ ہمارے آدمی مار ڈالے۔ اب اور کیا لوٹے گا۔ رام تجھ پر بجلی گرائے۔

جسونت نے مسکرا کر پھر کچھ کہا۔

لالی : ہتھیارے۔ ایک کنیا کو رانڈ کر کے صبر نہیں آیا۔ نامرد ایک کمزور عورت پر طاقت جتاتے تجھ کو شرم نہیں آتی۔

جسونت : (اکڑ کر) شرم کیسی ؟ میں راجپوت ہوں۔ میدان میں بہادروں کی طرح لڑ کر تجھے چھینا ہے۔

لالی : ڈوب مر چلّو بھر پانی میں۔ تو راجپوت ہے کہ کوئی چمار۔ ارے راجپوت ایسے ہی ہوتے ہیں ؟

جسونت : اور کیسے ہوتے ہیں ؟

لڑکی : چلتے مسافروں کو لوٹنا۔ عورتوں پر ہاتھ اٹھانا، کیا یہی چھتریوں کے کام ہیں۔ اور تو اور تجھ جیسے ذلیل ڈاکو بھی ؛

لالی کے طعنے سُن کر جسونت موذی سانپ کی طرح پھنپھنا اُٹھا۔ طیش میں آکر بولا۔ بس ری زیادہ بکواس نہ کر۔ سیدھی ہو جا نہیں تو گلا گھونٹ دوں گا۔ بول تجھے میری جورو بننا منظور ہے۔

عورت جیسی کمزور ہوتی ہے ویسے ہی اپنے ارادے کی پکی۔ مرد تو اپنی جان بچانے کے لیے اپنا دھرم، ایمان سب کھو دیتے ہیں مگر عورت اپنی بات پر جان دے دیتی ہے۔ اسے نہ کوئی لالچ دیا سکتا ہے نہ ڈر۔

لالی : (بپھر کر) او پاپی چنڈال۔ جو تجھ سے ہو سکے کر لے۔

جسونت : جو ہو سکے کر لوں۔ نہیں مانے گی۔ (غصّے میں آگے بڑھتا ہے۔)

لالی : ہاتھ ٹوٹے (جسونت کا منہ نوچ کر) لہو پی جاؤں گی۔

جسونت : چڑیل۔ کاٹتی ہے۔ اچھا میں بھی راجپوت نہیں تو تیری بوٹیاں نہ اُڑا دوں۔ جاتی کہاں ہے۔

لالی : جاؤں گی کہاں۔ تیرے آگے کھڑی ہوں۔ تلوار نکال۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں۔

جسونت، کلّو کے شاگردوں میں سب سے زیادہ بانکا جوان تھا۔ اس کی ضد مشہور تھی۔ لالی نے اس کے غصّے کو بھڑکا دیا۔ اس نے ایک ڈاکو سے کہا کہ اس چھوکری کو درخت میں ہاتھ باندھ کر لٹکا دو۔ حکم کی دیر تھی۔ لالی ٹانگ دی گئی اور جسونت کوڑا لے کر سامنے آیا۔ کوڑے پڑنے لگے۔ لڑکی دو چار کوڑوں کی تو سہار کر گئی۔ آخر بلبلا اٹھی۔ قاعدہ ہے کہ مصیبت میں اپنے ہمدرد یاد آتے ہیں۔ یکایک کلّو کا کہنا یاد آیا کہ "بیٹی وقت پڑے تو مجھے ضرور یاد کرنا" اس سے زیادہ بُرا وقت اور کیا ہوتا مگر کلّو کہاں جو اپنی منہ بولی بیٹی کی فریاد کو پہنچتا۔ اُسے کون خبر دینے والا تھا۔ تاہم اس نے دل ہی دل میں کلّو کو یاد کرنا شروع کیا۔

خُدا بڑا کارساز ہے۔ کلپتے ہوئے دل کی آواز نے وائرلیس کا کام دیا۔ کلّو بھی اسی جنگل میں کہیں گھوم رہا تھا۔ اس کا جی گھبرایا۔ کیوں؟ اسے خبر نہ تھی۔ وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا اسی طرف آ نکلا۔ جسونت لالی کے نازک بدن پر پھولوں کے بدلے چابک سے بدھیاں ڈال رہا تھا۔ کہ ایک سوار گھوڑا دوڑاتا سامنے سے دکھائی دیا۔ سب ڈاکو گھبرا گئے۔ جسونت کی نظر بھی اُٹھی۔ پہلے تو سمجھا کہ پولس کا کوئی افسر ہے۔ پاس آیا تو پہچانا کہ استاد ہیں۔ خوش ہو گیا۔ سارے ڈاکو چلّا اُٹھے "کلّو استاد کی جے"۔

لالی کو درخت میں لٹکا ہوا چھوڑ جسونت استاد کی طرف مُڑا۔ بڑے ادب سے سلام کیا۔ یہ کلّو کا نہایت چاہیتا شاگرد تھا۔ کلّو نے اُسے گلے لگایا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ لالی پر بھی نظر پڑی لیکن برسوں کی بات کیا پہچان سکتا۔ اس پر ڈاکو بھی ایک نظام کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ لالی تھوڑی دیر تو خاموش ان کی باتیں سنتی رہی۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ کلّو کی بے پروائی اور اپنی تکلیف سے بیتاب ہو کر ملامت آمیز لہجے میں بولی۔

لالی : کلّو میاں سلام۔ اسی دن کے لیے مجھے بیٹی بنایا تھا۔ اب کسی بھولی بھالی لڑکی کو یہ کہہ کر چُل نہ دینا کہ ڈاکو بھی شریف ہوتے ہیں۔ بیٹی کی عزت لٹتی دیکھ کر جس ڈاکو کے دل پر چوٹ نہ لگے جس کی آنکھوں کے سامنے بیٹی کا یہ لکھا پورا ہو اور اسے باپ بن کر غیرت نہ آئے۔ پھٹکار ہے اس کی شرافت پر۔

کلّو نے جو یہ آواز سنی تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ قریب جا کر دیکھا تو لالی ہے۔

وہی گالوڑی لڑکی جسے بیٹی بنایا تھا۔ شرم کے مارے نگاہیں نیچی ہوگئیں۔ سر جھک گیا۔ جلدی سے آگے بڑھا لڑکی کے ہاتھ پاؤ کھولے۔ اس کا دوپٹا جو اُتر کر نیچے گر پڑا تھا اُڑھایا۔ اب لالی گھونگھٹ نکالے الگ کھڑی تھی۔ اور کلّو ندامت سے آنکھیں نیچی کیے الگ کھڑا تھا سوچ رہا تھا۔ جسونت کی سٹّی گم تھی۔ چہرہ فق، غیرت سے پسینا پسینا۔ دوسرے ڈاکو حیران ایک دوسرے کا مُنہ تک رہے تھے۔

یک بہ یک کلّو کے تیور بدلے۔ اس نے تلوار میان سے نکالی اس کا سیاہ رنگ تمتما اٹھا تھا۔ آنکھیں خون برسانے لگی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے بارود کے ڈھیر میں چنگاریاں ڈال دیں۔ گرج دار آواز میں جسونت سے مخاطب ہوا۔

کلّو : جسونت یہ کیا حرکت تھی۔

جسونت : (گڑگڑا کر) ایک برات کو لوٹا تھا۔

کلّو : میں برات کو نہیں پوچھتا۔

جسونت : اس کا سامان پوچھتے ہیں؟ سب جوں کا توں موجود ہے۔

کلّو : جسونت! جسونت۔ بازی بازی بار یش بابا ہم بازی۔

جسونت : نہیں استاد!

کلّو : نہیں کیا؟ اس لڑکی کو اُلٹا کیوں لٹکایا؟

جسونت : جناب یہ بھی برات میں تھی۔

کلّو : اسے بھی آپ نے مال سمجھا تھا۔

جسونت : جی نہیں۔ یہ تو شاید دُلھن ہے۔

کلّو : شاید دُلھن ہے۔ مردود۔ ڈاکوؤں کے نام کو بٹّا لگانے والے میں سب سمجھتا ہوں۔
دولت پر ڈاکہ ڈالتے ڈالتے پرائی بہو، بیٹیوں پر ڈاکہ ڈالنے لگا۔

جسونت کی زبان بند تھی وہ کیا جواب دیتا۔ مُنہ موڑ کر چاہتا تھا بچ کر نکل جائے کہ کلّو کی تلوار چمکی اور جسونت کا سرکٹ کر لالی کے قدموں پر جا گرا۔

کلّو : (آہستہ آہستہ لالی کے پاس آکر) بیٹی یہ جو کچھ ہوا بہت بُرا ہوا افسوس! مجھ کو تم سے باخبر رہنا چاہیے تھا جس کے لیے میں شرمندہ ہوں۔

لالی : میری تقدیر میں یہی بدا تھا۔ دُلھن بھی بنی اور رانڈ بھی ہوگئی۔ (یہ کہتے کہتے وہ رونے

لگی، مگر تم پر کیا دوش۔ تم نے اپنی کرنی کر کے دکھا دی۔ تم سچ مچ میرے دھرم پتا ہو۔ میری لاج خدا نے رکھی یا تم نے۔

روتے روتے لالی کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ وہ اس کے آگے کچھ کہہ نہ سکی۔ کلّو نے اسے گلے سے لگایا۔ تسلّی تشفّی دی اور بہ حفاظت تمام اس کو گھر پہنچانے کا بندوبست کیا۔

لالی کے گھر پہنچنے پر جو کہرام مچا ہوگا ظاہر ہے لیکن میاں کلّو کی شرافت کا بھی گانو بھر میں چرچا ہوگیا۔ بچّے بچّے کی زبان پر کلّو کا نام تھا۔ دنیا میں نہ خوشی کو قیام ہے نہ غم کو۔ چار دن میں لالی اور اس کے گھر والوں کے سوا سب اس واقعہ کو بھول بھال گئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد دِلّی میں غدر پڑا۔ حکومت بدلی۔ انگریزی عمل داری کو استحکام ہوا۔ چُن چُن کر ڈاکو پکڑے جانے لگے۔ دوسرے کلّو کے دل پر بھی جسونت کی اس بُری حرکت کا ایسا اثر پڑا تھا کہ اب قزّاقی اور رہزنی سے نفرت سی ہوگئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے گوشۂ عافیت اختیار کیا اور اپنی گزر معاش کے دوسرے راستے نکالے۔ شعبدے باز بان سیکھیں، عامل بنے، کیمیاگر مشہور ہوئے اور بڑے سلیقے سے ہر رنگ کو نبھایا۔

مرزا اسفندیار بیگ

مرزا اسفندیار بیگ محمد شاہی دربار کے مشہور بانکے مرزا سہراب بیگ کے بیٹے تھے۔ نادر گردی میں رنگیلے بادشاہ کی بدعنوانیوں سے جہاں اور تخت کے فدائیوں نے دلی کو چھوڑ دیا تھا انھوں نے بھی نظام الدین کی بستی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ دو گانو جاگیر میں تھے۔ گھر میں اتا نہ کافی۔ مرزا جز ورس، کنبے میں نہ کوئی سگا نہ سوتیلا۔ ایک بوڑھا، باپ کے وقت کا نوکر اور ایک بڑھیا ماما۔ بڑی موج سے دن گزرتے تھے۔ شغل کوئی نہیں تھا۔ دوسرے تنہائی اور مزاج اکھل کھرا۔ بیماری کا گھر بے کاری۔ بخار آنے لگا۔ یہ بادشاہی احدی دوا درمن کیا جانیں۔ دادا تو خیر میدان جنگ میں کام آئے تھے، باپ مرتے مر گئے اور حکیم کو نبض نہ دکھلائی۔ لیکن ان کی سی آن بان ان میں کہاں۔ چار روز میں لمبے لمبے لیٹ گئے۔ علاج کرتے تو باپ دادا کے نام میں فرق آتا۔ پڑے رنجھنے لگے۔ بیماری اور آقا قسم کے لوگوں کی بیماری بچوں کا سا مزاج ہوتا ہے۔ دل بہلانے کی یہ صورت نکالی کہ دن کو بڑے میاں سے کہانیاں سنا کرتے اور رات بھر بڑھیا سرھانے بیٹھی ہمارا تمھارا خدا بادشاہ اور خدا کا بنایا رسول بادشاہ کیا کرتی۔ طبیعت میں کہانیوں سے بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا ہو گئی۔ رفتہ رفتہ خود بہ خود بخار جاتا رہا۔

بخار تو جاتا رہا مگر مرزا کو پریوں، دیووں اور جادوگروں کی کہانیوں کا ایسا شوق ہوا کہ جب تک کہانی نہ سنتے نیند نہ آتی۔ بڈھے بڑھیا بچارے کوئی داستان گو تو

تھے نہیں کہ اور نئی نئی کہانیاں گھڑتے اور سُناتے۔ جتنی اُنھیں یاد تھیں ختم ہو گئیں تو بڈھے نے کہا کہ میاں امیر حمزہ کی داستان منگا کر پڑھو۔ بڑے مزے کا قصہ ہے۔ اس زمانے میں چھاپے خانے کہاں تھے کہ جس کتاب کی ضرورت ہوئی بازار گئے اور خرید لائے۔ کاتبوں کی خوشامدیں کرنی پڑتی تھیں۔ چھوٹی سے چھوٹی کتاب کے واسطے سیکڑوں روپے خرچ کرنے پڑتے تھے۔ پھر داستان امیر حمزہ اونٹ کا پشتارا۔ بڑی کوشش اور تلاش سے پانسو روپے میں سارے دفتر ملے۔ مگر مرزا خوش تھے۔ اب پڑھنا شروع کیا۔ پہلا دفتر ختم ہوا تھا کہ مرزا جی کی مزاجی کیفیت بدلنے لگی۔ دماغ میں خشکی بڑھی۔ طلسم ہوشں رُبا کا سماں بندھنے لگا۔ صاحب قراں بننے کا شوق چرّایا۔ عقل کے خانے میں اُلّو نے انڈے بچّے دے دیے۔ امیر حمزہ اور ان کی اولاد میں جو افسانوی کمالات پڑھتے تھے، وہ اپنے اندر نظر آتے تھے۔ کبھی لندھور سے کشتی ہے کبھی مہر نگار کا عشق۔ کبھی آسمان پری سے خلوت ہے تو کبھی دیووں سے مقابلہ۔ کہیں جادوگروں کو شکست دے رہے ہیں تو کہیں طلسم کشائی ہو رہی ہے۔ غرض کہ مرزا اب رات دن اسی ادھیڑ بن میں لگے رہتے کہ دنیا میں صاحب قرانی کا نام زندہ کرنا چاہیے۔

اسی اثنا میں ایک رات کو ملکہ بہار کے ہاتھوں لشکرِ اسلام کی تباہی کا حال پڑھتے پڑھتے یکایک ان کے دماغ کی چول بگڑ گئی۔ مکان کے صحن میں کچھ پھولوں کے پودے دو چار کیلوں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ کڑوے تیل کے چراغ کی مدھم روشنی ان پر پڑ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جادوگروں کا لشکر کھڑا ہوا ہے۔ غضب ناک ہو کر اُٹھے۔ پہلو کی کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سامنے کھونٹیوں پر باپ دادا کے وقت کی تلواریں، ڈھالیں وغیرہ ٹنگی ہوئی۔ جھپٹ کر اندر گئے۔ زرہ پہنی، خود سر پر رکھا۔ ڈھال اٹھائی اور تلوار سونت پینترا بدلتے ہوئے میدان میں آکودے۔ منم صاحب قران زماں۔ مال زادی اس بڈھے حمزہ کو اپنے جادو کے زور سے دبا لیا۔ میں آگیا۔ کہاں جاتی ہے۔ یہ کہہ کر اس پودے پر ہاتھ مارا۔ اس درخت کو کاٹ سارا چمن برباد کر دیا۔ بیماری سے اٹھے کمزور آدمی تھے۔ پھر زنگ آلود سر سے بڑا خود، ٹوٹی ہوئی کڑیلوں کی زرہ، ڈھال بھی وزنی، تلوار سے نا آشنا ہاتھ، نازک پودے اور کیلے کے درخت تو خیر کٹ گئے لیکن میاں کا بھی چورا ہو گیا۔ سر لہولہان، گدّی پر زخم، بدن

پر خراشیں۔ آخری کیلے کا درخت جو کٹ کر گرا تو آپ کے اوپر، سہار کی طاقت نہ تھی۔ ساتھ ہی آپ بھی زمین پر لیٹ گئے۔ ڈھال جو ہاتھ میں اُلجھی تو پہنچا اُتر گیا ہائے ہائے کرنے لگے۔

یہ شور سُن کر بُڈّھے بُڑھیا بھی جاگ اُٹھے تھے۔ پہلے تو وہ حیران پریشان سیر دیکھتے رہے مگر جب میاں گرے اور ہائے مار ڈالا کی آواز سنی تو دوڑے اور بڑی مشکل سے اٹھا کر پلنگ پر لائے۔ ڈھال ہاتھ میں سے نکالی، کلائی کو ملا سینکا پٹی باندھی۔ مرزا صاحب خدا جانے کس غوت میں تھے، چپکے آنکھیں بند کیے پڑے رہے۔ بُڑھیا سمجھی کہ سو گئے۔ بوڑھے سے کہنے لگی "غضب ہوا، میاں کا دل چل گیا۔ خدا خیر کرے، جی چاہتا ہے کہ ان موئی کتابوں کو آگ لگا دوں۔" مرزا کے کان میں جو آگ لگانے کی آواز پڑی، بولے "باش او اشرار جادو، تو کیا آگ لگائے گی۔ تو نے مجھ پر چھُپ کر سحر کیا ہے۔ اچھا جاتی کہاں ہے۔ تجھ سے اور تیرے دھگڑے سے پال سے سمجھ لوں گا۔ اب مجھ کو تیرے لیے لوح طلسم کی تلاش میں نکلنا ہی پڑا۔" دونوں نوکر مرزا کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے چلے گئے اور مرزا پڑے پڑے سوچنے لگے کہ اب تو معاملہ کھُل گیا۔ پہلے ہی سابقہ جادوگروں سے پڑا، لوح طلسم کی تلاش ضروری ہو گئی، مگر صاحب قراں کے واسطے کئی چیزیں لازمی ہیں۔ اوّل نظر کردہ شاہ مرداں ہو۔ دوم ایک عیار بھی چاہیے سوم سواری کے لیے کوئی اچھا رہوار ہو۔ چہارم نام و خطاب، پانچواں ہتھیار۔ چنانچہ سب سے پہلے ہتھیاروں کی فکر ہوئی۔ کئی وضع کی تلواریں تو گھر میں موجود تھیں۔ خود اور زرہ بھی مرمّت کے بعد درست ہو سکتی تھی، البتہ گُرز اور نیزہ نہ تھا۔ کپڑے بھی دادا کی میراث میں ملے تھے۔

دماغی بیماری خدا کسی کو نہ دے۔ زخم چرّاتے تھے تو ہائے ہائے کرنے لگتے تھے۔ اور پھر طلسم کشائی کا سودا پکنے لگتا تھا۔ ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ جہاں مرزا کا پلنگ بچھا ہوا تھا، اس کے پہلو کی کوٹھری سے ملی ہوئی مسجد تھی۔ جاڑے کے دن تھے۔ مُلّا نے جو کپکپاتی ہوئی آواز میں اذان دی۔ مرزا اپنی دُھن میں صدائے غیب سمجھے۔ لحاف میں دبکے دبکے پہلے تو آہستہ کچھ عجز و انکسار کے کلمے کہتے رہے۔ بدن کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ اُٹھنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ لیکن چند منٹ کے بعد نہ معلوم

کیا خیال آیا کہ لحاف پھینک کھڑے ہوئے اور کوٹھری کی طرف لپکے۔ کوٹھری میں ایک تابدان تھا اور اس میں سے نورِ سحر کی روشنی چمک رہی تھی۔ تابدان کے سامنے ہاتھ باندھ کر عرض کرنے لگے "یا مظہر العجائب پیر غائب، مرزا سب پر غالب۔ فرمائیے غالب ہ؟" پڑوس میں غالب نام کا ایک خادم رہتا تھا۔ کسی نے اُسے پکارا "غالب" بس پھر کیا تھا مرزا کی مُراد آ ئی۔ نظر کردہ ہو گئے۔ اتنے میں دن نکل آیا۔ روشنی ہو گئی۔ خدا نے اپنے کرم سے یہ مرحلہ تو گھر بیٹھے سر کرا دیا۔ باوجود ہزار کمزوریوں کے اب کون مرزا کی پیٹھ زمین پر لگا سکتا ہے۔ کس کی مجال ہے کہ مرزا کو دیکھے اور سر جُھکا کر ساتھ نہ ہو جائے۔ صاحبقرانی کا انحصار ہی نظر کردہ ہونے پر تھا۔

نظر کردہ ہونے کے بعد اسی دن مرزا نے لُہاروں کو بلا کر کہا۔ "جانتے ہو تم کس کے حضور میں حاضر ہو۔ نظر کردۂ شہنشاہِ مشارق والمغارب مظہر العجائب، سب پر غالب، ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جُھک کر کھڑے ہو۔" لُہار غریب ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔ مرزا مسکرائے "تم ابھی نہیں جانتے۔ میرا ڈنکا بجے گا تو جان جاؤ گے۔ خیر تمہاری گستاخی معاف۔ اچھا، میرے واسطے ایک صاحبقرانی گُرز تیار کرو۔ مگر میرے بھائی امیر حمزہ کے گرز میں اور اس میں سرِ مو فرق نہ ہو" لُہار مرزا کو دِلّی کا ایک شریف مُغل بچّہ اور شاہی بانکوں کی اولاد سمجھتے تھے۔ بات چیت کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ دور سے دیکھا اپنے قاعدے کے مطابق سلام کیا اور بس۔ آج جو گفتگو سُنی تو حیران ہو گئے۔ جاہل پھر بھی پرانے قرینے کے آدمی تھے۔ سمجھ تو گئے کہ مرزا کی باتوں میں کچھ بے تکاپن سا ہے۔ لیکن کیا کرتے آن پھنسے کا سودا تھا۔ ان میں جو سب سے زیادہ عمر رسیدہ تھا بولا "سرکار ہم نے کبھی امیر حمزہ کا گُرز دیکھا نہیں ہے۔ کیوں کر بنا سکتے ہیں۔ نمونہ دکھا دیجیے تو اللہ نے چاہا ویسا ہی بن جائے گا۔"

مرزا : میں تو سمجھا تھا تم ایران کے کاوا آہن گر کی اولاد ہو جس نے رستم واسفندیار کے گرز بنائے تھے (قہقہہ لگا کر) مگر نہیں ان میں اور بھائی حمزہ کے گُرز میں بہت بڑا بل ہے۔ کہاں ایک پہلوان کا گرز کہاں صاحبقراں کا۔ اچھا میں تمھیں نمونہ دکھاؤں۔

لُہار : خدا آپ کے ہاتھوں میں طاقت دے۔ پھر بنانا کیا مشکل ہے مگر حضور

روپے کا بہت خرچ ہے اور محنت بھی پوری ہوگی۔

مرزا : بدمعاش کہیں کے۔ تم پر بھی لقائے بے بقا کا داؤ چل گیا۔ ارے ذرا میں کشورکشائی کا سامان کرلوں۔ سب سے سمجھ لوں گا اور تم نے یہ کیا کہا کہ خدا آپ کے ہاتھ پاؤں میں طاقت دے "منم نظر کردۂ شاہ مرداں (مسکراکر) ہاں یہ سچ کہا کہ صَرف ہوگا۔ میں بھی جانتا ہوں۔ ہشت دھات کا بنے گا۔ جس میں سونا، چاندی، تانبا، سیسہ، فولاد وغیرہ وغیرہ ساری کی ساری دھاتیں ہوں گی۔ پھر جب میں صاحبقراں ہوں تو روپے کی کیا پروا۔ بناؤ بناؤ ورنہ ایک نعرے میں تمھاری بستی کو گرد برُد کر دوں گا۔

لُہار : مگر حضور نمونہ ہونا چاہیے۔

مرزا : نہیں باز آؤ گے اپنی حرمزدگی سے (مسکراکر) ڈرتے ہو کہ اگر کام بگڑ گیا تو کم بختی آجائے گی۔ اچھا کل نمونہ آجائے گا۔

لُہار اپنا دامن چھُڑا اسلام کر اُدھر روانہ ہوئے اِدھر مرزا کمر باندھ امیر حمزہ کے گرز کی جستجو میں دلّی چلے۔ دیوانے کو بعض اوقات سوجھتی دور کی ہے۔ سیدھے شاہی میرشکار کے مکان پر پہنچے۔ میرصاحب اور مرزا کے والد ایک ہی دربار کے متوسّل، بچپن کے یار۔ مدّت کے بعد جو اپنے مرحوم دوست کے بیٹے کو دیکھا تو لپٹ گئے۔ "یہ چاند آج کدھر سے نکل آیا۔ میاں دِلّی کیا چھوڑی کہ صورت کو ترسا دیا۔ آج کیا جاتی دنیا دیکھی کہ اِدھر کا رُخ کیا۔" خیر یہ ہوئی کہ مرزا پر اس وقت جذبۂ صاحبقرانی غالب نہ تھا۔ بولے "چچا میاں دِلّی اب کیا مُنہ لے کر آئیں۔ ابّا جان نے جب اسے چھوڑ دیا تو ہمارا کیا واسطہ رہا۔"

میرصاحب : بھیّا دِلی کا اس میں کیا قصور ہے۔ بھائی سہراب بیگ نے خواہ مخواہ اپنا تیہا دکھا دیا۔ پشتوں کے تعلقات گھڑی میں توڑ کر رکھ دیے۔ اور ایسے کہ نہ تیر اسوت نہ میری کتائی، بادشاہ شطرنج کا سہی پھر بادشاہ ہے۔ آج کو پرانا سلسلہ قائم ہوتا تو تم عرب سرائے میں گم نام پڑے رہتے۔

مرزا : حضت۔ اب گڑے مُردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ۔ خدا کو منظور ہے تو میرا نام سُن لینا۔ مغرب سے مشرق تک صاحب قرانی نقارہ بجے گا۔

ان آخری جملوں کو میر صاحب سمجھے نہیں اور سمجھتے کیوں کر؟ انھیں کیا خبر کہ ان کے دوست کے بیٹے کے دماغ میں گیدڑ نے کاٹ کھایا ہے۔ وہ ان باتوں کو مرزا کا موروثی لاف وگزاف سمجھے اور کہنے لگے "اچھا بھئی خدا تمھیں زندہ اور سلامت رکھے۔ ایک دوست کی یادگار ہو۔ جہاں رہو خوش رہو۔ کہو شادی وادی بھی کی یا اکیلے ڈنٹر پیل پیل کر کر دندناتے ہو۔

مرزا : ملکہ جہاں نما سے شادی کروں گا۔ دوسری کس عورت میں طاقت ہے کہ میری قوتوں کو برداشت کرے۔

میر صاحب سمجھے کہ شاید کسی سلاطین زادی سے شادی کرنے کی فکر میں ہیں۔ بولے "اچھا میاں خدا مبارک کرے۔ اور سناؤ گزر تو مزے میں ہے۔ میری کسی خدمت کی ضرورت ہو تو دل وجان سے موجود ہوں"

مرزا : فی الحال تو ایک صاحب قرانی گرز کی ضرورت ہے۔ آپ کے پاس تو ہوگا۔ نمونے کے لیے چاہیے۔ میر صاحب نے بڑے غور سے مرزا کی طرف دیکھا کئی منٹ سوچتے رہے کہ میری سماعت نے دھوکا کھایا ہے یا سمجھ کا قصور ہے۔ مرزا کے ظریف دماغ نے بہت صبر کیا۔ ان کی وحشت کافی دیر تک رہی لیکن میر صاحب کی خاموشی کا جادو۔ ایسا نہ تھا کہ مرزا کو دورہ نہ پڑ جاتا۔ دست بستہ ہو کر بولے "اے حکیم بزرگ، پشتیبان طلسم سپید، میری امانت مجھے عنایت ہو۔ مجھے صاحبقرانی بشارت ہو چکی ہے۔ اب دیر کرتے ہیں سراسر آپ ہی کا نقصان ہے"

میر صاحب کو مرزا کے توازنِ دماغی میں شک ہوگیا۔ دل میں بہت کُڑھے۔ خدا کی قدرت عمروں کے دوست کا ایک بیٹا اُس کے بھی دل کا ورق اُلٹ گیا۔ حیران تھے۔ کہ کیا جواب دیں۔ اتنے میں مرزا نے اٹھ کر میر صاحب کے قدم پکڑ لیے اور گڑگڑا کر کہنے لگے۔ "حضور شاید کسی نشانی کے منتظر ہیں۔ مرقع نکالیے۔ طلسم کشائی کی تصویر سے میری صورت ملا لیجیے۔ اچھا ادھر دیکھیے میرے چہرے پر نظر کر دگی کا نور ہے یا نہیں۔ اور میں تو فی الحال صاحب قرانی گرز نمونے کے طور پر مانگتا ہوں۔ طلسمی گھوڑا، طلسمی جوڑا اور طلسمی ہتھیار دہانۂ طلسم پر دیجیے گا۔ ابھی ان کی ضرورت نہیں۔

میر صاحب کی سٹی گم تھی کہ ایک نئی قسم کے دلوانے سے واسطہ پڑا ہے۔ کیوں کر پیچھا

چھڑائیں مگر پرانے زمانے کے آدمی تھے دل نہ مانا آخر پوچھنا ہی پڑا کہ "صاحبزادے یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ نصیب اعدا کیا کچھ طبیعت ناساز ہے؟"

مرزا : (آنکھیں نیچی کر کے) نصیبِ اعدا خراب ہو چکا ہے۔ دشمنوں کی تباہی میرے نام لکھ دی گئی ہے۔ آپ یہ سب کچھ جانتے ہیں۔ رازِ قضا و قدر سے آپ پوری طرح واقف ہیں۔ اب دیر نہ کیجیے۔ گرز عنایت ہو جائے۔"

میر صاحب مرزا کے سڑی پن سے تنگ آ گئے اور اس کے سوا کوئی مفر کی صورت نظر نہ آئی کہ ان کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ گرز کی تصویر حوالے کریں۔ چنانچہ اٹھ کر اندر گئے اور ایک کلّہ شیر کے گرز کی تصویر مرزا کے سامنے پیش کی اور کہا "برخوردار! دیکھو صاحبقرانوں کا گرز ایسا ہوتا ہے۔ اسے لے جاؤ اور جب باطن طلسم میں جانے کا وقت آئے گا اصلی گرز مع دوسرے سامان طلسم کشائی کے تمہیں دیا جائے گا۔ مرزا نے نہایت پھرتی سے تصویر پر قبضہ کیا اور میر صاحب سے بغل گیر ہو رخصت ہوئے۔ گھر پہنچتے ہی مرزا نے لُہار دل کو طلب کیا اور نقشا سامنے رکھ کر حکم دیا کہ ایسا گرز بننا چاہیے۔ کہو کب تک تیار ہو جائے گا؟

لُہار : غریب نواز کم سے کم ایک مہینے میں اور آپس میں کچھ اشارے کرنے کے بعد روپیا مہیا کرنے کی درخواست کی۔

مرزا : کتنا روپیا چاہیے؟

لُہار : دھاتیں عمدہ ہوں گی۔ سرِدست ایک ہزار روپیا تو ہو۔ لیکن حضور نے وزن نہیں فرمایا۔

مرزا : (مسکرا کر) پکّے شہدے ہو صاحب قرانی قوت کا اندازہ کرنا چاہتے ہو۔ اسے یہ بازو عرب سرائے کو چاہیں تو اٹھا لیں۔

لُہار : سرکار بھیم کی چھٹنکی جتنا؟

مرزا : لاحول ولا قوۃ۔ یہ کس کا نام لیا۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔ ہو نہ آخر اسی ننتا بہار کی نالکہ کے بہکائے ہوئے۔ دیکھو بھئی دغا نہ دینا۔ ورنہ سمجھ لو کہ بس۔

لُہار : آخر آپ ہی فرمائیے۔

مرزا : (ہنس کر) تو پھر میں ہی بتا دوں۔ میاں پورا سومن شاہی۔ سمجھ گئے۔ لو اب جاؤ۔

روپے کا بھی کل تک انتظام ہو جائے گا۔ اور ہاں یہ ہمارا خود، چار آئینہ اور زرہ بھی لیتے جاؤ۔ ان کی مرمّت ہو گی۔ اور تلواروں پر بھی صیقل کر دینا۔ تمھاری استادی دیکھ لوں تو پھر نیزے وغیرہ بھی بنوانے ہیں۔

لہاروں سے فرصت پاکر مرزا صاحب نے روپے کی فراہمی کے متعلق غور کرنا شروع کیا۔ گھر کی نقد پونجی تو پہلے ہی بھنگ کے بھاڑے میں چلی گئی تھی۔ قصّہ امیر حمزہ، دفتر کوچک باختر، بالا باختر، طلسمِ ہوش رُبا، ہوش افزا، بوستانِ خیال اور دوسرے دیو، جن پری کی یہ دماغی عیاشیاں ان کے نزدیک کفر و اسلام کی معرکہ آرائیوں کے سچّے واقعات اور بہادرانِ عالم کی حقیقی سوانح عمریاں تھیں، جن کو پڑھتے پڑھتے ان کا دماغ سڑ گیا تھا۔ گاؤں باقی تھے وہ شاہی عطیّہ کیوں کر بیچتے اور کون خریدتا۔ بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ مرزا صاحب پر صاحب قرانی کا بھوت سوار۔ پہلے ہی مرحلے پر اٹکنا بدشگونی میں داخل۔ بچارے عجب گومگو میں مبتلا ہو گئے۔ ادھر ساری بستی میں ان کے خللِ دماغ کا چرچا ہو گیا۔ انگلیاں اٹھنے لگیں۔ جدھر نکل جاتے جوان، بوڑھے، عورتیں بچّے تماشا بنا لیتے۔ نوجوانوں نے بنانا شروع کر دیا۔ لوگ ان سے مذاق کرتے۔ پھبتیاں کستے اور یہ اپنے دماغی تعطّل سے ان سب باتوں کو اپنے حق میں نیک فال سمجھتے۔ بنیوں اور مہاجنوں کو ایک نئی اسامی ملی۔ سلطنت کی کمزوریوں کا زمانہ تھا۔ مرزا صاحب کے دونوں گانو ہضم کرنے کیا مشکل تھے۔ بڑے نخروں کے بعد رہن بالشرط پر معاملہ ہوا اور پچاس ہزار کی مالیت پر صرف دس ہزار روپے ملے۔

روپے ہاتھ میں آتے ہی مرزا کے خیالات میں ہولی کا پھاگ اچھلنے لگا۔ لہاروں کو احکام جاری ہوئے۔ درزیوں کو طلب کیا۔ دادا کی وردی اپنے جسم پر درست کرائی۔ گُرز بنا۔ نیزوں کے پھلوں پر دھار رکھی گئی۔ تلواروں کے قبضوں اور میانوں کی مرمّت ہوئی۔ خود، زرہ اور چار آئینہ زنگ سے پاک ہو کر سامنے آگیا، تو اب ایک یارِ غار و عیّار کی ضرورت ہوئی۔ جستجو لازمی تھی۔ لیکن عمر عیّار جیسے عیّار کا ملنا بھی آسان کام نہ تھا، جب تک خدا کا فضل شاملِ حال نہ ہو۔ یہ مہم کس طرح سر ہو سکتی ہے۔ صبح شام ویرانوں میں نکل جاتے۔ پرانے مقبروں میں جاکر آواز لگاتے "آیار آجا" کب تک منہ چھپائے رہے گا۔ یہاں تو منزل کھوٹی ہو رہی ہے۔ جادوگروں نے ملکہ کو قید کر لیا ہے۔ حیف ہے کہ وہ وہاں سختیاں

چھیلے اور مرزا یہاں تمھارے انتظار میں سرگرداں پھرے"۔ آخر ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ کچھ مدار یے فقیر آگرہ سے دلّی جاتے ہوئے نظام الدین کی بستی کے باہر کسی مقبرے میں رات بسر کرنے کے لیے ٹھہر گئے۔ ان فقیروں کے ساتھ بھان متی اور کچھ بہروپیے بھی تھے۔ بہروپیوں کی ٹولی میں ایک شاہ دولہ کا چوہا بھی تھا۔ عام طور پر شاہ دولہ کے چوہے ناقص العقل، ناقص الخلقت اور ڈرپوک جانوروں کی طرح پورے پورے عجائب خانے میں نمایش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان کی حرکات، سکنات اور ان کی باتوں میں معصومیت ساتھ وحشت بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ شاہ دولہ کا چوہا اپنی نوعیت کے لحاظ سے خاصا قدرت کا تماشا تھا۔ ٹیا سا سر، تنگ پیشانی، لمبوترا چہرہ، چھوٹی چھوٹی زیرہ سی آنکھیں۔ لمبا قد، بڑے بڑے ہاتھ پانو، اوپر کا دھڑ چھوٹا، نیچے کا بڑا، حد درجے کا مسخرہ، پرلے سرے کا مذاقیہ، روپ بھرنے میں کمال، چوروں کا استاد، فریبی مکار۔ اتفاق سے اپنے معمول کے مطابق گشت لگاتے ہوئے مرزا جواد ادھر آنکلے تو ان فقیروں، بھان متیوں اور بہروپیوں کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی نگاہ جو شاہ دولہ کے چوہے پر پڑی تو عمر عیار کی تصویر آنکھوں میں کھنچ گئی۔ دل نے گواہی دی کہ ضرور عمر عیار کی نسل سے ہے۔ خدا کی کارسازی کے قربان خوب ملایا۔ ادھر شاہ دولہ کے چوہے نے جو انھیں اپنی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھا، مسخرہ تو تھا ہی۔ اس نے طرح طرح کی شکلیں بنانی شروع کر دیں۔ کبھی مُنہ چڑائے کبھی انگوٹھے دکھائے، کبھی آنکھیں مچکائے۔ مرزا کو یاد آیا کہ عیار ہمیشہ اپنا تعارف عیاری ہی کے ذریعے سے کیا کرتے تھے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ اپنا داؤ کر جائے۔ اس نے مجھے پہچان تو لیا ہے اب اسے عیاری کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ یہ سوچتے ہی اپنی جگہ سے ایک جست کی اور یہ کہہ کر "کیوں یار کیسا پہچانا ؂

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوشی

من انداز قدت را می شناسم"

شاہ دولہ کے چوہے کو جا لپٹے۔ وہ اپنی خلقت کے برعکس بلا کا پھبت تھا۔ مرزا کی بغل سے نکل اکھیڑ میں بیٹھ ایسا پٹخنا دیا کہ چاروں خانے چت۔ ان کا گرنا تھا کہ فقیروں وغیرہ نے قہقہہ لگایا اور شاہ دولہ کے چوہے نے خم ٹھونک کر پینترے بدلنے شروع کیے۔ اور مسخرے پن کے انداز سے کہا "مردوئے عورت ذات پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ اب

اُٹھ کر آنا سامنے، دیکھوں تیری مردانگی۔ پڑا پڑا کیا کوس رہا ہے۔ ذرا کھڑا ہو، ایک پکڑ اور ہو جائے۔"

مرزا کا دماغ تو صاحب قرانی کی ہوا میں پریشان تھا۔"شرم چہ کتی است کہ پیش مرداں بیاید" چھپنا کیا معنی، پڑے پڑے کھسیانی ہنسی ہنسے اور بولے"بھائی شاہ پور تم سچے تمہارے دادا سچے۔ مجھے پہلے ہی بشارت ہو چکی تھی کہ آج چاند نکلنے سے پہلے تم ملوگے اور عیاری کر کے ملوگے۔ میں تو جان بوجھ کر تمہارے اڑنگے پر چڑھ گیا کہ تمہاری پہلی عیاری ہے خالی نہ جائے ورنہ صاحب قراں کی بیٹھ کوئی زمین سے لگا سکتا ہے۔ لو اب ادھر آؤ۔ مجھے اٹھاؤ اور دیکھو میرے سر سے خون نکل آیا اپنی زنبیل سے مرہم سلیمانی نکال کر لگاؤ۔" شاہ دولہ کے چوہے نے جو مرزا کی بہکی بہکی باتیں سُنیں تو تاڑ گیا کہ اس شخص کے دماغ میں کسی خاص قسم کا خلل ہے۔ ٹھرکتا کولھے مٹکاتا مرزا کے قریب پہنچا اور مُنہ سے مُنہ ملا کر پہلے تو خوب پیار کیا اور پھر کہنے لگا۔" مجھ نگوڑی کو کیا خبر تھی کہ تم کاغذ کے پٹے باز ہو۔ یوں گر پڑے جیسی پُرانی دیوار۔ ہے ہے میرے بھائی کو چوٹ تو بڑی لگی ہوگی۔ اچھا اب اُٹھ بیٹھو۔ مجھ سے بھی دادا پیر رات کو ساری باتیں کہہ گئے ہیں۔"

مرزا مسکرائے۔"صاحب قراں ہوں یا ہنسی ٹھٹھا رہا تھ پکڑ کر اُٹھتے ہوئے، میں اپنی صاحب قرانی طاقت نہیں جتاتا۔ تم تو جانتے ہی ہو۔ اچھا گھر چلو پھر کشورستانی کے لیے انتظامات کرنے ہیں۔" یہ کہہ کر مرزا شاہ دولہ کے چوہے کو ساتھ لے چلے اور راستے میں ایسی باتیں کیں کہ وہ مسخرا بھی کچھ تو مرزا کی حماقت کا تماشا دیکھنے اور انہیں بولنے کے لیے اور کچھ اس سبب سے کہ اس کی عقل کا خانہ بھی چھوٹا تھا، ان کے ساتھ رہنے کو تیار ہو گیا۔ اب مرزا کے لوازماتِ صاحب قرانی میں دو چیزوں کی کمی رہ گئی۔ ایک سواری اور دوسرے نام۔ چنانچہ شاہ دولہ کے چوہے کی صلاح سے سواری کے واسطے ایک مرکھنا بھینسا انتخاب کیا جو بستی میں خونی مشہور تھا اور جسے بستی والوں نے لاوارث کر کے نکال دیا تھا۔ مگر مرزا کو اس کی قیمت بھی خاطر خواہ ادا کرنی پڑی۔ ہندستان ہمیشہ سے حیوانات کے سوا انسانوں کے ساتھ ہمدردی کا عادی ہی نہیں بلکہ دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا یہاں کے بسنے والوں کی معمولی بات ہے، خواہ وہ کمزوری مالی ہو یا معاشرتی، جسمانی ہو یا دماغی۔

یہ مسئلہ بھی طے ہوگیا تو نام تجویز ہونے لگے۔ بڑی بحث کے بعد "شیر ببر کچھار صاحب قرانِ نرگا و میش سوار مرزا اسفندیار نام دار" نام قرار پایا اور مہماتِ ملک گیری پر کمر بستہ ہو ایک دن سرِ شام دونوں نکل کھڑے ہوئے۔

سیدانی بی

سیدانی بی کا ایک وقت میں بڑا دور دورہ تھا قلعے کی اچھی اچھی مغلانیاں ان کے سامنے کان پکڑتی تھیں۔ محلات میں جہاں کوئی نیا جوڑا سلا، کسی نئی وضع کی لکائی کا ذکر ہوا اور یہ بلائی گئیں۔ شہر کی بیگمات میں بھی ان کے ہنر کی دھاک تھی۔ سب انھیں آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ آج پالکی چلی آرہی ہے کہ بڑی سرکار نے بلایا ہے۔ کل ڈولی کھڑی ہوئی ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم نے یاد کیا ہے۔ نہ رات کو فرصت تھی نہ دن کو چین۔ صبح کہیں مہمان ہیں تو شام کو کہیں۔ لیکن رہے نام سائیں کا۔ بڑھاپا آیا، ہاتھ پاؤں نے جواب دے دیا۔ آنکھیں دھندلا گئیں، اب کون پوچھتا۔ دنیا اور مطلب۔ مطلب نہ رہا تو کیسی خاطر داری۔ ہارے وقت کا کوئی ساتھی نہیں۔ بچاری کو ٹکڑے کا سہارا دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ جب بہت پریشان ہوئیں تو پڑوس میں ایک میر صاحب رہتے تھے۔ ان کی بیوی نے انھیں ترس کھاکر اپنے ہاں رکھ لیا۔

سُنا ہے کہ یہ نہایت شریف گھرانے کی بیٹی تھیں۔ مرہٹہ گردی میں ان کا خاندان تباہ ہوگیا۔ برس دن کی بیاہی بیوہ ہوگئیں۔ اس زمانے میں دوسری شادی کرنا بڑا عیب سمجھا جاتا تھا۔ مغلانی کا پیشہ اختیار کرلیا اور اپنی ہنرمندی کی بدولت رنڈاپا گزار دیا۔ جوانی تو عزت آبرو سے کٹ گئی۔ خوب کمایا۔ ہزاروں روپے انعام میں لیے مگر رکھنا نہ جانا۔ دل کی حاتم اور طبیعت کی نرم تھیں اور پرانے شریفوں میں

ایک یہی عیب ہوتا ہے کہ وہ وقت کی قدر نہیں کرتے۔ خدا کی بے نیازی کو بھول جاتے ہیں۔ بنے ہوئے زمانے میں بگڑنے کا خیال ہی نہیں آتا کہ سدا یہی لہر بہر رہے گی۔ سیدانی بی جوانی بھر اسی غلط فہمی کا شکار رہیں۔ بڑھاپے نے آن دبایا۔ طاقتیں دغا دے گئیں تو آنکھیں کھلیں اور دوسروں کے سہارے پر زندگی کے اندھیرے دن پورے کرنے پڑے۔

میر صاحب کے گھر والے چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب کے سب انتہا سے زیادہ خوش مزاج نیک دل اور خدا ترس تھے۔ ہر ایک سیدانی بی کو خدا کا بھیجا ہوا مہمان سمجھ کر ان کے آگے بچھا جاتا تھا۔ سیدانی بی دو چار دن تو ذرا غمگین اور شرمندہ شرمندہ سی رہیں پھر ان کا بھی دل کھل گیا اور اس طرح رہنے لگیں جیسے اپنے گھر میں ہیں۔ ہاتھ کانپتے تھے۔ نگاہ موٹی ہو گئی تھی۔ سوئی کا ناکا مشکل سے سوجھتا تھا لیکن ساری عمر محنت کر کے کھایا تھا۔ پرائی روٹی مفت کیسے کھا سکتی تھیں۔ صبح نماز پڑھ کر بچوں کو لے بیٹھتیں۔ قرآن شریف پڑھاتیں، نصیحتیں کیا کرتیں۔ دوپہر کو سینا پرونا، کاڑھنا سکھاتیں۔ شام ہوتی تو باورچی خانے میں جا کر کھانا پکانے کی ترکیبیں بتاتیں۔ رات آتی عشا کی نماز سے فارغ ہو کر بڑے مزے کی کہانیاں سُناتیں۔ کہانیاں ایسی اچھی ہوتیں کہ بڑے بھی آ جاتے۔ میر صاحب اور ان کی بیوی دونوں خوش تھے کہ سیدانی بی کو بچوں کی تربیت کے لیے خدا نے بھیج دیا۔ ایسی شریف۔ روزہ نماز کی پابند ہنرمند اُستانی صرف روٹیوں پر کہاں میسّر آتی ہے۔ اور بچّے ایسے گرویدہ ہوئے کہ دن رات سیدانی بی کے پاس بیٹھے رہتے۔

مشہور تھا کہ سیدانی بی پرستان میں بھی ہو آئی ہیں۔ وہاں کے بادشاہ نے انھیں اپنی بیٹی کا جہیز ٹانکنے کو بلایا تھا۔ اور انھوں نے وہاں دنوں رہ کر بڑے بڑے تماشے دیکھے ہیں۔ گھر والوں کو یہ خبر تھی لیکن کبھی خیال نہیں آیا کہ سیدانی بی سے پوچھتے تو، کہ کیا بی سچ مچ تم پرستان گئی ہو۔ شاباش تمھارا جگرا تم کو ڈر نہیں لگا۔ ایک دن سردیوں کی رات تھی، دالانوں کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ چھوٹے بچّے لحافوں میں دبکے اور بڑے لڑکے لڑکیاں انگیٹھی کے چاروں طرف بیٹھی کہانی سُن رہی تھیں کہ اتنے میں میر صاحب کی بیوی نماز وظیفے سے فارغ ہو کر آئیں۔ اتفاق سے کہانی بھی انڈا شہزادی کی تھی۔ جب یہ ذکر آیا کہ کانٹرے دیو کی جو شہزادی پر نظر پڑی تو سوتی کی سوتی کو پلنگ

سمیت اڑا کر لے گیا، کہنے لگیں "سیدانی بی یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تمھیں بھی پرستان کے بادشاہ کا کوئی آدمی پرستان لے گیا تھا اور تم وہاں سے بڑا انعام واکرام لائی تھیں۔ کیا سچ ہے؟

سیدانی : ہاں بیوی ہے تو سچ۔ بلکہ کئی دفعہ جنوں اور پریوں نے مجھے بلایا ہے۔

میر صاحب کی بیوی : اوئی! اور تم بے دھڑک چلی گئیں۔

سیدانی : پہلی دفعہ تو مجھے دھوکے سے لے گئے تھے۔ رستے میں جب بھید کھلا تو بہتیری ڈری۔ لیکن کیا کرتی دل کو مضبوط کرلیا۔ اللہ کو یاد کرتی ہوئی چلی گئی۔ نہ جاتی یا روتی بیٹھتی تو جانے کیا آفت آتی۔ اس کے بعد جب گئی ہنسی خوشی گئی، ہنسی خوشی آئی، بیگم صدقے اپنے رسول کے۔ اس پر ایمان رکھنے والے کا کہیں بال بیکا نہیں ہوتا۔ پرستان میں بھی میری وہ خاطریں ہوئیں کہ کیا کہوں۔

میر صاحب کی بیوی : کچھ بھی سہی بُوا میرا تو زہرہ پھٹ جاتا۔ صورت دیکھتے ہی جان ہی نکل جاتی۔

سیدانی : نہیں بی۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ڈر کی باتوں سے ڈر لگا کرتا ہے۔ جہاں ڈر سامنے آیا پھر کچھ بھی نہیں۔ دیکھو بیماری سے لوگ کتنا بھاگتے ہیں اور جب بڑے سے بڑا دُکھ بھی آجاتا ہے تو سہنا ہی پڑتا ہے۔

میر صاحب کی بیوی : میں تو پھر کہوں گی کہ تم کو شاباش ہے۔ صد رحمت اس پر جس نے تمھیں دودھ پلایا۔ اچھا ہمیں بھی تو سناؤ کہ کیا ہوا تھا۔ کیوں گئیں تھیں۔ پرستان کیسا ملک ہے وہاں کیا کیا دیکھا؟

سیدانی : وہ قصہ یاد آجاتا ہے تو کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ پرستان کی شہزادی جس کے جوڑے ٹانکنے گئی تھی بہت سر ہوئی۔ دوسری پریوں نے بھی منتیں کیں کہ "سیدانی اماں یہیں رہ جاؤ۔ دنیا میں اب تمھارا کون ہے" مگر میں نے ایک نہ مانی۔ مجھ بدنصیب کو تو اپنے جیسے انسانوں کی بے مروتیاں دیکھنی تھیں۔ پرستان میں کیوں بستی، وہ تو اللہ نے تمھارے دل میں رحم ڈال دیا جو گور گڑھے کا ٹھکانا ہو گیا، ورنہ تیرے میرے دروازوں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔

میر صاحب کی بیوی : سیدانی بی. سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بندے میں کیا طاقت ہے کہ بھوکے کو دے یا پیٹ بھرے سے چھینے۔ ہر ایک اپنی تقدیر کا کھاتا ہے۔ ہماری کیا اصل کہ کسی کے ساتھ سلوک کریں۔ وہ زبردستی ہم سے تمھاری خدمت کرا رہا ہے۔

سیدانی : خیر تو اب تم کو اپنی بیتی کہانی سناؤں۔ بیگم یہ وہ دن تھے کہ نواب اعظم الدولہ بہادر کی اکلوتی بیٹی کے بیاہ کی تیاری ہو رہی تھی۔ مارا مار جوڑے سل رہے تھے۔ اوّل اوّل تو مجھے رات دن وہیں رہنا پڑا۔ کام ہلکا ہوگیا تو دن کو چلی جاتی اور شام کو اپنے گھر چلی آتی۔ ایک روز جیسے بچے مکتب سے بھاگتے ہیں، میرا بھی جانے کو جی نہ چاہا۔ اور کئی جگہ سے بلاوے آئے نہ گئی۔ شاید جمعہ تھا۔ کتنے ہی دن نہائے کو ہوگئے تھے خوب نہائی۔ شام ہوگئی۔ بونٹ پلاو مجھے بہت بھاتا ہے۔ ماما سے بونٹ پلاو پکوایا۔ تھکی تھکائی لیٹی تھی اتنے میں جھٹپٹا ہوگیا۔ پلاو دم پر تھا کہ باہر سے کسی نے آواز دی "سیدانی بی کو سرکار نے یاد کیا ہے۔ پینس بھیجی ہے، جس طرح بیٹھی ہو اسی طرح فوراً چلی آؤ۔" میں بڑے نخروں سے جایا کرتی تھی۔ ایسے بے وقت اور اپنے بھاؤں کی پکوائی ہوئی چیز چھوڑ کر کھڑے ہو جانا میری عادت کے بالکل خلاف تھا، لیکن ہونے والی بات میں نے ذرا انکار نہ کیا اور جیسی بیٹھی تھی، سفید چادر سر پر ڈال سوار ہوگئی۔

نواب صاحب کا محل میرے گھر سے کوئی دو آنے ڈولی ہوگا۔ قاضی واڑے سے نکلے اور خانم کا بازار آیا۔ پہلے تو مجھے کچھ خیال نہ ہوا۔ جب بہت دیر ہوگئی اور ہٹو بچو کی آواز نہ آئی۔ بازار کے چراغ بھی جھلکتے ہوئے نہ دکھائی دیے تو پردے کی جھری کھولی۔ اب جو دیکھتی ہوں تو جنگل سائیں سائیں کر رہا ہے اور پینس کو جیسے پہیے لگے ہوئے ہیں۔ اُڑی چلی جا رہی ہے۔ کلیجا دھک سے ہوگیا۔ بدن میں سنسنیاں آنے لگیں۔ ہاتھ پانو ٹھنڈے پڑ گئے کہ یہ کیا غضب ہوا۔ یہ موئے کہار کہاں لیے جاتے ہیں۔ اس جنگل میں کون سی سرکار ہے لیکن مرتا کیا نہ کرتا دل کڑا کر کے میں نے اپنی آواز نکالی اور پوچھا "ارے کم بختو مُنہ سے تو پھوٹو مجھے کہاں لے جاؤ گے

ارے وہ تمھاری کون سی ستیاناسی سرکار ہے؟" ہنستے ہوئے کسی نے جواب دیا "سیدانی بی خفا کیوں ہوتی ہو۔ بادشاہ سلامت نے بلایا ہے۔ کوئی دم میں محلات دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پالکی کے پاس بول رہا ہے۔ مُنہ نکال کر جو دیکھا تو بیگم کیا کہوں ایک بجا کی شکل کا آدمی تھا۔ بکرے کا سا سر، گھوڑے کی سی ٹانگیں اور پالکی آپ ہی آپ چلی جاتی تھی۔ نہ کہار تھے نہ کہاریاں۔ اب تو ڈر کے مارے میرا دم گھٹنے لگا۔ آنکھیں بند کرلیں اور کلمہ پڑھنے لگی کہ اس بلا نے کھایا۔ ڈھیر ہوکر رہ گئی۔ منٹ دو منٹ کے بعد پھر ہمت کی کہ اوّل مرنا آخر مرنا پھر مرنے سے کیا ڈرنا۔ اور للکار کر بولی۔ "ارے جوانا مرگ تو کون ہے۔ جن ہے یا بھوت؟ یاد رکھ میں سیدانی ہوں۔ مجھ کو نہ ستا نہیں تو جل کر خاک ہو جائے گا۔ بھلا چاہتا ہے تو مجھے یہیں اتار دے۔"

اس نے کہا "سیدانی بی گھبراؤ نہیں۔ ہم اور ہمارا بادشاہ سیدوں کو بہت مانتے ہیں۔ خاطر جمع رکھو، کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہماری شہزادی کی شادی ہے۔ کپڑے سی کر چلی آنا۔ جتنا مانگو گی انعام ملے گا۔ لو دیکھو وہ سامنے ہمارے بادشاہ کا محل ہے۔" بڑی مشکل سے ڈرتے ڈرتے آنکھیں پھاڑ کر جو دیکھا تو واقعی پالکی ایک عالی شان دروازے پر رکھی ہے۔ روشنی ایسی تھی کہ دن معلوم ہوتا تھا، سوئی گر پڑے تو اٹھالو۔ اور مزہ یہ کہ سورج تھا نہ چاند، نہ فانوس کہیں نظر آتے تھے نہ لالٹین۔ چوب دار، باری دار، مردھے ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر دوڑ رہے تھے۔ آسمان پر سے عجب عجب طرح کے باجوں کی آوازیں آرہی تھیں یہ تماشا دیکھ کر میں ساری مصیبت بھول گئی۔ میں حیران تھی کہ یہ کس بادشاہ کا محل ہے۔ یہ گہما گہمی تو ہمارے بادشاہ کے ہاں بھی نہیں ہوتی۔ قصّے کہانیوں میں جیسی پریوں کا ذکر سُنا ہے ایسی ایک پری شانوں پر بال بکھرے ہوئے، بازوؤں پر پر، میرے پاس آئی اور مہین آواز سے بولی "سیدانی بی۔ بڑی راہ دکھائی۔ ہمارے بادشاہ اور بادشاہ بیگم کب سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں آؤ چلو میں تم کو محل کے اندر لے چلوں" میں پالکی سے اتری اور چادر کو اچھی طرح اوڑھ اس پری کے ساتھ ساتھ چلی۔ کیا کہوں اندر کیا بہار تھی۔ ہزاروں پریاں۔ گورے گورے رنگ، بوٹا سا قد، زرق برق کپڑے۔ ہنستی چہلیں کرتی اہلی گہلی پھر رہی تھیں۔ چمن ایسا کہ نہ دیکھا نہ سُنا۔ ہر درخت کا تنا چاندی کا سونے کی شاخیں،

زمرد کے پتے۔ پھلوں کی جگہ کہیں لال لٹک رہے تھے کہیں نیلم پُکھراج۔ پھولوں پر یہ عالم تھا جیسے ہیرے چمک رہے ہوں۔ کلیاں تھیں کہ صراحی دار موتی۔ خوشبو سے دماغ مہکا جاتا تھا حوضوں کا پانی اللہ اللہ، چاندی کے ورق بکھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے، فواروں میں سے موتیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔

چلتے چلتے ایک بارہ دری میں پہنچے۔ بارہ دری کی سجاوٹ کیا بیان کروں۔ قلعے کے دربار بھی دیکھے ہیں مگر اس جیسا سماں آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ سیکڑوں سُرخ، سبز، نیلی، زرد، اودی، سفید کرسیاں بچھی تھیں۔ رنگ برنگ کے بلّور کی تھیں یا کس چیز کی، ایسی شفاف کہ آر پار نگاہ گزر جاتی تھی۔ اور ان پر حسین حسین پری زاد جگمگاتے لباس پہنے بڑے ٹھسّے سے بیٹھے تھے۔ بیچ میں ایک کٹہرے کے نیچے ایک بڑے یاقوت کے تخت پر جس میں ہیرے اور پتّے کی پچّی کاری کا کام تھا بادشاہ اور بادشاہ بیگم عجیب شان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ بادشاہ بیگم کے پہلو میں ایک لڑکی کوئی چودہ پندرہ برس کی۔ چہرہ جیسے چودھویں رات کا چاند۔ زلفیں کھلی ہوئی۔ کئی رنگ کے پر۔ اور ایسے چمک دار کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔ سر پر نیم تاج رکھے بیٹھی تھی۔ ان تینوں کی پوشاکیں ایک رنگ کی ہوں تو بتاؤں، گھڑی میں چار چار رنگ بدلتی تھیں۔

میں آگے بڑھ تو رہی تھی مگر ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ڈر سے نہیں حیرانی سے کہ یا اللہ یہ کون لوگ ہیں۔ میں جاگ رہی ہوں یا خواب میں یہ پرستان کی سیر ہے۔ اور اگر جاگتے میں کوئی پری یا دیو مجھے یہاں اڑا لایا ہے تو دیکھیے گھر اُلٹا جانا بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اسی سوچ میں تخت کے پاس پہنچ گئی۔ بادشاہ میری گھبراہٹ دیکھ کر مسکرائے اور بادشاہ بیگم نے مجھ سے کہا "آؤ سیدانی بی آؤ۔ مزاج تو اچھا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ رستے میں تم بہت ڈریں۔"

سیدانی: حضور کو دعا دیتی ہوں۔ اور حضور ڈرنا کیسا۔ وہ تو مولا علی مشکل کشا نے مدد کی۔ نہیں تو جان نکلنے میں کسر ہی کیا رہی تھی۔" صدقے مولا کے، نام آتے ہی بادشاہ اور سارے درباری سرو قد کھڑے ہو گئے اور بادشاہ فرمانے لگے۔ "سیدانی بی تم جانتی ہو ہمارے ہاں اس نام کی کتنی عزت

ہے ۔ سیکڑوں برس ہوئے ان ہی حضرت کے ہاتھ پر ہمارے بزرگ اسلام لائے تھے ۔" میں نے دل میں خدا کا شکر کیا کہ جو کچھ بھی ہوا یہ لوگ ہیں مسلمان اور اب کسی بات کا ڈر نہیں ۔

بادشاہ بیگم : ہم کو گنہگار نہ کرو (ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے بولیں) بیٹھ جاؤ ۔ ہاں تم ڈری کیوں تھیں ؟

میں نے کہا " سرکار ڈرنے کی بات کیوں نہ تھی ۔ ایک اکیلی دوسرے سنسان جنگل ۔ پھر جو میرے ساتھ تھا اس کی صورت ایسی ڈراونی تھی کہ میرے اوسان جاتے رہے ۔" یہ سن کر شہزادی خوب ہنسی اور بولی " اماں بیگم ۔ بکر گدھا موا بڑا شریر ہے اس نے کہیں اپنی شکل دکھا دی ہوگی ۔" اب میرے پیٹ میں پھر ہول اٹھنے لگے کہ کہیں یہ ساری صورتیں بھی نقلی نہ ہوں اور بولا بولا کر چاروں طرف دیکھنے لگی ۔ بادشاہ بیگم سمجھ گئیں کہ شہزادی کی باتوں سے سیدانی کے دل میں ہماری صورتوں کی طرف سے کچھ شبہ ہو گیا ہے ۔ وہ مسکرا کر بولیں ۔ سیدانی بی ۔ ڈرو نہیں ہماری سب کی شکلیں اصلی ہیں بلکہ پری زادوں کی ساری ایسی ہی خوبصورت شکلیں ہیں جیسی تم دیکھ رہی ہو ۔ میری لڑکی سہیل پری نے جن کا ذکر کیا وہ جن ہے اور جن البتہ وضع وضع کی شکلوں کے ہوتے ہیں ۔ خاطر جمع رکھو تمہارے سامنے کوئی جن یا دیو بری صورت بنا کر نہیں آئے گا ۔"

اتنے میں کھانوں کے خوان اترنے لگے ۔ خاصا چنا گیا ۔ کھانا کیا تھا ، اللہ کی قدرت کا کرشمہ ۔ ایک ایک بالشت کے پودے پھلوں پھولوں سے لدے ہوئے سامنے تھے ۔ خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں مگر میں کھاتی کیا ، نہ کسی قسم کی روٹی تھی نہ سالن نہ پلاؤ تھا نہ زردہ ۔ ہکا بکا ایک ایک کا منہ دیکھ رہی تھی کہ بادشاہ بیگم مسکرا کر بولیں ۔ " سیدانی بی دیکھتی کیا ہو ، کھاتی کیوں نہیں ۔ یہ پرستان کا کھانا ہے تم مہمان ہو ہاتھ بڑھاؤ تو اور بھی کھائیں ۔" میں نے کہا " سرکار کوئی کھانے کی چیز ہو تو کھاؤں یہ تو نگوڑے درخت ہیں ۔ اور ان میں جو پھل پھول لگے ہیں وہ بھی اللہ مارے سچ مچ کے نہیں دکھائی دیتے ۔" شہزادی اتّرہ اس نے میرے اس کہنے پر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور کہنے لگی ۔" سیدانی بی جیسا سنا تھا کہ آدم زاد بڑا بھولا ہوتا ہے تمھیں ویسا ہی پایا ۔ تم بسم اللہ کرکے کوئی پھل توڑو اور کھاؤ تو ۔ جس کھانے کا دل میں

خیال کروگی وہی مزہ آئے گا۔"
بیگم یقین مانو ایک زرد زرد جو پھل توڑ کر میں نے مُنہ میں رکھا کیا کہوں۔ دِلّی میں تو کسی نے ایسے ذائقے کا بونٹ پلاو کھایا نہ ہوگا۔
میر صاحب کی بیوی: بونٹ پُلاو جو گھر میں چھوڑ کر گئی تھیں، وہی پہلے یاد آیا۔
بڑی لڑکی: قلعے میں تو آپ بہت جایا کرتی ہیں، کیا وہاں بھی کبھی ایسے مزے کا نہیں کھایا۔
سیدانی: حسینی بادشاہ کے خاص رکاب دار کے ہاتھ کے بڑے بڑے تعریفی کھانے بیسیوں مرتبہ بھی نہ کھائے ہوں گے، مگر بیوی وہ بُو باس وہ آب و نمک ہی کچھ اور تھا۔ ہاں تو بہن بس پھر کیا تھا۔ جو جو کھانے کھائے تھے بلکہ جن کا نام ہی سُنا تھا ان کا خیال کرتی گئی اور اے تیری شان، وہی مزہ آتا گیا، اچنبے کی بات تھی کہ جب ایک پھل توڑتی دوسرا اس کی جگہ فوراً نکل آتا۔ پھولوں کلیوں کو چکھا مٹھائیاں تھیں۔ ایسی ایسی نفیس، ہلکی خوش ذائقہ کہ ہر نوالے میں روح تازہ ہوتی چلی جاتی تھی۔ پیاس معلوم ہوئی تو پانی کا خیال آتے ہی یاقوت کا گلاس خود بخود آکر مُنہ سے لگ گیا۔ یاقوت کا گلاس اور ایسا حباب کا کہ باہر سے پانی جھم جھم کرتا دکھائی دیتا تھا۔ ڈر کے مارے میں نے زور سے ہونٹ بھی نہیں بھینچے کہ کہیں کنارہ ٹوٹ کر مُنہ میں نہ چُبھ جائے۔ اللہ اللہ۔ پانی کو نہ پوچھو۔ ایسا میٹھا، ایسا معطر، ایسا سفید پانی تو نہیں ہوتا۔ نہ جانے کیا چیز تھی۔ سب کے بعد میں نے سوچا کہ پتّوں کو بھی دیکھنا چاہیے۔ ساتھ ہی پان کا بھی خیال آیا۔ میں پان آج بھی بہت کم کھاتی ہوں لیکن کھانا کھا کر دو وقت تو ضرور کھانے کی عادت ہے۔ اب جو پتّہ توڑتی ہوں تو پان کی خوشبو۔ مُنہ میں جو رکھا تو یہ معلوم ہوا کہ عطردان میں رکھی ہوئی گلوری کلّے میں آگئی۔ کہتے ہیں کہ محمد شاہ رنگیلے کی کوکلا بائی جیسا پان کھاتی تھی، لال قلعے میں تو اس سے پہلے نہ اس کے بعد کسی کو نصیب ہوا نہیں، مگر میں کہتی ہوں کہ اگر وہ پرستان کے اس پتّے کو ایک دفعہ صرف سونگھ لیتی تو ساری عمر سر دُھنتی رہتی۔ مشک و عنبر پڑے ہوئے کتھے اور پسے موتیوں کے چونے کا پان بھی اس کے آگے بے حقیقت ہے۔

جب سانس لیتی تھی نئی سے نئی خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں۔

اب بہن بادشاہ بیگم نے جن کا نام زمرّد پری تھا، توشہ خانے والیوں کو حکم دیا کہ شہزادی کے کپڑے لاؤ۔ کشتیوں پہ کشتیاں، تھان پہ تھان آنے لگے۔ کپڑوں اور گوٹا کناری کو دیکھ کر میری تو عقل جاتی رہی۔ بڑی بڑی رانیوں، شہزادیوں کے جوڑے دیکھے ہیں۔ نور بائی کی پشواز بھی دیکھی ہے جس میں سیروں جواہرات ٹکے ہوئے تھے لیکن ان کپڑوں سے کیا نسبت۔ کجا دنیا کے کپڑے کجا پرستان کے۔ آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ریشم اور سونے کے تاروں سے بنی ہوئی آبِ رواں۔ موتیوں سے بسی ہوئی گلشن۔ ایسا ہی کم خواب اور زربفت کہ دیدہ نہ شنید۔ گوٹا وہ کہ دنیا دیکھے اور اش اش کرے۔ رنگ رنگ کے جواہرات کی لڑیاں تھیں۔ جب سامان آگیا تو بادشاہ بیگم بولیں، "لو بی سیدانی اب تم اپنا ہنر دکھاؤ۔ بہت تمھاری تعریف سُنی ہے۔ ہم تو جب جانیں کہ پرستان میں بھی تمھارا نام ہو جائے۔" میں دل میں تو بہت پریشان ہوئی کہ یا اللہ میں یہاں کیا کاری گری دکھاؤں گی۔ کون سی وضع ٹانکوں کہ ان کے لیے نئی ہو۔ مگر زبان سے کہا حضور اللہ مالک ہے۔ وہی آبرو رکھنے والا ہے۔ صبح ہونے دیجیے جو کچھ مجھے آتا ہے حاضر ہوں۔" وہ ہنس کر بولیں۔ "سیدانی بی۔ پرستان میں نہ دن ہوتا ہے نہ رات۔ ایک ہی موسم اور ایک ہی وقت رہتا ہے۔ خیر تم جب چاہو کام شروع کر دو۔" میں نے تعجب سے عرض کیا۔ "تو کیا یہاں لوگ سوتے نہیں؟" کہنے لگیں۔ "یہاں سونے کا کیا کام۔ نیند پرستان میں نہیں آتی۔ ہمارا مشغلہ تو آٹھوں پہر بسر تماشے ہیں۔ پرستان سے جی اُکتایا تو دنیا والوں کے خوابوں میں چلے گئے۔"

بہن میں نے دیکھا کہ واقعی نیند کا نام بھی آنکھوں میں نہیں۔ نہ پیٹ میں گرانی نہ سر بھاری۔ نہ انگڑائیاں نہ جماہیاں۔ سوچا کہ دیر کیوں لگاؤں کتر بیونت کا سامان تو موجود ہی تھا۔ اللہ کا نام لے جوڑے کترنے لگی۔ اور اسی وقت سے سینے اور ٹانکنے کا لگا لگا دیا۔ ادھر میں ایک طرف بیٹھی ہوئی اپنے کام میں مصروف تھی اور ادھر ناچنے گانے والی پریوں کے تخت اُتر رہے تھے۔ ایک سے ایک طرح دار۔ ایک سے ایک شوخ اپنے فن میں اُستاد۔ نہ کانوں نے کبھی ایسا گانا سُنا تھا نہ آنکھوں نے ایسے ناچ دیکھے تھے۔ آوازیں تھیں کہ جیسے کوئلیں مل کر کوکیں۔ ناچ تھا کہ ہوا میں جیسے تیتریاں اُڑ رہی ہیں۔

کیا پوچھتی ہو۔ بیگم خُدا کی قدرت کا تماشا تھا۔ لیکن مجھے تو اپنی فکر تھی کہ کہیں جلدی کام نمٹے اور چھٹکارا پاکر اپنے گھر جاؤں۔ ذرا کے ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتی اور پھر اپنی سوئی چلانے لگتی۔

اس کی کارسازی کے قربان۔ صدقے مشکل کُشا کے عقل نے ایسا کام دیا اور پہلے ہی جوڑے میں واہ واہ ہوگئی۔ شہزادی کا چہرہ بھی خوشی کے مارے پھول کی طرح کھل گیا۔ اب کیا تھا میرے ہاتھ پاؤں میں گھوڑے لگ گئے۔ دنوں کا کام گھڑیوں میں ہونے لگا۔ کہانی تو بہت لمبی ہے کہاں تک کہوں۔ جس کام کی آدمی دُھن باندھ لے وہ ہو ہی جاتا ہے۔ آخر سارے جوڑے سل بھی گئے اور ٹک بھی گئے۔ کتنے دن لگے یہ کون کہہ سکتا ہے۔ وہاں دنوں کا حساب ہی نہ تھا۔ ہاں اگر یہاں اتنا کام کرتی تو خُدا جھوٹ نہ بلوائے۔ میرے اکیلے ہاتھ پر ایک سال سے کم نہ لگتا۔ اس عرصے میں ساری پریاں خاص کر شہزادی مجھ سے بہت محبت کرنے لگی تھی۔ خالہ سیدانی کہتے کہتے اس کا مُنہ سوکھتا تھا۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھی رہتی اور مجھ کو سوئی چلاتے دیکھا کرتی۔ تم جانو پاس رہنے کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ مجھے بھی اس کی بھولی بھالی شکل پر پیار آتا تھا۔ مگر دل کو کیا کرتی یہ نگوڑا تو یہاں پڑا ہوا تھا۔ گھر کی یاد چین نہیں لینے دیتی تھی۔ ہائے اپنا کھنڈلا پرستان میں بھی نہیں بھولا۔

آخر جب سارا کام اُن کی مرضی کے موافق ہوگیا تو میں نے کہا "حضور خدا نے مجھے سُرخرو کیا۔ مولا نے میری آبرو رکھ لی۔ سرکار کو شہزادی کی شادی اور شہزادی کو یہ جوڑے پہننے مبارک ہوں۔ اب لونڈی کو رخصت کیجیے۔" بادشاہ بیگم بولیں۔ سیدانی بی۔ "ہمارا جی چاہتا ہے کہ شہزادی کی شادی دیکھ کر جاؤ۔" سچ کہوں میرا بھی دل بھر بھرا یا مگر سوچا کہ سیدانی دیوانی ہوئی ہے۔ نوج خاکی یہ آتشی۔ زیادہ میل جول اچھا نہیں۔ ذرا سی دیر میں بگڑ بیٹھیں تو جلا کر خاک کر دیں۔ بھاڑ میں جائے پرستان اور پرستان کی شادی۔ چل اپنے گھر چل۔ اور ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "شہزادی کی شادی آپ کو جم جم نصیب ہو۔ مجھے تو جانے دیجیے۔" یہ سُن کر شہزادی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولی۔ "سیدانی بی تم کیوں جاتی ہو؟ ہمارا دل کڑھتا ہے۔ نہ جاؤ۔ یہیں رہو۔ میرے کلیجے پر چوٹ سی لگی۔ بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھال کر بولی، سیدانی تم پر واری۔ بیوی تم اپنا جی بھاری نہ کرو۔ تم بلاؤ گی تو سو دفعہ آؤں گی۔ ایکا ایکی دُنیا نہیں

چھوٹ سکتی۔ مٹی مٹی میں خوش رہتی ہے! شہزادی تو کچھ خفا اور کچھ روٹھی سی ہو کر اُٹھ گئی۔ بادشاہ بیگم بولیں "اچھا بی سیدانی تمھاری مرضی۔ جاؤ خدا حافظ اور اسی کلموہے بکر گدھے کو حکم دیا کہ سیدانی بی کو ان کے گھر پہنچا دے۔ خبردار جو رستے میں کسی طرح شرارت کی ہو۔ اور دیکھو جو انعام و اکرام سیدانی بی کو بادشاہ نے دیا ہے، وہ سب پالکی میں رکھ لینا۔

دل میں خوش اور ظاہر میں بسورتی ہوئی سب سے رخصت ہوئی۔ وُہی پری زاد جو مجھے پالکی سے اتار کر لائی تھی ساتھ لے کر چلی۔ پھاٹک کے باہر پالکی موجود تھی اور ہر دھول کی سی وضع کا آدمی پاس کھڑا تھا۔ میں پالکی میں بیٹھی اور دم کے دم میں پالکی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ پالکی میں بیٹھ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کر وہ جو پرستان کے بادشاہ نے انعام و اکرام دیا ہے، کہاں ہے۔ اندھیرے میں کیا نظر آتا۔ ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا۔ ایک کونے میں بہت سے کنکر پتھر معلوم ہوئے۔ جل گئی کہ موئے جنات تھے نا۔ یہاں بھی دغا کی۔ یہ ان کے گھر کا انعام و اکرام ہے۔ خیر جان بچی لاکھوں پائے خیرت سے گھر پہنچ جاؤں تو جانوں بڑا انعام پایا۔ اور میں نے چپکے چپکے ایک ایک کر کے وہ کنکر پتھر پردے کی جھری میں سے پھینکنے شروع کر دیے۔ قاعدہ ہے کہ خوشی میں رستہ جلدی کٹ جاتا ہے۔ آنکھ بند کرتے میں گھر آ گیا۔ ڈیوڑھی میں پالکی رکھی گئی۔ چراغ جل رہا تھا۔ پردہ جو اُلٹا اور چراغ کی جوت جو پڑی تو کیا دیکھتی ہوں کہ جنھیں میں کنکر پتھر سمجھ رہی تھی، جواہرات ہیں۔ بڑے بڑے تو میں نے سب پھینک دیے تھے، دو چار ننھے ننھے سے باقی تھے۔ سر پیٹ لیا کہ اتنی دولت کھوئی۔ نگوڑی پھینکنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسا ہی تھا تو گھر آ کر پھینک دیتی۔ لیکن بہن تقدیر کی کھوٹ کہاں جاتی ہے۔ نصیب میں تو پتھر بھی نہ تھے۔ ہیرے لال زمرد کیوں ملتے۔ ایک ایک بیر من من بھر کا ہو گیا۔ صرف چار نگینے رہ گئے تھے وُہی لے کر بڑی مشکل سے اُتری گھر میں جو پہنچی تو بونٹ پلاؤ جیسا چھوڑ گئی تھی ویسا ہی دم پر لگا ہوا تھا۔ بڑی بی پکانے والی مغرب کی نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی۔ دعا مانگ چکیں تو انھوں نے پوچھا۔ بیگم کیا رستے میں سے اُلٹی آ گئیں، خیر تو ہے؟" میں نے دل میں کہا

یہ لیجیے یک نہ شد دو شد۔ پرستان میں خدا معلوم کتنے مہینے لگ گئے، اور یہاں ابھی چالونوں کو دم بھی نہیں آیا۔ اور بڑی بی سے بولی "ہاں بی بھوک لگی ہوئی تھی اور کچھ جی بھی ٹھیک نہ تھا، رستے میں ہی سے آ گئی۔ اب انشاءاللہ کل جاؤں گی۔"

نیازی خانم

اللہ بخشے نیازی خانم کو عجیب چہچہاتی طبیعت پائی تھی۔ بچپن سے جوانی آئی، جوانی سے ادھیڑ ہوئیں۔ مجال ہے جو مزاج بدلا ہو۔ جب تک کنواری رہیں، گھر والوں میں ہنستی کلی تھیں۔ بیاہی گئیں تو کھلا ہوا پھول بن کر میاں کے ساتھ وہ چہلیں کیں کہ جو سنتا پھڑک اٹھتا۔ کیا مقدور اُن کے ہوتے کوئی مُنہ تو بسورے۔ پھر خالی ہنسوڑ ہی نہیں۔ اللہ نے عقل کا جوہر بھی دیا تھا۔ ذہن اتنا برّاق کہ جہاں بیٹھیں ہنسی ہنسی میں سگھڑاپے سکھا دیں۔ گدگداتے گدگداتے بیسیوں ٹیڑھے مزاجوں کو سیدھا کر دیا۔ غرض کہ جب تک جییں جینے کی طرح جییں۔ کسی کو اپنے برتاؤ سے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ قاعدہ ہے کہ جہاں دو برتن ہوتے ہیں ضرور کھڑکا کرتے ہیں۔ لیکن قہقہوں کے سوا ان کے اندر کبھی کوئی دوسری آواز نہیں سنی۔ مرتے مرگئیں نہ یہ کسی سے بھڑیں، نہ ان سے کسی نے دو بدو کی۔ جیسی بچپن میں تھیں، ویسی ہی آخری دم تک رہیں۔

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ پوت کے پالنے پالنے میں نظر آجاتے ہیں، نیازی خانم ماں کی گود سے اُتر کر گھٹنیوں چلنے میں ایسی شوخیاں اور ایسے تماشے کرتیں کہ دیکھنے والے حیران ہوتے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد تو کہنا ہی کیا تھا۔ پوری پکی پیسی تھیں۔ جو اُن کی باتیں سنتا دنگ رہ جاتا۔ تقدیر کی بات، جنم ایسے زمانے میں لیا تھا کہ جتنی گیگلی ہوتیں، اچھی سمجھی جاتیں۔ لکھنا پڑھنا کیسا، لکھے پڑھوں کی سی باتیں

بھی کوئی کرتی تو، حرّافہ، اور شتابہ کا خطاب پاتی۔ بڑا تیر مارا تو قرآن شریف ختم کر کے راہِ نجات، کریما یا خالق باری پڑھ لی،وہ بھی چپکے چپکے ابا، بھائی یا امیر گھرانا ہے تو کسی اُستانی سے۔سب ہی لڑکیاں آٹے کی آپا، مٹی کی تھوئی، گدّی کے پیچھے عقل رکھنے والی نہیں ہوتیں۔ آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ ان ہی گدڑیوں میں بہت سے لعل بھی ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی ذہین، فطری قابلیتوں سے آراستہ عورت دیکھنے میں آتی ہے۔ قدامت پسندیوں نے گھوٹ گھوٹ کر ان کی طبیعتوں کو بجھا دیا، ورنہ مردوں میں کیا سرخاب کے پر لگے ہوتے ہیں۔ کون سا کمال ہے جو یہ حاصل نہیں کر سکتیں۔یورپ میں جا کر دیکھ لو، مردوں سے آگے ہی پاؤ گے۔ اتنی دور کیوں جاؤ۔ اپنے ملک ہی میں نئی تعلیم یافتہ خواتین کا کیا کال ہے۔جہاں وہ دیکھی جا سکتی ہیں جاؤ دیکھو، کیسے جوہر دکھا رہی ہیں۔

کاش ہماری نیازی خانم آج اس جدید دور کی پیدائش ہوتیں۔ اگر انھوں نے یہ زمانہ پایا ہوتا تو نہ جانے شہرت کے کون سے آسمان پر اپنا جلوہ دکھاتیں۔ اپنی طبّاعی کی کتنی داستانیں، قہقہوں کے کتنے زعفران زار اور اپنی مزاحی شاعری کی کیسی کیسی یادگاریں چھوڑ جاتیں۔ اب تو ان کی باتیں نری کہانیاں ہیں۔ وہ بھی اندھیری راتوں میں سنی ہوئی، جن میں فطری ذہانت کے سوا کوئی علم کی روشنی نہیں۔

اگلے وقت تو نہ تھے لیکن اگلے وقتوں کے لگ بھگ مغلیہ خاندان کا آخری چراغ ٹمٹما رہا تھا کہ دلّی کے ایک شریف پڑھے لکھے، قال اللہ قال رسول کرتے والے خاندان میں نیازی خانم پیدا ہوئیں۔ان کے والد کچھ دن سے مکتب پڑھانے لگے تھے۔ خدا کی شان ہے یا تو ان کے ہاں فضیلت کی پگڑیاں بندھتی تھیں یا کریما بہ بخشائے بر حالِ ما، خالق باری سرجن ہار، ما مقیمانِ کوے دل داریم، سے آگے کوئی پڑھنے والا ہی نہ تھا۔ تاہم یہ بچّوں ہی کو مخاطب کر کے اپنی علمی بھڑاس نکالتے رہتے۔مکتب کے علاوہ بعض کھلنڈرے بچّوں کے ماں باپ اپنے لڑکوں کو گھر پر بھی بھیج دیتے اور یہ بڑے شوق سے گھنٹوں مغز زنی کرتے۔ گھر اندر سے تو خاصا بڑا تھا مگر باہر کوئی بیٹھک نہ تھی۔ ڈیوڑھی ہی میں ایک تخت بچھا رہتا۔ اسی پر مکتب جم جاتا۔

نیازی خانم کی دو بہنیں اور تھیں. کوئی دو دو سال کے فرق سے بڑی، اور ایک چھوٹا بھائی۔ اگرچہ یہ تینوں بہن بھائی، اللہ کے جی تھے۔ ذہن کے غبی. طبیعت کے ٹھس. لڑکیوں کا تو خیر کچھ نہیں، پر ایا دھن تھا۔ سگھڑ اٹھیں یا پھوہڑ۔ جس کے پلے بندھیں گی وہ سمجھ لے گا۔ لیکن لڑکا باپ کی اُمیدوں کا سہارا ہوتا ہے اس لیے اس پر مولانا اپنی میاںجی گری کا پورا زور صرف کرتے۔ ہر وقت ساتھ رکھتے۔ مکتب جاتے تو ساتھ لے جاتے۔ گھر پر پڑھاتے تو بیٹے کا پڑھانا مقدم تھا۔ رات کو دن بھر کے دھندوں سے فرصت پاکر پلنگ پر لیٹتے تو سوتے سوتے کہانیوں، قصّوں کی طرح قسم قسم کے مسائل حل کرتے رہتے۔ بس نہیں چلتا تھا کہ اپنی ساری علمی پونجی گھول کر پلا دیں۔

برخوردار تو ٹھوٹ کے ٹھوٹ رہے۔ لاکھ توتے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا۔ مولانا کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ بچارے کا شہر میں مکتب بھی نہ چلا۔ ہاں نیازی خانم کی شوخ فطرت کو چار چاند لگ گئے۔ باپ، بیٹے کو جو باتیں بتاتے بیٹی لے اُڑتی۔ تھوڑے دن میں یہ البتہ سچ مچ کی علامہ ہوگئیں۔ ایسے ایسے لطیفے دماغ سے اُتارنے لگیں کہ گھر والے، کیا چھوٹے کیا بڑے، مُنہ تکتے رہ جاتے۔ کتابی تعلیم تو انھیں کون دیتا۔ وہی دو چار مذہبی رسالے وغیرہ پڑھے تھے۔ رہا لکھنا، قلم کسی لڑکی نے چھوا اور سانپ نے سونگھا۔ پرانے لوگ تھوڑا بہت پڑھا تو خیر دیتے تھے مگر لکھنے کے پکّے دشمن تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لکھنا آیا اور لڑکی ہاتھ سے گئی۔ زبان جتنی چاہے چلے، ہاتھ نہ چلے۔ جھوٹ موٹ بھی اگر کبھی نیازی خانم نے تختی سنبھالی، اِدھر باپ نے ڈانٹ بتائی اُدھر ماں نے دو ہتّڑ رسید کیا کہ "کس کو خط لکھنا ہے۔ ہماری آبرو پر حرف لائے گی۔ نگوڑی یہ شریفوں میں نہیں ہوتا۔"

کچھ تو اس دور کی کہا مان اولاد اور کچھ ماں باپ کی تنبیہ، شوق کے باوجود نیازی خانم نے شرارت سے بھی قلم کو نہ چھُوا۔ چھوتیں تو جب کہ کوئی انھیں چھونے دیتا۔ تاہم طبیعت کی شوخی کہاں جاتی تھی، ہزاروں چٹکلے دوسروں سے لکھوا کر چھوڑ گئیں۔ گھر میں سگا بھائی تھا اور کُنبے رشتے کے لڑکے تھے، اُن کے ہاتھوں اپنے دل کا ارمان نکال لیتیں۔ لڑکپن میں بڑے بوڑھوں کی سی تو باتیں ہوتی نہیں۔ دھما چوکڑی ہی

میں گزر تی ہے۔ ان دنوں ہر شریف گھرانے میں گڑیاں کھیلی جاتی تھیں کہنے کو تو یہ ایک کھیل تھا لیکن اس کو سگھڑاپا سکھانے کی تعلیم سمجھنا چاہیے۔

نیازی خانم کو گڑیوں کا بڑا شوق تھا۔ عجب عجب نام رکھے جاتے۔ ان کا بیاہ ہوتا تو مزے مزے کے رقعے لکھواتیں۔ مبارک بادی، سہرے اس کے بعد گڑیوں کے بچے ہوتے تو زچہ گیریاں بناتیں۔ خود گاتیں اور ڈومنیوں سے گواتیں اور ان میں ایسی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑتیں کہ گھر والے ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ جاتے۔ مولانا جیسے زاہد خشک بھی باہر بیٹھے ہوئے سنتے تو مسکرائے بغیر نہ رہتے۔

ہمیں مرحومہ کی پوری سوانح عمری تو لکھنی نہیں کہ مہد سے لحد تک کے حالات بیان کریں اور نہ ہمارے پاس ان کی زندگی کا روزنامچہ ہے۔ ہاں چند واقعات سُنے ہیں۔ آپ بھی سن لیں۔ زندہ دلی کے ایسے نمونے دنیا میں روز روز نظر نہیں آتے۔ ہونے کو ممکن ہے کہ نیازی خانم سے بڑھ چڑھ کر بھی عورتیں گزری ہوں گی، لیکن خدا جس کا نام نکال دے۔

بچے عموماً شریر ہوتے ہیں۔ کوئی تکلیف دہ اور کوئی ہنسانے والا بعض شریر ہونے کے ساتھ بڑے تیتر ے ہوتے ہیں گھر کے کونے کونے کا حال اُن سے پوچھ لو۔ ہر ڈھکی چھپی چیز کا حال انھیں معلوم۔ کیسی ہی مگھم میں بات کرو وہ تاڑ جائیں۔ وہ وہ مغزسے اُتار کر باتیں کریں کہ لوگوں کو غصہ بھی آئے اور ہنسی بھی۔ ایسے بچے دلّی والیوں کی اصطلاح میں 'غضبی' کہلاتے ہیں۔ نیازی خانم ان معاملات میں بہت تیز تھیں۔ سارے گھر والوں کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ بہت سی باتیں بچوں سے کہنے کی نہیں ہوتیں۔ بہت سے کام بچوں کے کرنے کے نہیں ہوتے۔ بہت سے موقعوں پر بچوں کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں ہوتا اور بچوں سے کہنے بھی اس لیے نہیں کہ ضد کریں گے، مگر نیازی خانم سے کیا مجال کوئی کام چھپا کر کر تو لے۔ ہونٹ ہلے اور انھوں نے مطلب سمجھا۔ لُتری نہیں تھیں کہ یہ عادت ضرر رساں ہوتی۔ اسے بھی شوخیوں کے ساتھ ایک قسم کی شوخی سمجھو۔ وقت گزرنے کے بعد ذرا دل لگی ہو جاتی تو دو چار دن کے ہنسنے ہنسانے کا سامان ہو جاتا۔

ایک دن کا ذکر ہے، موری دروازے چالیسویں میں جانا تھا۔ بچوں کو ایسی

تقریب میں یوں بھی کوئی نہیں لے جاتا، پھر یہ تو بلا کی شریر تھیں۔ اس کے علاوہ ان دنوں جانے آنے کی بھی آسانی نہ تھی۔ امیروں کے ہاں اپنی سواریاں ہوتیں، پالکیاں نالکیاں، بہلیاں، رتھیں، حسب مقدور غریب ملنگے تانگے سے کام چلاتے۔ ڈولیوں میں لدتے یا بھارکش کرایے پر کرتے۔ اِکے تھے مگر وہ اُجلی سواری سمجھی جاتی۔ بیل گاڑیوں میں دیر بہت لگتی۔ ڈولیوں میں اکٹھے باتیں کرتے ہوئے جاتے کا لطف کہاں؛ شہر میں دو چار سیج گاڑیاں آگئی تھیں، تو ان کا کرایہ زیادہ تھا۔ دلّی دروازے سے موری دروازے کا فاصلہ خاصا۔ صلاحیں ہوئیں کہ کیوں کر چلنا چاہیے۔ کسی نے کہا بھارکش کر لو، کوئی بولی شکرم میں کبھی نہیں بیٹھے۔ دس پانچ آتے زیادہ جائیں گے، ملا سے سیر تو ہو جائے گی۔ سُنا ہے دو گھوڑے جُتتے ہیں۔ گھر کا گھر ہوتی ہے۔ جھلمیوں میں سے راستے کا خوب تماشا دکھائی دیتا ہے۔ اندر بیٹھنے والے سب کو دیکھیں اور باہر کا کوئی نہ دیکھے۔

آخر شکرم ہی کی ٹھہری اور بھائی صاحب جاکر سائی بھی دے آئے۔ اب سوال نیازی خانم کے لے جانے کا تھا۔ یہ نہ بچّہ نہ بوڑھی اور ان کی بے چین فطرت سے سب واقف۔ ڈر تھا کہ ان کی بولیوں ٹھٹھولیوں کا کیا بندوبست۔ اگر یہ ساتھ چلیں تو روتوں کو ہنسائیں گی۔ اور کہیں بیچ بازار میں سیر کا شوق چرّایا۔ جھلمیاں اتار دیں تو کیا ہوگا۔ ان کی زبان میں تو بواسیر ہے۔ قہقہے لگانے شروع کر دیے، یا زور زور سے باتیں ہی کرنے لگیں تو کیسی بدنامی ہوگی۔ راہ گیر سمجھیں گے کہ نگوڑیاں کوئی بڑی اُچھال چھکّا ہیں۔ نیازی خانم نے جو گھر والوں کو کانا پھوسی کرتے دیکھا تو وہ اڑتی چڑیا کے پر گننے والی، فوراً سمجھ گئیں کہ ہو نہ ہو کوئی بات ضرور مجھ سے چھپانے کی ہے۔ ٹوہ لینے کے لیے اِدھر اُدھر ٹہلتے ٹہلاتے در سے لگ کر اس طرح کھڑی ہو گئیں، گویا کچھ خبر ہی نہیں۔

رات کا وقت تھا۔ ٹمٹماتے ہوئے کڑوے تیل کے چراغ کی روشنی پر چھائیں پڑتی ہوئی بڑی بہن کی بھی نظر پڑ گئی۔ ایک نے دوسری سے ٹھوک کر کہا "فتنی کو دیکھا کیسی چھپ کر ہماری باتیں سُن رہی ہے۔ آؤ زرگری میں باتیں کریں۔" زرگری فرفری اور اسی طرح کی کئی بولیاں قلعے والیوں کی ایجاد شہر کے اکثر گھرانوں

میں بھی آپہنچی تھیں۔ ان بیویوں کا شریفوں کی لڑکیوں میں بہت رواج تھا۔ انجانوں سے بات چھپانے کی خاصی ترکیب تھی۔ چنانچہ ایک بہن بولی "کزلوں ازا پڑا ازس سزرے لزرے چزل لزیں نیزا نزئیں" (کیوں آپا اسے لے چلیں یا نہیں؟) دوسری نے جواب دیا "ازب ازس کزو یہنز رزنے نزے دزو" (اب اس کو یہیں رہنے دو) اس کے بعد دیر تک ہنسی ہوتی رہی اور زرگری میں باتیں کرتیں، کبھی فرفری میں۔

نیازی خانم کو یہ بولیاں نہیں آتی تھیں۔ جو کچھ بہنوں نے کہا وہ تو سمجھ میں کیا آتا تاہم اُن کے مطلب کو پہنچ گئیں کہ یہ سارے منصوبے مجھے نہ لے جانے کے ہیں۔ اچھا کہاں جاتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں دھول ہی نہ ڈالی تو نام نیازی خانم نہیں۔ انھوں نے بھی ترکیب سوچ لی اور چپکے سے اپنے بچھونے پر آکر سو گئیں۔ صبح ہی ضروریات سے فارغ ہو کر سب نے کپڑے بدلنے شروع کیے۔ نیازی خانم غائب۔

والدہ : اے بھئی نیازی کہاں ہے۔ بی امتیازی تم بڑی کرّی ہو۔ وہ بھی چلی چلے گی تو کیا ہوگا؟

امتیازی: (بڑی بیٹی) امّاں بی وہ بڑی شریر ہے۔ رستے بھر اُدھم مچاتی چلے گی۔

والدہ : سچ گاڑی وہ بھی دیکھ لیتی بچّے اُدھم مچایا ہی کرتے ہیں۔

بنیادی : (دوسری بیٹی) لے چلیے آپ ہی کو شرمندہ ہونا پڑے گا۔

امتیازی : نواسی کو لے جاؤ چلو میں نہیں جاتی۔

والدہ : بوا بگڑتی کیوں ہو۔ جیسا تمھارا جی چاہے کرو۔ مگر وہ ہے کدھر؟

ماما : چھوٹی بیوی کو پوچھتی ہو؟ وہ تو سویرے اُٹھتے ہی بی ہمسائی کے ہاں چلی گئیں۔ کل شام کو کوئی کہہ رہا تھا کہ نوروزی کے ابا بمبئی سے ولایتی گڑیاں لائے ہیں۔

بنیادی : یہ بھی اچھا ہوا۔ کھیل میں لگی ہوئی ہے تو لگی رہنے دو۔ اتنے میں گاڑی آگئی تھی۔ گاڑی والا غل مچا رہا تھا کہ جلدی چلو۔

متیازی: اب دیر نہ کرو۔ گاڑی والے کی آواز اس کے کانوں میں پڑ گئی اور وہ آپہنچی تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔

سوار ہونے میں دیر کیا تھی۔ پردہ رکوا جھپاک جھپاک سب گاڑی میں جا بیٹھے۔ گاڑی بان دروازہ بند کر کے کوچ بکس پر چڑھ ہی رہا تھا کہ نیازی خانم ڈیوڑھی میں

سے نکل گاڑی کے پائے دان پر جھلملیاں اُٹھا اندر جھانکتے ہوئے بولی "چھوٹی آپا، تا!
بڑی آپا سلام۔ اب زرگری نہیں بولتیں۔ کہو لنے چڑل تزکی ہزویزا نزا ہتریں زلے چلتی
ہو یا نہیں۔!

والدہ : ہے تو بڑی فتنی۔

نیازی : نہیں اتاں بی میں تو چھوٹی ہوں۔

بڑی بہن : خدا ہی سمجھے۔

دوسری بہن: (ہنس کر) اور یہ تم چھپی ہوئی کہاں تھیں۔

بڑی بہن: کپڑے بھی بدل رکھے ہیں۔

نیازی : اور کیا۔ اے بھئی گاڑی بان دروازہ تو کھول۔

گاڑی بان : کیا بیوی تم رہ گئی تھیں؟

نیازی : دروازہ کھولتا ہے یا باتیں بناتا ہے۔

سب ہنسنے لگے، دروازہ کھلا۔ نیازی خانم بڑے ٹھسّے سے بیٹھیں اور سارے رستے بہنوں کو ستا مارا۔

ایک مرتبہ تو کمال کر دیا۔ گرمی کے دن تھے۔ چاندنی رات۔ ہمسائی کی لڑکیاں بھی آگئی تھیں۔ آنکھ مچولی کھیلی جارہی تھی۔ نیازی خانم ہوں گی کوئی چھٹے برس میں۔ چھپتیں اور پکڑی جاتیں۔ کہیں بڑی بہن کے مُنہ سے نکل گیا کہ بس پھسّش۔ پھر کیا تھا۔ آگیا طرارہ۔ اب کے جو جاکے چھپیں تو پتا نہیں۔ سب نے اندر کے دلان کی کوٹھری میں جاتے دیکھا تھا۔ چپہ چپہ ڈھونڈ ڈالا۔ کونا کونا چھان مارا۔ نیازی خانم کیا ملتیں۔ چھوٹے بڑے سب حیران۔ آخر ماں سے نہ رہا گیا۔ بڑی لڑکیوں پر جھنجلانے لگیں کہ اوئی بھئی ایسا بھی اندھیر نہیں چاہیے۔ ایک تو وہ خود ہی شریر۔ اُوپر سے تم نے اسے چڑا دیا۔ نہ جانے کس چوہے کے بل میں گھس کر بیٹھ گئی۔ یہ گرمی پڑ رہی ہے۔ کیڑے پتنگوں کے دن۔ میری بچّی کو مارو گی۔ (آواز سے) "نیازی بیٹی نکل آؤ۔ یہ سب ہاریں تم جیتیں۔ دَم گھٹ جائے گا۔ بس کھیل ہو چکا۔" دیکھتے کیا ہیں کہ کوٹھری کے آگے جو چھپرکھٹ بچھا تھا اس کے نیچے سے نکلی چلی آتی ہیں۔

والدہ : غضبی لڑکی تو یہاں تھی۔

بڑی بہن : اور اس کے نیچے تو کئی مرتبہ میں نے خود دیکھا ہے۔
منجھلی بہن : چھپکلی کو بھی مات کر دیا سچ مچ چھپر کھٹ کے نیچے تھیں۔
نیازی : (ہنس کر) اور کہاں سے نکلی۔ میں نے تمہاری آنکھوں پر بُر کی ماردی تھی۔

بڑی دیر کے بعد سب سے جیبں بُلوا لی تو بتایا کہ نواڑ کے نچلے پاکھوں میں گھس کر بیٹ گئی تھی۔ لاکھ بتلی دبلی، ہلکی پھُلکی سہی، بنائی کے خلا میں اس طرح لیٹنا اور پھر اتنی دیر تک دم سادھے پڑے رہنا جناتی کام ہے۔ نہ گرمی لگی نہ جی گھبرایا۔ خُدا کی پناہ۔

ایک کمال۔ نیازی خانم کی جو بات تھی۔ حیرت میں ڈالنے والی ہم تو کہتے ہیں کہ نظر کیوں نہیں لگی۔ اندھیرے میں سوئی ایسی پر ولیتیں کوٹھری کہ جیسے کوئی بڑا مشاق سورج کی روشنی میں پر و دے۔ اندھیری کوٹھری میں لحاف اُڑھا کر کیسے ہی ناکے کی سوئی دیتے ،منٹ دو منٹ میں اتنی سی بٹیا کو سوا گز کی چُٹیا دائی کر دیتیں شبہ ہوا کہ علامّہ تو ہے ہی، کہیں یہ چالاکی تو نہیں کرتی کہ تاگا پروئی ہوئی سوئیاں چھُپا رکھتی ہو۔ اس شک کو دور کرنے کے لیے کئی دفعہ ایسا کیا کہ خوب ٹٹول ٹٹول کر سارے کپڑوں کی تلاشی لی۔ چوٹی تک کھول ڈالی۔ پھر آنکھوں پر کس کر پٹّی باندھی۔ دو دو لحاف ڈالے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور ایک نے رنگ برنگ کے تاگے۔ الگ الگ، کسی کی چھوٹی کسی کی بڑی سوئیاں دیں کہ اب دیکھیں کیا کارستانی کرتی ہے۔ مگر اللہ ہی جانے نیازی خانم کے سر پر کوئی آتے تھے یا ان کی آنکھیں بلّی کی سی تھیں۔ باری باری سے سب کے تاگے پرو دیے۔

ایسے ہنسوڑ بچّے لڑکے ہوں یا لڑکیاں ایک نہ ایک دل لگی کا شگوفہ چھوڑتے رہتے ہیں۔ اتفاق سے ایک بلّی کا بچّہ میاؤں میاؤں کرتا گھر میں گھُس آیا۔ والدہ بولیں۔ "ارے یہ مردہ مال کہاں سے آگیا۔" بہن نے دیکھ کر کہا بوا جلدی باہر پھکوا دو۔ اُپلوں کی کوٹھڑی یا کباڑ خانے میں دبک گیا، تو مشکل ہو گی۔ کم بخت کیسا گھناونا ہے۔" نیازی خانم مسکرائیں۔ کہنے لگیں "اے ہے کیسا پیارا بچّہ ہے۔ بھئی کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ بچارے کو مارتے کیوں ہو۔"
بڑی بہن : (مسکراتے ہوئے) جیسی روح، ویسے فرشتے۔

منجھلی : تو گلے لگالو نا۔

والدہ : نوج۔ اب تم یہ لگا دو۔

نیازی : ولایتی بلّی کا بچّہ ہے" یہ کہتی اور مسکراتی دوڑیں۔ بچّے کو گود میں اٹھالیا۔ سب ہاں ہاں کرتے رہے۔ والدہ نے بُرا بھلا کہا، بہنوں نے کیڑے ڈالے، مگر یہ کب سننے والی تھیں، دل میں جو سماگئی سماگئی۔ چلیے ایک نیا مشغلہ ہاتھ لگا۔ بلی کے بچّے کی خاطریں ہونے لگیں۔ خوبصورت ریشمی پٹّا سی کر گلے میں ڈالا۔ چھوٹی سی رنگین پانو کی کھٹولی منگائی گئی۔ ہر وقت گود میں لیے لیے پھر رہی ہیں۔ دِلوں دودھ پلایا۔ پھر چھیچھڑوں کی جگہ قیمہ آتا۔ جہاں کھانے کو تر نوالے ملیں، آدمی کیا جانور کیا غبنجا بن جاتا ہے۔ وہ مرجھونا، زرغل بچّہ چند روز میں چکنا چکنا جگادری بلا ہو گیا۔ اچھا سماں ہو، فارغ البالیاں ہوں تو آدمی کو نئی نئی سوجھتی ہے۔ پیسا چاہیے اور بے فکری، ان ہونی باتیں کیے جائیے۔ بہت سی تقریبیں شادی کی ہوں یا غمی کی، بہت سے میلے ٹھیلے، کیا ہیں؟ خوش حالی کے وقتوں کی یادگاریں۔ مل کر بیٹھنے، رنگ رلیاں منانے اور خوش ہونے کی ترکیبیں۔ ہاں تو نیازی خانم کو بیٹھے بیٹھے بلبلا اٹھا کہ گڈّے گڑیا کے بیاہ تو بہت کیے، بلّے کی بھی شادی کرنی چاہیے۔ بڑا مزہ آئے گا۔ انوکھی بات ہو گی۔ اب سوچ ہوا کہ بلّی کہاں سے آئے۔ نظر دوڑائی تو یاد آیا کہ چھوٹی آپا کی سہیلی رمضانی خانم کے ہاں بلّی ہے۔ یاد آنے کی دیر تھی۔ گھر میں ذکر کیا۔ ماں بہنیں بھی آخر ان ہی کی ماں بہنیں تھیں۔ تھوڑی دیر ہنسی دل لگی کر کے سب راضی ہو گئے۔ رات کو یہ ذکر ہوا تھا۔ نیازی خانم چلبلی طبیعت والی۔ ہر چیز میں جدّت پلنگ پر لیٹے لیٹے رقعے کا مضمون گھڑا۔ وہ بھی نظم میں۔ صبح اُٹھتے ہی بھائی سے تقاضا کہ "بھیّا آج مکتب ذرا ٹھہر کر جانا۔ مجھے اپنے بیٹے کی منگنی کا رقعہ لکھوانا ہے۔ تم ہی بازار سے لال کاغذ لانا" چنانچہ سنہری روپہلی افشاں کیا ہوا لال کاغذ آیا۔ چھوٹے مولانا لکھنے بیٹھے "ہاں بوا کیا لکھوں؟ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔" "ٹھہرو۔ ذرا دم لو۔ بتاتی ہوں" نیازی خانم کا مٹکنا سا مُنہ، زبان فرّاٹے بھرتی ہوئی۔ شعر جو رات کو گھڑے گئے تھے لکھوانے شروع کیے۔ گھر والوں کے پیٹوں میں بل پڑے جاتے تھے۔ رقعہ تیار ہوا تو لال قند کے رومال میں لپیٹ کر بیٹی والوں کے ہاں بھیجا گیا۔ وہاں بھی بڑی ہنسی ہوئی۔ دلوں محلے

پر محلّے اس رقعے کی تک بندی کا چرچا رہا۔ جس نے سُنا پھڑک اُٹھا۔ اس زمانے کے لوگ ایسے معقول اور قدردان کہاں تھے جو ان چیزوں کو سینت کر رکھتے۔ نیازی خانم اپنے ساتھ ہی لے گئیں۔ دو تین شعر خُدا جانے کتنی زبانی یاد داشتوں کی ٹھوکریں کھاتے ہم تک پہنچے ہیں۔ آپ بھی سُن لیں۔ وھوا ہذا ؎

قیمہ پسند سے کھاتا ہوں زریفت کی ہے جھول — یہ التجا ہے کیجیے دامادی میں قبول
صورت ہے ساری شیر کی خصلت میں آدمی — آسودہ گھر کا بیٹا ہوں کس بات کی کمی
عیبی نہیں، ستاؤ نہیں، مُشٹنا نہیں — مُنہ سے کسی چوہے کا لہو تک لگا نہیں
بیٹا بلاؤ خاں کا ہوں فیروز نام ہے — پشتیں گزر گئی ہیں کہ دہلی مقام ہے

جیسا مزے دار رقعہ تھا، دیکھنے والوں کا سُننے والوں سے بیان ہے کہ شادی کی رسمیں بھی بڑے لطف کی تھیں۔ غرض کہ نیازی خانم بہو بیاہ لائیں۔ لوگوں کا خصوصاً جاہل عورتوں کا قاعدہ ہے کہ جہاں کسی سے لڑکی ہو یا لڑکا، عورت ہو یا مرد غیر معمولی حرکتیں ہوتی دیکھیں کہہ دیا کہ اس پر تو کوئی آتا ہے۔ اسی طرح جانوروں کے متعلق بھی عجیب عجیب باتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ بلاّ بلّی کے ہزاروں نہیں تو بیسیوں قصّے ہم نے سُنے ہیں۔ نیازی خانم کے بلّے پر بھی بعض کا گمان تھا کہ ضرور اس میں کوئی اسرار ہے اور لڑکی سے جو عقل میں نہ آنے والی باتیں سرزد ہوتی ہیں، وہ بلّے کی کرشمہ سازی ہے۔ ایک بڑی بی کہتی تھیں کہ میں نے اس بلّے کو دیکھا ہے۔ جنوں کا شہزادہ تھا۔ بھلا اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر کوئی دیکھ تو لے۔ دیدے تھے جیسے مشعلیں۔ غصّہ آتا تو پھول کر گدھے کا گدھا ہو جاتا۔ ایسی آوازیں نکالتا کہ ہیبت آتی۔ یہ بھی سُنا ہے کہ جب وہ مرا ہے تو بڑی آندھی آئی اور بڑے زور کا دھماکا ہوا۔

اور تو خیر۔ اتنی بات تو سچ ہے کہ بلّے کی موت کا نیازی خانم کو بہت رنج ہوا۔ کئی وقت روٹی نہیں کھائی۔ آدمیوں کا سا سوگ کیا۔ اس کی لاش کو یوں ہی نہیں پھکوایا بلکہ باقاعدہ کفن دیا، دفن کرایا۔ فاتحہ درود بھی کیا۔ ایک روایت یہ بھی سُنی گئی ہے۔ دروغ برگردنِ راوی کہ بلّے کے مرنے کے کچھ دن بعد نیازی خانم نے اپنی ایک رازدار سہیلی کو بتایا کہ ایک رات اپنے پیارے بلّے کو یاد کرتے کرتے میں نے کہا کہ "فیروز کیا سچ مُچ تجھ میں کوئی اثر تھا اور تو بلّے کے روپ میں

پرستان کا شہزادہ تھا؟ اگر واقعی تو بلا نہیں تھا تو خواب میں مجھے اپنی صورت دکھا جا۔ اسی رات آنکھ بند ہوتے ہی خواب میں دیکھا کہ ایک خوبصورت نوجوان زرق برق کپڑے پہنے میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے۔

ادھر ہیں لٹکتے ہوئے سفید پوش لوگوں کو جو نہ امیر ہوں نہ لنگوٹی بند، بیٹا بیٹی کے بنج میں ہمیشہ سے بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔ دولت مندوں کو کون بیٹی نہ دے اور ان کی بیٹی کون نہ لے۔ کار پیشاؤں کی اپنی برادری ہوتی ہے رشتے جڑنے میں کیا مشکل۔ درمیانی درجے والے پہلے بھی اس معاملے میں بدنصیب تھے اور آج بھی ایک ایک کا منہ تکتے ہیں۔ پیوند[1] نہیں ملتا۔ دو بیٹیاں تو جوان بیٹھی ہی تھیں، تیسری نیازی خانم بھی پہاڑ بنتی چلیں۔ ہر وقت نظر دوڑاتے تھے لیکن کوئی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ رات دن مولوی صاحب اور ان کی بیوی اسی فکر میں رہتے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ بیٹیوں کا نصیب پتّے کے تلے۔ جب کھلتا ہے تو بے سان گمان۔ جمعہ کا دن تھا، مکتب کی چھٹی، مولوی صاحب گھر ہی میں تھے کہ کسی نے دروازے کی کنڈی بجائی۔ نکل کر دیکھیں تو بڑے دس کے مرزا صاحب، علیک سلیک کے بعد ڈیوڑھی میں تخت پر دونوں بیٹھ گئے۔

مولانا: کہیے اس وقت کیسے تشریف لائے؟

مرزا : کچھ عرض کرنا ہے (مسکرا کر) آپ جانتے ہیں جس گھر میں بیری کا درخت ہوتا ہے پتھر آنے لازمی ہیں۔

مولانا: (مطلب سمجھ کر) جی ہاں مگر کیا کیجیے اللہ میاں کو بیری کے درخت ہی بونے تھے اور ایک چھوڑ تین تین۔

مرزا : (ذرا سے تامّل کے بعد) میرے ایک ملنے والے جو بلند شہر کے باشندے اور پورے مولوی ہیں ایک ہفتے سے غریب خانے پر تشریف فرما ہیں، کوئی چالیس برس کا سن ہے۔ نہایت مرد معقول قوم کے صدیقی شیخ۔ شجرہ نسب بے داغ۔ آمدنی بہت کافی۔

---

[1] جوڑ۔

مولانا : بہت خوب، اچھا پھر؟

مرزا : ان کی بیوی حال ہی میں شاید چھ مہینے ہوئے ہوں گے، دو چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر انتقال کر گئیں۔ بچارے پریشان ہیں۔ شادی کی فکر ہے۔

مولانا : اللہ رحم کرے۔ کسی بیوہ سے شادی کر لیں۔ ثواب بھی ہوگا۔

مرزا : بیوہ سے تو جب کریں کہ کنواری لڑکیاں نہ ملیں۔

مولانا : مولوی ہو کر سنّت سے انحراف! اپنا اپنا خیال ہے۔ تو پھر انھیں اپنے ہی وطن میں شادی کرنی چاہیے۔ جانے بوجھے لوگ ہوں گے۔

مرزا : دیہات قصبات کی بیوی انھیں پسند نہیں!

مولانا : یہ کیوں؟

مرزا : کہتے ہیں کہ شہر والیوں کی سی نستعلیق زبان گنواروں کو کہاں نصیب۔

مولانا : مجھے تو ان کے چال چلن میں شک ہو گیا۔ انھوں نے یہاں کی شریف زادیوں کو باتیں کرتے کہاں سُنا؟

مرزا : اُن کا بیان ہے کہ پچھلی مرتبہ جو میں دہلی آیا تو نا وقت پہنچا تھا۔ سرائے میں ٹھہر گیا۔ بھوک لگی ہوئی۔ بھٹیاری سے کھانے کے لیے کہا۔ وہ بولی "میاں اب تو بازار کی ساری دُکانیں خیر سے بند ہو گئیں، مونگ کی مقشر دال بھونی مسالے دار موجود ہے۔ اسے نوش فرما کر دیکھیے پسند آئے تو فبہا ورنہ ابھی چلا وتیار کیے دیتی ہوں"۔ دورانِ گفتگو میں اس نے مقشر، نوش، اور فبہا کے علاوہ اور بھی کئی لفظ اس بے تکلفی سے بولے کہ میں حیران رہ گیا۔

مولانا : بھٹیاری پر لٹو ہو گئے؟

مرزا : توبہ توبہ! بھٹیاری پر کیا لٹو ہوں گے۔ ہاں دِلّی کی بیٹی سے شادی کرنے کی قسم کھالی۔

مولانا : یہ گمان ہوگا کہ جہاں کی بھٹیاریاں باہر کے مولویوں کے کان کترتی ہیں، وہاں کی بیگمات کا طرزِ گفتگو کیا ہوگا۔

مرزا : جی ہاں۔ برسوں سے میں انھیں جانتا ہوں، انتہا درجے کے شریف خلیق ہیں۔ پہلی بیوی نے جب تک زندہ رہی، عیش کیا۔ روٹی کپڑے کی کمی نہیں۔

میرا اپنا خیال ہے کہ اگر آپ انھیں دامادی میں قبول فرمائیں تو انشا اللہ تعالیٰ آپ کو کسی طرح کی شکایت نہیں ہوگی۔

مولانا : آپ کو اُن کے حسب نسب کا یقین ہے۔

مرزا : بالکل۔ میں ذمّے دار ہوں۔

مولانا : (کچھ سوچ کر) پیوند تو نا مناسب نہیں ... عمر ذرا بڑی ہے!

مرزا : آپ کی چھوٹی لڑکی بھی تو غالبًا شادی کے قابل ہوگئی ہوگی۔

مولانا : اس کا ابھی کیا ذکر۔ پہلے دونوں بڑی بہنوں کا کرنا ہے۔

مرزا : (دبی زبان سے) مگر اُن کا خیال تو چھوٹی سے ہے۔

مولانا : اونٹ کے گلے میں گھنٹال! بھئی اوّل تو پندرہ برس کی لڑکی، چالیس سال کے مرد سے منسوب ہو دوسرے بڑی بیٹھی رہیں اور چھوٹی کے سہرا بندھے۔ آپ ہی سوچیے کہاں تک مناسب ہے؟

مرزا : اجی ان باتوں کو جانے دیجیے۔ جس کا نصیب کھلے۔ کسی طرح بند تو ٹوٹے۔ کیا خبر ہے اس کے بعد ہی دونوں بہنوں کا مقدر بھی جاگ اُٹھے۔

مولانا کا دل تو مرزا صاحب کو دعائیں دے رہا تھا کہ خوب بات لائے۔ کیسی چھوٹی اور کیسی بڑی۔ ایک پہاڑ تو چھاتی سے ٹلتا ہے۔ مگر بیٹی کے باپ تھے فورًا کس طرح ہاں کر لیتے۔ کہنے لگے۔ اب آپ فرماتے ہیں تو میں گھر میں ذکر کروں گا۔ بڑی رضامندی تو ماں کی ہے۔ ماموؤں کا مشورہ بھی ضروری ہے۔ اگلے جمعے تک ملیے گا۔"

بلند شہر والے مولوی صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ رسمی بات چیت کے بعد معاملہ طے ہوگیا۔ طے کیا ایک جمعہ بیچ میں چھوڑ دوسرے کو الٰہی! ست پوتا ہوا سازگاری رہے۔ ڈاڑھی کے ایک ایک بال پر نور برسے، آمین! کا غُل شہدوں نے مچا دیا۔[۱] "لڑکے کی بری بازار میں کھڑی" تو کہاوت ہی ہے۔ "مولوی کا بیاہ سرِ راہ" کی مثل بھی پوری ہوگئی اور پندرھویں دن بی نیازی خانم دونوں بڑی بہنوں کو مُنہ چڑا

---

[۱] دہلی میں نکاح کے بعد شُہدے یہ دعا دولھا کو دیا کرتے تھے۔

بلند شہر جا پہنچیں۔

تقدیر جب جاگتی ہے تو یوں جاگتی ہے۔ مولوی صاحب سچ پوچھو تو عمر کے لحاظ سے نیازی خانم کی جوڑ نہ تھے۔ لیکن گٹھا ہوا بدن تھا۔ بھونرا سی کالی ڈاڑھی، رنگ سُرخ و سفید۔ اچھے ٹانٹے۔ بے فکری کی ملے تو آدمی کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ آدمی کی جوانی کا گھُن تو پیسے کی نہوت ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مولوی صاحب کی طبیعت عام مولویوں کی طرح خشک نہ تھی۔ بلکہ غیر معمولی شگفتہ۔ دونوں ایک ڈالی کے پھول، رنگین اور خنداں۔ وہ بات کرتے تو کھلے جاتے۔ یہ بات کرتیں تو کلیاں چٹکنے لگتیں۔ دونوں کے نصیب ایسے لڑے کہ خُدا سارے جہان کی بیٹیوں اور بیٹوں کی ایسی ہی جوڑی ملائے۔

مولوی صاحب گھر میں اکیلے تھے۔ بچّے اپنی ننھیال میں رہتے۔ میاں بیوی کے موٹلے چھنتے اور بیوی میاں کی تفریح کا سامان کرتیں۔ کوئی مخل نہ تھا۔ دونوں مسخرے، دونوں کی جبلّت میں ظرافت مگر ایک تو عمر اور طرز زندگی کے لحاظ سے ذرا سہمے دبے ہوئے، پھر دیہاتی، ایک شہر کی چھٹی ہوئی شوخ لڑکی۔ باتوں باتوں میں ایسے ایسے لطائف و ظرائف کہہ جاتی، ایسی نئی نئی چُہلیں کرتی کہ میاں بغلیں جھانکتے رہ جاتے۔ مولانا کی عادت تھی کہ جب گھر میں ہوتے تو گاؤ تکیے سے لگ کر بڑے ٹھسّے سے بیٹھتے۔ گاؤ تکیہ معمول کے خلاف بہت بڑا تھا۔ ایک دن نیازی خانم کو شرارت سوجھی۔ اصلی گاؤ تکیہ اُٹھا دیا اور گاؤ تکیے کی صورت کھپچیاں جوڑ کر تکیہ بنایا۔ نیا غلاف چڑھایا۔ اور اُسے قالین پر سجا چپکی بیٹھ گئیں۔ مولوی صاحب تشریف لائے۔ اپنی عادت کے موافق آتے ہی گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھے ہی تھے کر چُرمُر کی آواز آئی۔ کھپچیوں کا جال ٹوٹا اور مولانا بہ ایں ریش دفش اس کے اندر۔ پہلوؤں میں بانس کی تیلیوں نے چبھنا شروع کیا۔ تڑپ کر کھڑے ہوئے بیوی دوڑتی ہوئی آئیں "ہائیں کیا گاؤ تکیے نے پکڑ لیا۔ ڈاڑھی کی تو خیر ہے۔ اوئی سنبھل کر نہیں بیٹھتے۔ اللہ کی امان" ہنسی کی بات تھی قہقہوں میں ختم ہو گئی۔

ﮯﻟ ناز اٹھاتے۔

کئی دن کا بھلاوا دے کر پھر خانم نے اپنے مذاق کا پٹارا کھولا۔ رات کو مولوی صاحب کی آمد سے پہلے ایک کھپچی موڑ کر پٹاری کے آگے کھڑی کی۔ سہارے کے لیے اِدھر اُدھر دو تکیے کھڑے لگا دیے۔ اور اپنی دلائی اس پر اس طرح اُڑھائی گویا سر جھکائے چھالیہ کتر رہی ہیں۔ میاں کو ان کے کرتوتوں کی کیا خبر۔ وہ آئے اور سیدھے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ کڑوے تیل کے چراغ کی روشنی ہی کیا ہوتی ہے۔ سمجھے کہ گھر والی پان بنا رہی ہیں۔ بولے "کیوں جی، ہمیں بھی پان ملے گا؟ منہ سیٹھا ہو رہا ہے۔" مگر جواب ندارد۔ پھر کہا "کچھ خفا ہو، کیا بیٹھے بیٹھے اونگھ گئیں۔" کھپچی کیا بولتی۔ "ارے صاحب، نیند آ رہی ہے تو پلنگ پر لیٹ جاؤ۔" اب بھی جواب نہ ملا تو اُٹھ کر پٹاری کے پاس آئے اور دُلائی کا پلا کھینچ کر کہنے لگے "اللہ رے تمھارا نخرہ، لو اب اُٹھتی ہو یا گود میں لے کر اٹھاؤں۔ دُلائی کو ہاتھ لگانا تھا کہ کھپچی سیدھی ہو کر اُچھلی۔ مولانا کود کر پیچھے ہٹے۔ اندر کے دالان کی بغلی کوٹھڑی میں سے قہقہے کی آواز آئی۔ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے جو دیکھتے ہیں تو دلائی کے نیچے بانس کی ایک کھپچی اور دو تکیے پڑے ہیں۔

میاں: "لاحول ولا قوۃ! ارے بی!! تم بھی۔"

بیوی: "(قہقہہ لگا کر) تم بھی کیا۔ آپ نے مجھ کو شیطان مقرر کیا ہے جو لاحول پڑھی۔"

میاں: "آخر یہ کون سی رحمانی حرکت تھی۔"

بیوی: "بس ڈر گئے۔ ذرا سی کھپچی ہے۔ اتنی بڑی ڈاڑھی والے مرد ہو کر۔"

میاں: "اس طرح بے خبری میں تو آدمی پرچھائیں سے ہول کھا جاتا ہے۔"

بیوی: "نہیں تو آپ شیر کا مقابلہ کریں۔"

میاں: "کبھی موقع ملا تو دیکھ لینا۔"

بیوی: "ماشاء اللہ! ماشاء اللہ۔"

یہ تو چُہل کی باتیں تھیں۔ اب حاضر جوابی اور تک بندی ملاحظہ ہو۔ گرمی کا موسم تھا، رات کا وقت۔ دونوں میاں بیوی بالاخانے پر کھلے ہوئے صحن میں براج رہے تھے۔ فتیل سوز میں کڑوے تیل کا چراغ روشن ہے۔ ہوا سے بچانے کے لیے برجی نما جھرجھرے کپڑے کا فانوس ڈھکا ہوا ہے۔ اُس وقت لالٹین وغیرہ کہاں تھیں۔ روشنی

اور روشنی کی حفاظت کے لیے یہی سامان تھے۔ مولانا کو پیاس لگی۔ خدا جانے کیا سوجھی۔ شاعری کو مولویوں سے کیا علاقہ۔ لیکن نئی بیوی صحبت کا اثر تک بندی کو جی چاہا۔ ایک مصرع گھڑا اور کہنے لگے ع "آبِ خُنک صُراحی سے جلدی انڈیل دو"۔ بیوی مسکراتی ہوئی اٹھیں کہ اتنے میں چراغ کا تیل ختم ہو چکا تھا۔ صُراحی کے پاس جاتے جاتے ان کی شاعری بھی اُکسی۔ وہیں سے بولیں۔ ع "اندھیرا ہو رہا ہے اٹھو لاکے تیل دو"۔ مولوی صاحب بپچے گئے۔ بوتل دیکھی تو تیل ندارد آواز لگائی ؎

بوتل میں ایک بوند بھی باقی نہیں ہے تیل
بیوی بس آج رات تو یوں ہی ڈھکیل دو

نیازی خانم پورا شعر سُنتیں اور چپ رہتیں۔ فوراً سُر میں سُر ملایا ؎

تیلی کے گھر میں تیل کا کیا کال مولوی
ٹٹخار کی مار کولھو کے بیلوں کو ٹھیل دو

میاں کو اس کے جواب میں قافیے کی تلاش ہوئی۔ ٹٹولتے ہوئے اوپر آئے اور کہنے لگے۔

ع سرسوں کہیں دھری ہے جو گھانی میں ریل دو

یہاں خانم کا قافیہ بھی تنگ ہوا۔ اتفاق سے مولوی صاحب زمیندار بھی تھے۔ ان کی کسی اسامی کے ہاں سے اسی دن السی کی دو بوریاں آئی تھیں۔ سوجھ ہی تو ہے۔ فوراً جواب دیا ؎

سرسوں اگر نہیں ہے تو السی کو پیل دو

مولوی صاحب پھسڈی رہے جاتے تھے زور لگا کر بولے۔

ع کیوں رات کھوٹی کرتی ہو سونے کا میل دو

رات زیادہ آ چکی تھی، چراغ بجھ چکا تھا۔ اندھیرے میں قافیے بھی نہیں سوجھتے تھے۔ آخر بیوی نے یہ کہہ کر ع "کب تک یہ عمرے اونٹ کو اپنے نکیل دو"۔ مشاعرہ ختم کیا۔ اور دونوں سو گئے۔ مولوی صاحب اپنے کو عربی نسل سے بتاتے تھے، اس لیے اُن پر اونٹ اور نکیل کی پھبتی ایسی ہوئی کہ وہ دلوں نہیں بھولے۔

جب تک مولوی صاحب رنڈوے رہے۔ ان کے بچّوں کو خالہ نے رکھا۔ ان کا گھر بس گیا تو تھوڑے دن کے بعد بچّے بھی آ گئے۔ بچّوں کے ساتھ بڑوں کی زندہ دلی کہاں رہتی ہے۔ پھر جہاں بچّے شریر بھی ہوں اور سوتیلے بھی۔ سوتیلے بچّوں کی تربیت کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ قدم قدم پر دشواریاں۔ ان کے سُدھارنے کے لیے ذرا سختی کی اور سیکڑوں برائیاں سپلے بندھیں۔ سوتیلی ماں کا نام بدنام۔ لوگوں کے طعنوں کا خیال کرو اور ان کی ڈوری ڈھیلی چھوڑ دو تو عادتیں خراب ہوتی ہیں۔ بچّے بہت ہی بُرے اُٹھے تھے۔ نانی خالہ کے بے تکے لاڈ نے بالکل بدتمیز اور ناکہا مان کر دیا تھا۔ نہ کھانے پینے کا وقت، نہ بیٹھنے اُٹھنے کا سلیقہ۔ کوئی توے پر سے روٹی اُچکا کر لے گیا۔ کسی نے ہنڈیا کی چپنی توڑ دی۔ پانی کے مٹکے میں ہاتھ گھنگول دیے۔ ابھی اُجلی برف سی چاندنی بچھائی ہے، ابھی کیچڑ کے دھبّے موجود۔ مٹّی کے بھرے ہوئے پاؤں لیے چلے آتے ہیں۔ جھاڑو کی تیلی تیلی الگ ہے۔ کپڑے دم بھر میں چیکٹ۔ سوتیلی ماں ڈانٹتی تو مُنہ چڑاتے، انگوٹھے دکھاتے۔ چار دن میں ناک چنے چبوا دیے۔ یا تو گھر چندن سا رہتا تھا یا کباڑیے کی دُکان بن گیا۔ مولوی صاحب سے بچّوں کی شکایت کرنی مناسب نہ تھی۔ مگر ایسی حالت میں بسر کرنا بھی دشوار تھا۔ صفائی پسند طبیعتیں ہر وقت کی غلاظت سے تنگ آ جاتی ہیں۔

کیا کریں؟ کس تدبیر سے مولوی صاحب کو بچّوں کی اصلاح کا خیال دلائیں کہ شکایت بھی نہ ہو اور ان کی تربیت کا انتظام بھی ہو جائے۔ ایک رات خانم نے یہ ترکیب نکالی کہ مکان کے سارے برتن بھانڈے، فرش فروش، پلنگوں کے بستر وغیرہ اٹھا کر کوٹھڑی میں بند کر دیے اور مولوی صاحب کے آنے کی منتظر رہیں۔ بچّے اس دن خالہ کے ہاں گئے ہوئے تھے اور وہاں سے ماما کہہ گئی تھی کہ "آج ننھے میاں اور ننھی بیوی جم ہی جم آئیں گی۔ مولوی صاحب کی ڈیوڑھی میں آہٹ ہوتے ہی آپ جلدی سے ملتع کی کوٹھڑی میں چھپ گئیں۔ مولانا جو اندر گھسے تو عجب سماں دیکھا۔ چراغ تو ضرور جل رہا ہے لیکن مکان کو جیسے کوئی لُوٹ کر لے گیا۔ دالانوں میں بوریا تک نہیں پلنگ دیواروں سے لگے کھڑے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ بیوی بھی غائب۔

حیران پریشان کہ کیا مصیبت آئی۔ ان کا طریقہ تھا کہ جب فکرمند ہوتے ٹہلا کرتے۔ ٹہلنے لگے، اور کرتے بھی کیا۔ بہتیرا عقل کو دوڑاتے، کوئی شرعی مسئلہ تو تھا نہیں جو حل کر لیتے۔ بیوی کی کارستانی تھی۔ وہی کھولتیں تو کھلتی۔ ٹہلتے ٹہلتے دو چار منٹ گزر گئے اور بھید نہ کھلا تو اپنے بھیانک تصوّرات کو ٹالنے کے لیے دل کے اندر ہی اندر تک بندی شروع کر دی۔ گنگناتے گنگناتے ٹھنڈا سانس لے کر ذرا آواز سے بولے۔

"اللہ! کس سے پوچھوں گزرا ہے سانحہ کیا ڈاکہ پڑا کہ گھر میں چوروں نے ہاتھ مارا
بیوی ہے اور نہ بچّے بستر اور نہ تکیے سنسان اس مکاں میں کیونکر کروں گزارا"

بیوی نے کوٹھڑی میں سے آواز بنا کر جواب دیا۔

"کون آئے گا بتانے غیروں کو کیا پڑی ہے ڈاکہ پڑا نہ گھر میں چوروں نے ہاتھ مارا
بچّے تمھارے دونوں بے طور اٹھ رہے ہیں اُن کی ذرا خبر لو کرتی ہوں میں اشارا

مولوی صاحب اب سمجھ گئے، اور کہنے لگے۔

بے ماں کے ہیں یہ بچّے اور عمر کے ہیں کچّے ان سے نہ بیر باندھو، کہتا ہوں میں خدارا

بیوی۔

تم جانتے ہو کیا میں ڈرتی نہیں خدا سے میں اور بیر باندھوں یہ وہم ہے تمھارا
ہوتے اگر وہ اچھے آنکھوں پہ میں بٹھاتی رکھتی سدا بنا کر آنکھوں کا اپنی تارا"

مولوی صاحب کو یقین ہوا کہ بچّے ننھیال والوں کی بے غوری کے سبب تکلیف دہ ثابت ہو رہے ہیں۔ واقعی ان کی طرف توجّہ کرنی چاہیے اور سوتیلی ماں کے نازک تعلقات کا بھی لحاظ ضروری ہے۔ تک بندی کا سلسلہ توڑ کر بولے۔ "تمھاری نصیحت میں نے مان لی۔ نکل آؤ۔ جو تم چاہتی ہو ویسا ہی ہوگا۔ اب تک جو کچھ ہوا مجبوری تھی۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے بچّوں کی دشمن نہیں۔"

اس کے بعد دونوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ دنیا کچھ کہے، بچّے کیسے ہی فیل لائیں ہم کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ چنانچہ کچھ دن تو ضرور صبر اور جبر سے کام لینا پڑا۔ بُرائی عادتیں ترک کرانے کے لیے کسی قدر سختی کی ضرورت تھی، لیکن کچّی اور نرم شاخیں تھیں جلد ہی سیدھی ہو گئیں۔ باپ نے تعلیم دی اور ماں نے تربیت اپنے ہاتھ میں لی۔ خدا نے مدد کی۔ جو دیکھتا تعریف کرتا کہ "اللہ اولاد دے تو ایسی، کیوں نہ ہو، مولوی کے

بچّے اور دلّی کی ماں۔ کیا کہنا ہے۔ خوب اٹھایا۔"

سدا رہے نام اللہ کا۔ افسوس یہ زندہ دل اور لائق بیوی زیادہ عرصے زندہ نہیں رہیں۔ بڑی منّتوں سے کئی سال کے بعد اولاد کی اُمید ہوئی تھی۔ کچّا بچّہ ہوا۔ قصبے کی دائیاں جاہل۔ بچاری جوان لہلہاتی ہوئی چلی گئیں۔ مولوی صاحب کو کتنا صدمہ ہوا بس یہ سمجھ لو کہ باقی زندگی انھوں نے گھر میں بیٹھ کر گزار دی۔ یا تو وعظ میں بھی ہنسنے ہنسانے سے باز نہ رہتے یا پھر کسی نے انھیں مسکراتے بھی نہیں دیکھا۔ کوئی انھیں پرانی باتیں یاد دلاکر ہنسانا چاہتا تو کہہ دیتے ؎

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مُردہ دل خاک ہنسا کرتے ہیں

میاں حسنات

میاں حسنات شاہی رکاب داروں میں غدر سے پہلے کی یادگار تھے۔ کالی مسجد کے پچھواڑے مکان تھا۔ قلعہ اُجڑنے کے بعد نوکری کی قسم کھالی تھی۔ دس پانچ بگڑے ہوئے گھرانوں میں شہر آبادی کے زمانے کی رسمیں تھیں، ان ہی کے سہارے پر گزارہ تھا۔ طرح طرح کے اچار بنا لیے، رنگ برنگ کے مربّوں سے چھوٹی چھوٹی اچاریاں بھر لیں۔ تحفتاً لے گئے اور اپنے قدر دانوں کو دے آئے۔ عید بقرعید اور دوسرے تہواروں پر جیسا موقع دیکھا کبھی نکتی پلاؤ، موتی پلاؤ، نرگس پلاؤ، ماہی پلاؤ۔ کبھی من سلوا، یاقوتی، سنہری فیرنی۔ سمنی، کبھی بادشاہ پسند دال۔ حسینی کباب، نکتی کباب، کبھی حلوا سوہن، کندن حلوا، ریشمی حلوا وغیرہ تیار کیا۔ قابوں، تشتریوں، خوانچوں میں جا کشتیوں میں لگا پیش کر دیا۔ ایرے غیروں نو دولتوں کا ہاتھ تکنا وضع کے خلاف تھا۔ والیانِ ریاست کی طرف توجہ نہیں کی۔ دو چار مرتبہ بلائے بھی گئے لیکن کچھ خوش نہیں آئے۔ پوچھا تو ٹھنڈا سانس بھر کر کہہ دیا کہ "حسنات ہماری آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں اور یہ رئیس ندیدے ہیں۔ ہم کو سمجھنے والے قبرستانوں میں سو رہے ہیں۔

کہنے کو معمولی رکاب دار تھے مگر مرتے مرتے نہ اپنی وضع میں فرق آنے دیا نہ آن بان چھوڑی۔ رنگ سانولا چیچک سے کوچا کریلا۔ لباس کی یہ شان کہ جسم پر مینوا کا بغیر کرتے کے انگرکھا۔ ٹانگوں میں گوٹ لگا ہوا ایک برا پاجامہ۔ گول پنجے کی جوتی۔ اس پر نخرے ایسے کہ خدا کی پناہ۔ ان کی لائی ہوئی کسی چیز میں فی تو نکال دیجیے۔ پیچھا چھڑانا

مشکل ہو جائے۔ زیادہ بحث کیجیے تو فوج داری پر آمادہ۔ ہاں اگر آپ نے ان کی تعریف
کر دی تو پھر آپ سے بڑھ کر کوئی قدر دان نہیں۔ قلعے کے کھانوں کا چٹخارا آپ کے سوا
دوسرا کوئی کیا جان سکتا ہے۔

بعض لوگوں کی زبان پر کوئی چھوٹا سا جملہ یا خاص لفظ ایسا چڑھ جاتا ہے کہ
اس کے بغیر نہ کوئی بات شروع ہوتی ہے نہ ختم۔ پہلے یہ مرض زیادہ تھا اب کچھ
دنوں سے پڑھے لکھوں میں تو صرف "گویا" اور "یعنی" تکیہ کلام رہ گیا ہے۔ البتہ جاہلوں
کی گفتگو سنیے تو آج بھی قسم قسم کی گالیاں طرح طرح کے بے ربط فقرے تکیہ کلام ہیں۔
مثلاً کسی کا تکیہ کلام "جو ہو سو ہو" ہے۔ کسی کا "اللہ جانتا ہے"، کسی نے "وہ جو کہتے ہیں"
کو سخن تکیہ بنا رکھا ہے تو کسی نے "کیا سمجھے" کو۔ اسی طرح میاں حسنات کا تکیہ کلام "حضرت
سلامت من" تھا۔ لیکن کثرتِ استعمال سے یہ فقرہ گھس گھسا کر ایسا سپاٹ ہو گیا تھا
کہ اس نے "حسنات" کی شکل اختیار کر لی تھی اور ان کی گفتگو میں حسنات کی اتنی بھرمار
تھی کہ لوگوں نے ان کا نام ہی حسنات رکھ لیا تھا۔ ورنہ ان کا نام مرزا احسن بیگ تھا۔
شروع شروع میں حسنات کہنے والوں سے یہ بگڑے بھی رہے۔ دو چار سے جھڑپ بھی
ہو گئی۔ آخر تا بہ کے زبانِ خلق نقارۂ خدا۔ صبر کر کے بیٹھ رہے۔ پیٹ کی مار نے سب کچھ
گوارا کرا دیا۔

میری پہلی ملاقات ان سے عید کے موقع پر ہوئی تھی اور یہ مجھ کو تازہ ولایت
سمجھ کر مرغِ مسلّم کے کباب بنا کر لائے تھے۔ ان کا تحفہ تو میری سمجھ میں آیا نہیں تاہم میں
نے دس روپے کا نوٹ ان کی نذر کیا اور والد کے اشارے سے کبابوں کی ایسی
واقف کارانہ تعریف کی کہ انھیں میرے ساتھ خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ہر اتوار کو وہ بلاناغہ
میرے پاس آتے اور کوئی نہ کوئی چیز بھی لاتے۔ رفتہ رفتہ مجھے بھی ان سے ہمدردی
ہو چلی۔ پرانی وضع اور زمانے سے ٹھکرائے ہوئے لوگوں سے مجھ کو قدرتی لگاؤ ہے۔
ان کی باتوں میں کچھ ایسا بھولا پن اور مٹھاس ہوتی ہے کہ گھنٹوں بے تکان سنے جاؤ
مجال ہے طبیعت اکتا جائے۔ وہ اپنی آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے واقعات کی ایسی
سچی۔ رنگ آمیزی کے بغیر تصویر کھینچتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔ اُن کی منجھی ہوئی
زبان دلّی کی خاص اردو اور لچھے دار تقریر تبرک معلوم ہوتی ہے۔ افسوس قلعے کی

یہ دینیں نکل نکل کر پہلے تو دلی کے روڑے بنیں پھر یہ روڑے بھی نہ رہے ایک ایک کر کے سب قبر کے گڑھوں میں پٹ گئے اور جو اکا دکا ٹھوکروں میں آرہے ہیں آگے پیچھے عنقریب وہ بھی خاک میں مل جائیں گے۔

ایک دن مغرب کے بعد میں اپنے کمرے میں جھلایا ہوا بیٹھا تھا، بھوک کی شدت تھی مگر کھانا کیا خاک کمیلا بند تھا۔ ساگ پات کھانے سے کیا پیٹ بھرتا بازار کی مٹھائی یا بھینسے کے کباب میں کھایا نہیں کرتا۔ گویا صبح سے فاقہ تھا۔ کہ اتنے میں میاں حسنات کی آواز آئی۔ "چھوٹے میاں کہاں ہیں؟" خانساماں باہر دروازے سے لگا کھڑا تھا اس نے اندر کی طرف اشارہ کر دیا، چک کے پاس آکر آواز دی، "میاں غلام حاضر ہو سکتا ہے؟" میں نے ذرا غصیلی آواز سے "آیئے" کہا اور بھوک پر غالب آنے کی کوشش کرنے لگا۔ کن انکھیوں سے جو دیکھا تو حضرت سلامت من کے ہاتھ میں سفید تولیے سے ڈھکی ہوئی ایک قاب تھی اور ساتھ ہی کبابوں کی خوشبو بھی ناک میں پہنچی۔ جی تو یہ چاہا کہ ان کے ہاتھ سے قاب جھپٹ لوں۔ کیسا تکلف اور کہاں کی آدمیت۔ مگر یہ سوچ کر کہ کہیں میرا خیال مجھے دھوکا تو نہیں دے رہا، جمعے کے دن گوشت کہاں کوئی حلوا دلوا ہوگا۔ میں اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔

میاں حسنات بھلا مجھے اُداس اور مکدر کب دیکھ سکتے تھے۔ انھوں نے آتے ہی پوچھا۔

حسنات : آپ چُپ چُپ کیوں ہیں؟

میں : کچھ نہیں۔ ابھی کھانا نہیں کھایا ہے۔

حسنات: سات بج گئے اور کھانا نہیں کھایا۔

میں : کھانا کیا۔ آج گوشت کہاں ہے۔ صبح سے بھوکا ہوں۔ میرا بس چلے تو ان قسائیوں کو پھانسی دے دوں۔

حسنات : سچ ہے کہیں بغیر گوشت کے انسان کا پیٹ بھر سکتا ہے۔ آپ کے دشمن بھوکے رہیں۔ لیجیے کباب حاضر ہیں، نوش فرمایئے۔ خدا شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے۔

اب جو قاب کھولتے ہیں تو دماغ تک چٹخارے لینے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہادر شاہ کے تخت پر بیٹھا ہوں۔ سارے کباب روکھے ہی چٹ کر گیا۔ پانی پیا۔

آنکھیں کھلیں۔ حواس دُرست ہوئے تو مسکرا کر پوچھا "کبابوں کی تعریف تو بعد میں کروں گا پہلے یہ بتاؤ کہ تم گوشت کہاں سے لائے۔ کہیں پاس پڑوس میں کوئی اللہ نام کا بکرا ہوا تھا یا کوئی مرغی حلال کر ڈالی؟"

حسنات: اللہ اللہ کیجیے۔ خانہ زاد اللہ کے نام کے گوشت کے پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ اور مُرغی جس کا نام مُرغی ہے سولہ آنے سے کم بھلا کیا ملتی۔ تو آپ کے غلام میں اتنا مام کہاں۔ اچھا آپ یہ فرمایئے کہ کباب بھی پسند آئے۔

میں: مزے کے نہ ہوتے تو میں اس رغبت سے نہ کھاتا۔ تم جانتے ہو کہ میں کھانے میں کیسا با مذاق ہوں۔ لیکن تعجب ہے کہ تمھیں گوشت کیونکر ہاتھ آگیا۔

حسنات: آداب عرض کرتا ہوں۔ آپ کی چناں چنیں کی حقیقت معلوم ہوگئی۔ یہ کباب گولر کے تھے۔

میں: جی ہاں کہیں گولر کے کباب بھی تلے گئے ہیں۔ صاف تو گوشت کے تھے

حسنات: جھوٹے پر لعنت ہے۔ بالکل کچّے گولروں کے تھے۔ بالکل کچّے گولروں کے۔ خدا آپ کو نیکی دے۔ یہی ہمارے کمال ہیں۔ گھاس پھوس میں جس چیز کا کہیے مزہ آنے لگے۔ حکم ہو تو کنکر پتھر کا ایسا قورمہ کھلاؤں کہ گوشت کو بھول جایئے۔ بادشاہ اور شاہ زادے ہمارے نخرے مفت نہیں اٹھاتے تھے۔ شکار پر گئے ہوئے ہیں۔ گوشت سے جی بھر گیا ہے، حکم ہوا خاصے پر سبز ترکاریوں کے سوا کچھ نہ ہو۔ فرمان شاہی۔ دم مارنے کی کس میں طاقت۔ بس گوشت ہی کو ایسا بنایا کہ قابوں سے دستر خوان بھر دیا۔ کسی میں چقندر کا مزہ ہے تو کسی میں شلغم کا پالک کے ساگ کی الگ خوشبو آرہی ہے اور آلو کے قتلے جُدا نظر آرہے ہیں۔ پھر کبھی آدھی رات ہے جسولنی بھاگی چلی آئی ہے کہ زینت محل صاحبہ ہرن کے کباب کھانے کی ضد کر رہی ہیں۔ ہرن کا گوشت کہاں مگر حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ جواب دینا اپنی کم بختی بلانا تھا۔ بس یہی ہمارے ہنر تھے کہ چٹکی بجاتے جو کہا وہ تیار ہے۔ پھر انعام بھی ایسے ملتے تھے کہ آج انھیں یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں۔

میں: تو یہ کہیے آپ پورے رکابدار ہیں۔

یہ کہہ کر میں نے پانچ روپے نذر کیے اور آرام کرسی پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر اُن سے کوئی اگلا قصہ سُنانے کی فرمایش کی۔

حسنات: جو کہیے وہ سناؤں۔ ان آنکھوں نے جو کچھ دیکھ لیا ہے اب تو کہانیاں ہی ہوگئی ہیں۔

میں: میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ آخر پچھلے وقتوں میں کیا دودھ شہد کی نہریں بہتی تھیں یا یہاں فرشتوں کی آبادی تھی جو اس زمانے کی ہر چیز پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ حسنات شہر میں ایسی رونق، آسایش کا ایسا سامان کبھی کسی نے دیکھا تھا۔ ولایت کا کپڑا، کابل قندھار کے میوے پہلے بادشاہوں اور بڑے بڑے امرا کو میسّر آتے تھے۔ آج غریب سے غریب بھی کابل اور چمن کے انگور، سردے، قندھار کے انار، کشمیر کے سیب، ناشپاتی جب چاہے کھا سکتا ہے۔

حسنات: اب آپ سے میں کیا عرض کروں۔ آپ نے شہر آبادی کا زمانہ دیکھا ہی نہیں۔ آپ نے پھلوں کا نام لیا ہے تو سنیے۔ پھل پھول میوے ترکاریاں تو آج بھی بکتی ہیں مگر انھیں کون خرید تا ہے؟ جنھیں حکیم بتائے، یا جسے نوابی کا شوق چرّائے۔ جس سودے والے کو دیکھو گونگی ہڑپ کیے بیٹھا ہے۔ کبھی کبھی کوئی ہانک لگاتا ہے تو بے تُکی جیسے پتھر اٹھا کر مار دیا۔ یہ نہیں کہ آواز پر لوگوں کے مُنہ میں پانی بھر آئے اور ان ہوے کا جی للچا جائے۔ اس ہمارے وقت کے جاہل کنجڑے بھی جن کو غلط اور صحیح زبان کا ہوش نہ تھا اپنے سودے کو ایسی لے میں بیچتے تھے کہ شہری تو شہری غیر مُلک کے آدمی بھی ان کی صدائیں سُن کر بن بلائے آپھنستے تھے اور کنجوس سے کنجوس مکھی چوس بھی حاتم کی گور پر لات مار کر دو چار پیسے خرچ کیے بغیر ممکن ہے کہ رہ جائے۔ اگر کوئی مارو بینگن بیچتا تھا تو اس کی صدا تھی۔ "اُودے اُودے ہری چھتری والے ڈھبکلیوں کے پالے" یا "بھاڑ میں بُھلبھلا یا چنے کی دال میں گُھلا"! گویا وہ اس کے کھانے کی ترکیب بھی بتا رہا ہے کہ اس کی لذّت یا تو بُھرتے میں آتی ہے

یا چنے کی دال میں۔ پونڈے والا کہتا ہے " پیٹ کا بھوجن ہاتھ کی ٹیکن " یا اس کی صدا ہوتی تھی۔ " ہونٹوں سے چھیلو اور کٹورا بھر شربت پی لو " کوئی رشاہ مردان کی لالڑیاں پکار پکار کر گاجر چھیپے میں لگائے پھرتا ہے۔ " پال کے لڈو " لڈو کے بال " یہ آم والوں کی صدائیں تھیں۔ " تیر کر آئی ہے بہتے دریا کو " کیا سمجھے ؟ شرط والے کی باڑی ہے " ان صداؤں سے لکڑیاں بکتی تھیں۔ یعنی یہ وہ ترکاری ہے جسے دریا کے کنارے فالیز میں بوتے ہیں اور جو شرطیہ میٹھی باڑی کی ہیں۔ " لون کے بتاسے " کالی بھونرالی نکیں " اُودی اودی کالی کالی رسیالی " کیا ؟ جامنیں۔ " نرمل تلاو کے دودھیا " کیوڑے کی بیل کے بتاسے " " کانٹوں کے ہریالے " یعنی صاف پانی کے نرم نرم سنگھاڑے جن میں سے کیوڑے کی خوشبو آتی ہے اور میٹھے بھی ہیں۔ منہ میں رکھا اور حسنات بتاسے کی طرح گھلے، کانٹوں میں ایسا مزے دار میوہ۔ کیا آج بھی یہ معمولی ترکاریاں ان سُروں میں بیچی جاتی ہیں۔ پھر کاغذی گری کے بھنا دے بادام " " اخروٹ کی گری کے مزے کا " نام نہیں لیتا مگر اتا پتا دیا کہ بھنے سنگھاڑے بیچتا ہوں " ریشم کے جال میں ہلایا " قند کا بنا ہے جلیبیا " سانولے سلونے ہیں شربت کو " " نیری چھالی کے اُودے اُودے بنا دیے ہیں شربت کو " یہ شہتوت اور فالسے والوں کی آوازیں تھیں۔ " قند کے ڈلے ہیں " " باڑی کے لال رنگت کے گھڑے ہیں " یہ آوازیں لگا کر خربوزے اور تربوز بیچے جاتے تھے۔ بھٹے والا کہتا تھا " دریا کی ریتی کے کیلے ہی کا مزہ۔ نو بہار کیلے، بھٹے ہری ڈالیوں والے " پہلی آواز میں بھٹے کو کیلا کہہ کر لالچ دیا۔ ساتھ ہی دریا کی ریتی سے کیلے کا شبہ بھی مٹا دیا تاکہ سننے والا دھوکا نہ کھائے۔ پھر نو بہار سے فصل کا نیا پھل اور ہری ڈالی کے بھٹے میں جو مٹھاس اور نفاست ہوتی ہے۔ سوکھی ڈالی اور رات کے بسے ہوئے میں نہیں ہوتی۔

ان سودا بیچنے والوں کی صدائیں، جس طرح میں نے گھاس کاٹی ہے اس طرح نہیں سناتے تھے بلکہ ہر آواز کو اپنی لے میں ادا کرتے تھے۔ خود تو انھیں کچھ مزہ آتا ہو گا یا نہیں میرے لیے تو ہر صدا لوری ہو گئی اور میں آرام کرسی ہی پر اُونگھ

گیا۔ میری عادت تھی کہ جب کوئی قصہ کہتے تو میں بچوں کی طرح دو دو چار چار منٹ کے بعد ہوں کرتا رہتا اب جو انھوں نے میرا ہنکارا نہ سُنا تو اپنی کرسی سے اُٹھ کر میرے قریب آئے اور بولے "خوب! میں بکواس کر رہا ہوں اور آپ سو رہے ہیں۔ اچھارات بھی خاصی آگئی ہوگی آرام فرمایئے" سونا تو کیا کہیں کرسی پر نیند آتی ہے۔ یوں ہی ذرا غنودگی سی آگئی تھی۔ ان کی آواز سے میں ہوشیار ہو گیا۔ گھڑی جو دیکھی تو ابھی دس بھی نہیں بجے تھے۔ ساڑھے بارہ بجے کی گاڑی سے والد اور والدہ علی گڑھ سے آنے والے تھے اور ان کا انتظار لازمی تھا اس لیے میں نے حسنات سے کہا۔

"بیٹھیے بھی اتنے سویرے سے گھر پر جا کر کیا کیجیے گا۔ جو رد ہے نہ جاتا ہے اللہ میاں سے ناتا ہے۔ آپ کا بھی وقت گزر رہا ہے میرا دل بھی بہل رہا ہے۔ ہاں تو ان دنوں میں سودے والے سودا نہیں بیچتے تھے لوگوں کو اپنی سے کاری سناتے تھے۔

حسنات: آپ نے سے کاری تو کہہ دیا یہ بھی تو کہو کہ ان کی صداؤں میں سلیقہ تھا۔ اور کن اداؤں سے معمولی سی معمولی چیزیں بیچتے تھے۔ نیل کے کٹرے کے باہر ایک بڈھا پھونس رات کو کھجوریں بیچا کرتا تھا "شیدی گوہر کے باغ کی، مدنی سرکار کی جھوٹی، شہد کی چھاگلیں" آواز ایسی رس دار تھی اور زمزمہ بھی ظالم نے وہ چھانٹ کر رکھی تھی کہ حسنات رات کے سناٹے میں سننے والے تڑپ جاتے تھے۔ صدا پر غور کیجیے۔ شیدی گوہر ایک خواجہ سرا تھے۔ حج کو جا کر جو واپس آئے تو خاص مدینے کی کھجوریں بادشاہ سلامت کے لیے تحفے میں لائے۔ ان کھجوروں کی گٹھلیاں بڑی حفاظت سے باغ میں بوئیں۔ اس کے پھل مدتوں تبرک کے طور پر بٹتے رہے۔ غدر ہوا تو وہ باغ بھی اُجڑ گیا۔ لیکن دلی میں جب کھجوریں بکیں شیدی گوہر کے نام سے بکیں۔ ایک ترکاری والے کیا جس کی صدا اسنو البیلی اور انوکھی تھی۔ فقیروں کی صدائیں بھی جُدا گانہ تھیں۔ صرف آواز سُن کر معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ ملنگ ہے یا قلندر۔ آزاد ہے یا کسی گروہ کا چیلا۔ لاچار ہے یا مکار پیشہ ور

ہے یا کوئی وقت کا مارا دُکھیارا۔

دِلّی میں ایک تو وہ سقّے جو گھروں میں پانی بھرتے پھرتے ہیں اور ایک وہ تھے جو دن بھر کٹورا بجا کر بازاروں میں دو کوڑی پیاس اور چار کوڑی پیاس پانی پلایا کرتے تھے۔ جھل پلانے والے سقّے ان کا نام تھا۔ نہ ان دلوں عام طور پر سبیلیں تھیں اور نہ شربت پانی کی دُکانیں۔ اس وقت اشرف بازار میں ٹھٹکنا تک عیب سمجھتے تھے چہ جائے کہ وہ راہ چلتے چلتے کچھ کھائیں پییں۔ غریب غربا چلتے پھرتے پیاس بجھا لیا کرتے تھے۔ سہ پہر سے چاندنی چوک میں، جامع مسجد پر اور چاوڑی بازار میں، قاضی کے حوض پر اور فراشس خانے کے باہر ان جھل پلانے والوں کا جمگٹ رہا کرتا تھا۔ بہار آتی تھی بہار۔ جس وقت وہ جھوم جھوم کر تال سُر کے ساتھ دو کٹورے ملا کر بجاتے تھے تو بڑوں بڑوں کو جھومتے دیکھا ہے۔ بھری مشک کندھے پر۔ مشک پر کھاروے کا تر بہ تر کپڑا پڑا ہوا۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا بھرا ہوا کٹورا لیے ہوئے چار کھڑے ہر ایک آنے جانے والے کی تواضع کر رہے ہیں " میاں پانی لاؤں، انگوری کا ہے۔ جھنڈے والے سے لایا ہوں۔ اندارے میں نئی سوت نکلی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے" اور دو مزے میں تھرک تھرک کر کٹورا بجا رہے ہیں۔ برف کا ان دنوں میں کیا کام تھا۔ لوگ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ملائی یا شربت کی قلفیاں جمانے کے سوا برف سے پانی بھی ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ یہ کل کی بنی برف ہوتی تھی۔ سردی پالے کے زمانے میں برف والے پانی کو جما کر کھتے بھر لیا کرتے تھے اور اسی سے سال بھر تک کام لیا جاتا تھا۔ تو دلّی والوں کے لیے خدا نے ویسے ہی سامان کر دیے تھے۔ شہر میں کوئی نہ کوئی کنواں ایسا نکل آتا تھا کہ کٹورا بھر پانی کیا مجال ہے ایک سانس میں کوئی پی لے۔ قدرتی میٹھے اور ٹھنڈے پانی سے آج کل کے برف گھلے ہوئے پانی کا کیا مقابلہ۔ اس اثنا میں اگر کسی من چلے راہ گیر نے کہہ دیا کہ " چودھری پلا دو سبیل" تو مزہ آجاتا تھا۔ شعر پر شعر پڑھا جا رہا ہے اور سبیل پکارتے جاتے ہیں " سبیل ہے پیاسوں کو" کوئی کہتا تھا کہ " تیرے پاس دل تو دے جا۔ نہیں پی جا راہِ مولا" " سبیل ہے حسین کے نام کی " " سبیل ہے دونوں شہزادوں کے نام کی" پانی پیو تو یاد کرو، پیاس امام کی۔ پیاسو! سبیل ہے یہ شہیدوں

کے نام کی" غرض چھٹپٹے تک پانی پلاتے کٹورا بجاتے اور رات کو اپنی منڈلی میں بیٹھ کر
کھنڈالا پتے اور مگن رہتے۔ ہائے کیا جنتی کا زمانہ تھا۔ اب تو جینے کو جی نہیں چاہتا۔
میں : حسنات اس وقت کی رنڈیوں کو تو آپ نے خوب دیکھا ہوگا؟ قلعے میں
سُنا ہے ہر وقت ان ہی کی گہما گہمی رہتی تھی، طبلے کی تھاپوں اور سارنگی کی
رُوں رُوں نے آخر سلطنت کا چراغ ہی گُل کر کے چھوڑا۔
حسنات : میاں قلعہ کوئی کنچن خانہ تھوڑی تھا۔ بادشاہت تو مدتوں سے دم توڑ رہی
تھی، بچارے ظفر کے ماتھے جا نی تھی، گئی۔ اور یہ جو کہو کر قلعے میں گانے
بجانے کیوں ہوتے تھے ؟ تو حسنات قلعہ کوئی سوگ کا گھر تو تھا نہیں کہ جہاں
دیکھو بسورے اور ٹسوے بہا رہے بیٹھے ہیں۔ ہاتھی ہزار لٹے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے
کا ہوتا ہے۔ سیکڑوں برس کے عیش کی عادت کہاں جاتی۔ دوسرے گانا بجانا
تو روح کی غذا ہے۔ دل بہلانے کا اس سے اچھا آپ ہی فرمائیے اور کون سا
مشغلہ ہے ؟ پھر گنی چنی گویا بار رنڈیوں کے سوا عام بیسواؤں کا وہاں گزر کب تھا۔
وہاں صورت کی پرسش نہ تھی۔ قلعے والے تو سیرت کے عاشق تھے۔ قلعے میں
جو طوائفیں داخل تھیں ان کی تہذیب، ان کا اخلاق، اُن کے رکھ رکھاؤ اور ان
میں جو کمال تھے آج کسی کو نصیب ہیں ؟ سب سے اوّل نمبر ٹڑھ مونہی خانم کا تھا۔
وہ فن موسیقی کی بے بدل اُستاد تھی۔ بادشاہ سلامت جب کوئی غزل، ٹھمری، ٹپّہ،
ہولی یا بسنت کہتے پہلے انھیں ملتی۔ ان کے گلے سے نکل کر دوسروں کی زبان پر
چڑھتی۔ ان کی تانوں پر تان سین کی روح ناچتی تھی۔ ٹیڑھے مُنہ سے گا کر
بڑے بڑے گویّوں کو سیدھا کر دیا۔ شاہی محل میں جس وقت وہ الاپتیں تو اُن
کی پاٹ دار آواز جمنا پار شاہ درہ، لونی، میراں شاہ عبداللہ میں لوگ اس
طرح سن لیتے جیسے ٹڑھ مونہی خانم وہیں گا رہی ہیں۔ غدر کے بعد بادشاہی
کے ماتم میں انھوں نے جوگ لے لیا تھا۔ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ
سے انھیں بے حد عقیدت تھی۔ قلعے سے نکل کر درگاہ شریف میں جا پڑیں
اور وہیں عمر بسر کر دی۔ روز صبح آستانۂ مبارک کے سامنے بیٹھ کر کبھی ساز
کے ساتھ اور کبھی بے ساز ایک دو چیزیں حضرت کی نذر کر جاتیں۔

دوسرے نمبر پر مرزا شاہ رخ والی مجوبن تھی۔ ضامن علی شاہ ضامن اس کے پیر تھے۔ اس لیے صابری رنگ اس پر ایسا چڑھا تھا کہ اچھے اچھے فقیر اس کو نہ پہچان سکے۔ سعدی، جامی، حافظ، مولانا روم، مغربی اور خسرو کا فارسی کلام اور ظفر، ذوق، مومن، عیش ممنون اور غالب کی اُردو غزلیں اس انداز سے گاتی تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ غزل کی تصویر سامنے ہے۔ پہلے اس کا نام نصیبن تھا آواز کے رس اور گانے کی خوبی سے مجوبن ہو گئی۔ کئی برس تک میں اس کے پاس رہا ہوں۔ صورت شکل تو اوہ جو شاہ بولا کے بڑ والی دھوبن ہے، بس عین مین ویسی ہی تھی مگر اس کے گُن کیا بات ہے! آواز میں خدا نے وہ تاثیر دی تھی کہ کیسا ہی غل شور ہو مجوبن نے سر نکالا اور سناٹا چھا گیا۔ ستر برس کی عمر میں یاروں نے آگرہ والی مُنّی بائی سے بھڑا دیا تھا۔ منّی کی چڑھتی جوانی، نیا ریاض، میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ اللہ ہماری بُڑھیا کی آبرو رکھے۔ سو قربان اس کے پیر کے یہ بوڑھا پہلوان کشتی جیت کر اُٹھا۔ بات کیا تھی؟ وہ بیچ مُچ کی کسبی نہ تھی۔ لوگوں نے اسے طوائف بنا دیا تھا ورنہ بڑی خدا رسیدہ صاحبِ حال و قال، نہایت شائستہ، نستعلیق اور پکّی مسلمان عورت تھی۔

حسنات کی ان باتوں میں مجھے ایسا لُطف آ رہا تھا کہ اگر والد خود میرے کمرے میں تشریف لا کر مجھے بارہ بجنے کی خبر نہ دیتے تو غالباً یوں ہی صبح ہو جاتی۔

پرنانی

پرنانی اپنے ہی کُنبے کی نہیں بلکہ سارے محلّے کی پرنانی تھیں۔ بچّے تو بچّے ہر جاننے والا بوڑھا ہو یا جوان، اُن کو پرنانی کہتا تھا۔ زندگی کے باغ میں اُن کی ہستی ایک ایسے درخت کے مانند تھی جو خزاں کے متواتر جھونکوں سے لُنڈ مُنڈ رہ گیا ہو۔ پھل پھول آنے بند ہو گئے ہوں اور جو صرف اس انتظار میں کھڑا ہو کہ فنا کی آندھی اسے گرا کر رکھ دے اور وہ جو کبھی زینتِ چمن تھا، کوڑا سمجھ کر پھینک دیا جائے یا خاک اس کو اپنی غذا بنا لے۔

پرنانی کی عمر کا یہ ایک سو پچیسواں مرحلہ تھا۔ دہلی کے لال قلعے میں جوانی گزاری تھی۔ بہادر شاہ مُغل تاج دار اُن ہی کی گودیوں میں پلے بڑھے، جوان ہوئے، تخت پر بیٹھے اور ان ہی کی آنکھوں کے سامنے رنگون بھیجے گئے۔ ان کا اپنا کنبہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ سات بیٹے اور پانچ بیٹیاں اور پھر پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں، خدا کی دی ہوئی جیتی جاگتی ایک دولت تھی جس پر بیٹھی ہوئی پرنانی راج کیا کرتی تھیں۔ لیکن یہ ساری بہار کچھ تو غدر میں لُٹ گئی اور کچھ موت نے تاراج کر دی۔

جب تک پرنانی سہاگن رہیں، دن عید اور رات شب برات تھی۔ ان کے نصیب کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔ سہاگ کیا اُجڑا کہ مانگ کے ساتھ کوک میں بھی آگ لگ گئی۔ آج ایک بیٹا مرا تو کل دوسرا۔ اس ہفتے پوتے کو روئیں تو اگلے ہفتے نواسے کو۔ شعبان میں نواسی نے دم توڑا تو شوال میں پوتی نے۔ دو تین برس کے اندر

اندر گھر بھر کا صفایا ہو گیا۔ جانوں کے ساتھ مال پر بھی جھاڑو پھر گئی۔ بر باد بڑھیا کلیجا مسوستی تھی اور رہ جاتی تھی۔ قضا کے مالی نے بھی سارے شاداب شگوفے ایک ایک کر کے چُن لیے اور اس مُرجھائی ہوئی پتیوں والے پھول کو نہ پوچھا۔

شاہی زمانے کا اتنا بڑا ڈھنڈار مکان اور ایک بڑھیا کا دم۔ پیٹ کی اولاد میں صرف ایک نواسی آمنہ باقی تھی وہ کبھی کبھی دن بھر کو آجاتی تو بچاری کا کچھ دل بہل جاتا۔ آمنہ اپنی ذات سے تو خاصی محبّت کرنے والی لڑکی تھی، مگر اس کا خاوند بڑا دماغ چوٹا مرد تھا۔ اور بچّے ایسے بُرے اُٹھے تھے کہ خدا کی پناہ۔ تاہم پرنانی کا ان کے سوا تھا بھی کون؟ اتفاقاً ان ہی دنوں میں آمنہ کے میاں احمد مرزا کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ احمد مرزا کا کوئی ٹھکانا رہا نہیں۔ خود کماؤ نہ تھے، باپ کے صدقے میں دندناتے تھے۔ قصّہ مختصر آمنہ کرایے کے مکان سے اُٹھ نانی کے پاس آگئیں اور مرزا صاحب باپ کے دسترخوان سے اُٹھ کر ننھیا ساس کے دسترخوان پر آ بیٹھے۔

کچھ دن تو بڑی بی کی خوب خاطریں ہوئیں۔ ان کو نہلایا جاتا دُھلایا جاتا تھا۔ میاں احمد مرزا بھی باہر آتے جاتے سلام کرتے تھے۔ بچّے ذرا سا بھی غل مچاتے تو بیسیوں نصیحتے سُنتے۔ جانا تھا کہ بڑا پان ہے آج نہ مری کل مری۔ اس کے پیٹ میں گھُس کر جو کچھ جمع جکھڑی ہے موس لیں۔ دس کھنڈلے ہیں ان پر قبضہ ہو جائے مگر بڑھیا کی پُرانی ہڈیاں تھیں۔ پانچ سیر کا گھی کھایا تھا وہ ایسی جلدی کیوں مرتی۔ اس کی تو اس بڑھاپے میں مٹّی خراب ہونی تھی۔ غرض کہ جب بڑی بی نے مرنے کا نام نہ لیا اور ان کی ہر چیز پر آمنہ اور اس کے شوہر کا تسلّط ہو گیا تو بال پڑے مٹکے کی طرح غریب کو باورچی خانے کے پاس ایک کوٹھڑی میں ڈال دیا۔

اب بچاری پرنانی کا لکھا پورا ہونے لگا۔ جب سب کھا چکتے تو بچا کھچا جھوٹن جھاٹن کھانے کو مل جاتا۔ مٹّی کا پیالہ اور ایک ٹوٹی جھجری پانی کے لیے رکھ دی اور اس کی بھی کوئی خبر نہ لیتا کہ خالی ہے یا بھری۔ کچھ مانگتی تو کوسنے اور گالیاں کھاتی۔ اپنی تقدیر پر روتی تو بچّے نقلیں کرتے مُنہ چڑاتے۔ آنکھوں میں روشنی تھی تو محبّت کی دنیا میں اندھیرا تھا۔ زبان میں طاقت تھی مگر اپنی دُرگت

کا ماجرا کس کو سناتیں۔ کوٹھری میں پڑی ہوئی اولاد کے داغ گنا کرتی یا اپنے گزرے ہوئے وقتوں کا ماتم کرتی رہتی۔ پاس پڑوس کی کوئی آنے جانے والی عورت آتی اور پرنانی اسں کو آواز دے لیتیں تو آمنہ یہ کہہ کر کہ "بوا اُن کا تو دل چل گیا ہے تم بھی کس کی باتوں میں آگئیں۔ ادھر آؤ" اُٹھالے جاتی اور بڑی بی منہ دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتیں۔

بڑی بی نے آمنہ کو اپنے جگر کا ٹکڑا سمجھا تھا۔ اُنھیں یہ کیا خبر تھی کہ اپنا پلا یا ہوا دودھ زہر ہو جائے گا۔ اور نواسی نانی کو گھر کا کوڑا سمجھنے لگے گی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آمنہ بیگم نے ترس کھا کر بڑھیا کو اپنے گھر میں جگہ دے دی ہے اور پرنانی مرزا صاحب کے ٹکڑوں پر پڑی ہوئی ہیں۔ پرنانی نے آخر کیا گناہ کیا تھا جس کے بدلے میں یہ سلوک کیے جاتے تھے۔ اس نے گھر کی بستی کے لیے نواسی کو آباد کیا، اپنے گھر بار کا مالک بنایا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جس کی بدولت آمنہ اور اسں کے بال بچے چین کر رہے تھے، اسں کی دل سے خدمت کی جاتی، اس کے پانو دھو دھو کر پیتے۔ اس کو بڑی بوڑھیوں کی طرح تبرک سمجھ کر رکھتے۔ اسے راحت کے ساتھ مرنے کا موقع دیتے۔ لیکن دنیا کی خود غرضی نے آمنہ اور اسں کے خاوند دونوں کی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ پرنانی اپنے گھر میں رہتی تھیں اور فقیرنی بن کر۔ وہ اپنے دسترخوان سے بھیک مانگتی تھیں اور انھیں بڑی حقارت سے ٹکڑا ملتا تھا۔

چند روز تک تو بڑھیا اپنی حالت پر روتی رہی، پھر اسے صبر آگیا۔ دو چار پرانی چیزیں جو اُس نے اپنی کوٹھری میں رکھ لی تھیں اور جن کی اب وہ مالک تھی ان سے دل بہلانے لگی۔ گھنٹوں ایک ایک چیز کو دیکھتی اور آپ ہی آپ باتیں کرتی۔ یہ نہ سونے چاندی کے برتن تھے نہ قیمتی زیورات۔ نہ کوئی کم خواب وزربفت کا لباسں تھا۔ نہ دولت کے مخفی خزانے۔ لیکن بڑھیا کے لیے یہ سب انمل بے جوڑ چیزیں اس کی زندگی کے افسانے کے دلچسپ ٹکڑے تھیں۔ کہیں اس کو اپنا بچپن کھیلتا نظر آتا تھا تو کہیں اس کی جوانی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ کسی شے میں وہ اپنی مرحوم مسرتوں کو مسکراتے ہوئے دیکھتی تھی تو کسی میں اپنی اولاد کی مٹی ہوئی تصویریں اسے دکھائی دیتی تھیں۔ گویا سوا سو برس کی ایک تاریخ تھی جس کا وہ بڑے

انہماک کے ساتھ مطالعہ کرتی رہتی تھی۔

اِن پُرانی یادگار چیزوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اور اس کی سوانح حیات کا سب سے اہم باب ایک مرقّع یا ہزار جامے کی دُلائی تھی اِسے سیکڑوں رنگ برنگ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنایا تھا کپڑے کی کوئی قسم ایسی نہ ہوگی جس کی کوئی نہ کوئی کترن اس میں نہ ہو۔ سب ہی قسم کے نمونے اس میں موجود تھے۔ گویا کپڑوں کے آثارِ قدیمہ کی نمایش تھی۔ وضع قطع کے لحاظ سے اقلیدس کی ساری شکلیں مختلف پیمانوں میں موجود تھیں۔ بیچ میں ایک چوکور، پیازی رنگ کا ریشمی ٹکڑا اس سلیقے سے ٹانکا گیا تھا کہ یہ متن اور دوسرے حاشیے معلوم ہوتے تھے۔ جب کبھی یہ سی گئی ہوگی تو دیکھنے والے اُسے گدڑی نہیں بلکہ بناوٹ کا کرشمہ سمجھتے ہوں گے لیکن اب تو یہ رائے بنھورا کا قلعہ تھی۔ بڑی بی کے ساتھ اس کا رنگ روپ بھی رخصت ہو چکا تھا۔ جوڑوں پر سے ٹانکوں نے دانت نکوس دیے تھے۔ کہیں تانا ہی تانا رہ گیا تھا، بانا غائب تھا۔ جگہ جگہ سے کیڑوں نے بھی اپنی خوراک حاصل کر لی تھی۔ اس دلائی کو بڑی بی کی سب سے زیادہ چاہیتی بیٹی آمنہ کی ماں، رقیہ نے اپنی جوانی کا رنڈاپا بہلانے کے لیے سیا تھا۔ پرنانی کے مشورے بھی اس کے جوڑ ملانے اور ٹکڑوں کی ترتیب میں خاص اہمیت رکھتے تھے۔ اس کا ہر پیوند ماں بیٹیوں کی زندگی کا راز شادی وغم کی تصویر، گونگے کا خواب اور آنکھوں سے گزرا ہوا ایک افسانہ تھا۔ اس لیے دوسرے نہ مٹنے والے داغوں کی طرح بڑھیا اس کو بھی سینے سے لگائے رکھتی تھی۔

ایک دن کسی تقریب کے سلسلے میں سفیدی ہو رہی تھی، دنیا کو دکھانے کے لیے آمنہ نے چاہا کہ بڑی بی کی کوٹھڑی بھی صاف کر دی جائے۔ چنانچہ اس نے سارا گڑگودڑ باہر نکال پھینکا اور بچّوں نے ان کو تماشا بنالیا۔ دُلائی کی نوبت آئی تو بچاری بہت سٹپٹائی۔ روئی چیخی، جھنجلائی، منتیں کیں۔ گڑگڑائی مگر آمنہ کی مُنہ زوری اور سخت گیری کے سامنے ایک نہ چلی۔ اب اِدھر سفیدی ہو رہی تھی اور اُدھر غریب بے آس بُڑھیا کونے کونے میں اپنی چیزوں کو ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ اگر کوئی چیتھڑا مل جاتا تو بچّے جھپٹّا مار کرلے جاتے اور وہ دیوانوں کی طرح ہاتھ پھیلاتی رہ جاتی۔

سفیدی ہوگئی تو پر نانی اپنی کھٹیا پر جا بیٹھیں اور اپنے وقت کا زیادہ حصّہ خاموش آنسو بہانے اور لمبے لمبے سانس لینے میں گزارنے لگیں۔ دقیانوسی خیال کے لوگوں کا قاعدہ ہے کہ وہ گھر کی پرانی چیزیں خواہ وہ کتنی ہی بے کار اور فضول کیوں نہ ہوں، ضائع نہیں کرتے اور داشتہ آید بکار کہ کر کسی مچان یا کسی کونے کھدرے میں رکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح آمنہ نے بھی جب سفیدی ہو چکی تو گھر کی دوسری غیر ضروری چیزوں کے ساتھ بڑی بی کا گودڑ بھی سمیٹ کر کاٹ کباڑ کی کوٹھری میں ڈال دیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

ایسی ایسی کئی تقریبیں آمنہ کے ہاں ہوئیں اور بڑی دھوم سے ہوئیں۔ مالِ مفت دلِ بے رحم۔ خوب دل کھول کر روپیا خرچ کیا۔ دونوں میاں بیوی نے پیٹ بھر کر ارمان پورے کیے۔ احمد مرزا کی اپنی کمائی ہوتی تو دل بھی دُکھتا۔ پرنانی بچاری کا اثاثہ تھا خاصے لگا۔ یہ سدا کے نکھٹّو تھے۔ باپ کی کھرچن ختم ہوئی تو نہیا سال کا سر سہلانے لگے۔ ایسے اللّے تللّے کی زندگی کے واسطے قارون کا خزانہ بھی کم ہے۔ چند ہی روز میں بڑھیا کی جایداد کا لگّا لگ گیا۔ پہلے رہن کی پھر فروخت ہوئی۔ صرف یہ رہنے کا مکان اور اس سے ملحق بازار کے رُخ کی گیارہ دُکانیں رہ گئیں۔ چھوٹے لڑکے کو گھوڑی چڑھانے کے لیے جو دو ہزار روپے قرض لیے تھے اس کا تقاضا شروع ہوا۔ بڑی لڑکی کا کارِ خیر ضروری تھا۔ لڑکے والوں کا اصرار اور اپنے دل کی خوشی کا موقع کیوں کر ہاتھ سے دیا جاتا۔ جیتے جی کے ہی میلے ہیں۔ فکر ہوئی کہ اس مکان کو بھی ایک دو تین کر دینا چاہیے۔ اتنے بڑے ڈھنڈار مکان کی کیا ضرورت ہے۔ لالہ جگّو مل نے پچاس ہزار لگائے ہیں۔ فی الحال ستّر اسّی روپے کا کرایہ ہے اور بھی مشکل سے پٹتا ہے۔ چالیس ہزار کی اچھے موقعے کی جایداد خریدیں گے تو ڈھائی سو کا کرایہ ہو جائے گا۔ باقی دس ہزار میں قرض ادا کرنے کے بعد لڑکی وداع ہو جائے گی۔ خود قرول باغ میں سستا مکان لے کر جا رہیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ اس کا قبالہ ان کے پاس نہ تھا اور بغیر قبالہ دیکھے خریدے کون؟

جب پانی گلے گلے آگیا اور قرض خواہوں نے ناک میں دم کر دیا تو پر نانی

کی طرف متوجہ ہوئے۔ پہلے تو کوٹھڑی کا کونا کونا چھان مارا۔ بڑھیا کا گڑ گودڑ دیکھ ڈالا۔ آخر جھک مار کر کہنا ہی پڑا کہ "نانی اماں! تمھارے داماد کی آبرو پر بن گئی ہے۔ مکان کی بات چیت ہورہی ہے۔ قبالہ دے دوگی تو جان بچ جائے گی ورنہ یہ زہر کھانے کو تیار بیٹھے ہیں" مگر بڑھیا ٹس سے مس نہ ہوئی اور ایسی انمل بے جوڑ باتیں کہیں کہ سمجھ میں نہیں آیا۔ غرض باولی ہوتی ہے۔ اب بڑی بی کی خاطریں ہونے لگیں۔ دونوں وقت آمنہ خود کھانا لے کر آتی اور جب تک بڑی بی کھاتیں وہ پاس بیٹھی ہوئی خوشامد کیا کرتی۔ آمنہ کے میاں بھی آتے جاتے مزاج پوچھتے اور دن میں ایک دو مرتبہ خوشامد سے قبالے کی بابت دریافت کرتے۔ پرنانی ٹھنڈے سانس بھرتیں اور کبھی کچھ کہہ دیتیں اور کبھی کچھ۔ اسی طرح کئی ہفتے گزر گئے ایک دن صبح کو آمنہ اور اس کا خاوند دونوں مل کر پرنانی کے پاس گئے اور حد سے زیادہ گڑگڑائے تو بڑھیا نے صرف اتنا کہا کہ جنھیں تم نے چینتھڑے جان کر پھینک دیا تھا وہ سب مکانوں کے قبالے تھے۔ ان ہی میں اس مکان کا کاغذ بھی تھا۔ وہ لا دو تو نکال دوں۔ ان باتوں سے دونوں میاں بیوی مایوس ہو گئے اور مطلب برآری کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

کاٹ کباڑ کی کوٹھڑی میں اتّفاق سے بلّی نے بچّے دیے۔ یہ سنتے ہی چنّو، منّو، کریما، سلّو وغیرہ سارے بچّے کوٹھڑی میں جا گھسے۔ بلّی کے بچّے کی تلاش میں جو لوٹی پھوٹی چیزوں کو اِدھر اُدھر کیا تو ایک کونے میں پرنانی کا تاریخی پنجر بھی دھرا ہوا تھا اور سب سے اُوپر اُن کی دلائی پڑی تھی۔ آمنہ کی چھوٹی لڑکی نصیرا کو اور بہن بھائیوں کے خلاف پرنانی سے قدرتی لگاؤ تھا۔ وہ دیکھا کرتی تھی کہ بڑی بی کو اپنی دُلائی کے جاتے رہنے کا بڑا رنج ہے۔ یہ دُلائی کو لے سیدھی پرنانی کے پاس پہنچی اور کہنے لگی "نانی اماں! آپ کی دُلائی مل گئی۔ نہ جانے کس نے پاخانے کے پاس کی کوٹھڑی میں ڈال دی تھی"، بڑھیا کے بدن میں دُلائی دیکھتے ہی جان سی آگئی۔ دُلائی کو کلیجے سے لگایا اور نصیرا کو لاکھوں دُعائیں دیں۔

دُلائی کے چھن جانے سے پرنانی کے بڑھاپے میں جو دیوانگی سی پیدا ہو گئی تھی، کم ہو چلی۔ اس کا کرب اور بے چینی سکون سے بدل گیا۔ اب وہ کبھی کبھی اپنی کوٹھڑی

سے سر باہر نکال کر جھانکتی اور اگر نصیرا اکیلی آجاتی تو اشارے سے اس کو اپنے پاس بُلالیتی اور دُلائی کو اپنے سامنے رکھ کر کہتی "بیٹی کہانی سنو گی؟ جگ بیتی نہیں آپ بیتی ہے۔ بیٹی یہ کپڑے کے ٹکڑے نہیں ہیں میرے کلیجے کے پرزے ہیں۔ تمھاری نانی نے سیے تھے۔ یہ کم خواب کی کترن بہادر شاہ کی کرتے ٹوپی میں سے بچی تھی۔ یہ مشروع کا ٹکڑا زینت محل کا پاجامہ تراشتے وقت نکلا تھا۔ یہ میرے سہاگ کے جوڑے کی چھٹن ہے۔ یہ عنابی اور اُودے زربفت کے ٹکڑے تمھاری بڑی نانی کے جہیز کی یادگار ہیں۔ بچاری بن بیاہی جنت کو سدھار گئیں۔ یہ جامے دار تمھاری اماں کے منجھلے ماموں کی اچکن میں سے بچی تھی جو اپنی جوانی کے اٹھارویں برس عید کے دن گھوڑے سے گر کر مجھ کو داغ دے گئے تھے۔ ہائے کیسا کڑیل جوان تھے سہرا باندھنا بھی نصیب نہ ہوا۔ اور یہ جو چوڑا چکلا پیازی رنگ کی دریائی کا ٹکڑا تم دیکھتی ہو......." بڑھیا ایک ہاتھ سے چھاتی پکڑ کر اور دوسرے ہاتھ سے آنسو پونچھتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ آمنہ نے چلا کر کہا۔ "اری او نصیرا۔ مُردار چھمی کا منہ دھلاتے دھلاتے کہاں مر گئی۔ جب دیکھو بڑھیا کے کلیجے میں گھسی بیٹھی رہتی ہے۔ ناشدنی، دیوانی کے پاس بیٹھتے بیٹھتے، دیوانی ہو جائے گی۔"

پر نانی کی الف لیلہ، آمنہ کی کڑوی آواز نصیرا کے یکایک اُٹھ کر چلے جانے سے بدمزہ ہونی چاہیے تھی، مگر نہیں اس کا حافظہ تنہائی پاکر اور تیز ہو گیا۔ گویائی بھی تصورات میں محو ہو گئی۔ اب اس کی آنکھیں تو دُلائی کے پیازی رنگ کے ٹکڑے پر تھیں اور دماغ ستّو برس پہلے کا تیار کیا ہوا فلم خیال کے پردے پر اس طرح چل رہا تھا کہ گویا اس کی یہ اندھیری کوٹھڑی نئی روشنی کا سینما حال ہے۔ ایک نوجوان اپنی مردانہ کیفیات سے سرشار ایک پیکر رعنائی کے سامنے بیٹھا ہوا سہرے اور گھونگھٹ کی آڑ میں آرسی مصحف کی رسم ادا کر رہا ہے۔ شوق وارمان کے سبز باغ لہلہا رہے ہیں۔ پھر گھونگھٹ اٹھتا ہے۔ سہرے کے پھول کھلتے ہیں۔ گود بھری جاتی ہے۔ معصومیت کا فرشتہ زندگی میں محبت کی تازہ رُوح پھونکتا ہے۔ شباب کے جذبات آہستہ آہستہ ازدواجی حقیقت اختیار کرتے ہیں۔ موانست پر موافقت کا رنگ چڑھنا شروع ہوتا ہے۔ دُولھا کے چُلبلے چہرے میں سنجیدگی

پیدا ہو جاتی ہے۔ حُسن کا خریدار باطنی جمال کا شیدا ہو کر ہمیشہ کے واسطے بک جاتا ہے اور اپنی تمام منقولہ وغیر منقولہ جایداد اپنی شریکِ حیات کے نام جس پر پہلے آنکھیں نثار تھیں اور اب دل بھی قربان ہو چکا ہے، منتقل کر دیتا ہے۔ عرصہ گزر جاتا ہے۔ پھلے پھولے باغ میں خزاں آنی شروع ہوتی ہے۔ پھول کُملاتے لگتے ہیں۔ دُنیا کا ہر درخت خزاں کے بعد بہار کی اُمید رکھتا ہے۔ لیکن زندگی کے پودے کے لیے "اوّل ہی کا جھونکا ہے بہار آخر، نہ آنسوؤں کی آبیاری کام آتی ہے نہ ٹھنڈے سانسوں کی ہوا۔ سُہاگن دُلھن رنڈسالہ پہنے بیٹھی ہے۔ شوہر کی دی ہوئی جایداد کا ہبہ نامہ سامنے پڑا ہے۔ ہزار جانے کی دُلائی سی جا رہی ہے۔ کچھ خیال آتا ہے۔ اُٹھتی ہے گٹھڑی میں سے ایک پیازی رنگ کا پھٹا ہوا انگرکھا نکالتی ہے۔ اس کے پہننے والی کی جوانی نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ دامن تراش کر ایک مربع ٹکڑا نکالتی ہے اور اپنی محبت کی یادگار (ہبہ نامہ) کو دُلائی کے سینے میں دفن کرکے اس ٹکڑے کو ٹانک دیتی ہے۔

بڑی بی کے خیالات کا سیریل یہیں تک پہنچا تھا کہ آمنہ اپنے شوہر کے ساتھ اس کے پاس آئی۔ اپنے حالات سے پراگندہ ہو کر انھوں نے ایک دفعہ اور قبالے کی بابت دریافت کرنا چاہا۔ بڑی بی کی پُرامن زندگی اور نصیرا سے گھل مل کر باتیں کرتے دیکھ کر وہ سمجھے تھے کہ اب بُڑھیا ہوش کی باتیں کرنے لگی ہے۔ تقدیر سیدھی ہے تو دولت کے خزانے کی کنجی بتا دے گی۔ یہاں آکر جو دیکھا تو بڑی بی دیوار کی طرف ٹکٹکی لگائے کبھی بسورتی ہیں اور کبھی مسکراتی ہیں۔ گدڑی کو چھاتی سے لگا رکھا ہے۔ آمنہ حیران ہے کہ میں نے تو اسے اُپلوں کی کوٹھڑی میں ڈلوا دیا تھا یہاں کیوں کر آگئی۔ مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے بولی: "نانی اماں! پھر تم اس منحوس دُلائی کو سنگوا بیٹھیں۔ ایسے کیا اس میں لعل جڑے ہوئے ہیں جو کسی آن چھوڑتی ہی نہیں۔ دیکھو تو سہی موئی میں کیسی سڑی ہوئی بُو آ رہی ہے۔ نصیرا جا، الگنی پر سے ساٹن کی دُلائی اُتار لا اور نانی اماں کو اُڑھا دے۔ نصیرا دوڑ کر ساٹن کی دُلائی لے آئی۔ آمنہ نے یہ دُلائی بُڑھیا کو اڑھا کر اس کی گدڑی چھین لی اور نصیرا کو دے کر کہا۔ جا اُسے کوڑے پر ڈال دے حلال خور کی لے جائے گی۔ دو چار منٹ تو پیرنانی اس آفتِ ناگہانی کا مقابلہ کر سکیں۔ نصیرا کی طرف ہاتھ

بڑھیا نے چُپ چاپ دیکھتی رہیں ۔ پھر ایک ٹھنڈا سانس لے کر کہا " بیٹی میری جان نہ نکال ۔ اس میں میرے بہت سے پھولوں کی بُو بسی ہوئی ہے ۔ جیتے جی اس کو مجھ سے نہ چھینو ۔ صبح کا چراغ ہوں، پھونک مار کر کیوں بجھاتے ہو، خود بجھ جائے گا " یہ ایسی باتیں تھیں کہ آمنہ سی سنگ دل کے بھی آنسو نکل پڑے اور احمد مرزا جیسا مطلب کا بندہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ آمنہ نے نانی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں خون میں اُبال آیا ۔ آنکھوں نے سچی محبت کا اظہار کیا اور بھرے دل کو ضبط کر کے بولی " نانی اماں ۔ میں نے آج تک جو تمھاری خطائیں کی ہیں، اپنی بیٹی رقیہ کے صدقے میں معاف کر دو ۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تمھارے ساتھ اچھے سلوک نہیں کیے ۔ میں تم سے قبالہ کبھی نہیں مانگوں گی ۔ تم کڑھو نہیں " دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ۔ آنسو اگر جھوٹے نہ ہوں تو بڑی قیمت رکھتے ہیں ۔ بڑی بی کو معلوم ہوا کہ اس کی دنیا بدل گئی ہے ۔ اس کو آمنہ میں جنّت کی حور نظر آئی اور اُس نے اپنے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی بلائیں لیں گلے لگایا اور پیار کیا ۔ یہ منظر دیکھ کر احمد مرزا بھی ننھیا ساس کے قدموں پر گر پڑے اور اپنی خطاؤں کا اعتراف کیا ۔ بڑی بی نے انھیں بھی دُعائیں دیں ۔

نصیرا نے اپنی زندگی میں یہ نیا تماشا دیکھا ۔ وہ کبھی دوسروں کو روتا دیکھ کر رونکھی صورت بنا لیتی تھی ۔ کبھی بے چین ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی تھی ۔ جب ندامت اور خوشامد گلے مل چکیں اور نصیرا نے اپنی اماں کو یہ کہتے ہوئے کہ " نانی اماں ! اب تو آپ ناراض نہیں ۔ کھاؤ میری جان کی قسم اور پر نانی کا یہ جواب کہ " نہیں آمنہ ۔ تیری جان کی قسم میں تم سب سے خوش ہوں ۔ میرا تمھارے سوا ہے کون " نصیرا اپنی اماں سے پوچھنے لگی کہ " اماں ! نانی کو ڈلائی دے دوں ۔ اب تو ملاپ ہو گیا " ماں نے بیٹی کی طرف اور نانی نے نواسی کی جانب ایک عجب انداز سے دیکھا ۔ آمنہ نے نصیرا سے تو کچھ کہا نہیں ۔ نانی سے بولی ۔ " نانی اماں جانے بھی دو اس گودڑ کا کیا کرو گی ۔ "

" نہیں بیٹی رہنے دو ۔ تمھاری ماں کی یادگار ہے " بڑھیا نے کہا اور نصیرا پر نظر ڈالی ۔ نصیرا دلائی کو دبوچ کر بولی " اب میری باری ہے بڑے پیاز کی ٹکڑے کی کہانی پہلے سُنا دو پھر دوں گی ۔

بڑھیا کی ساری افسردگی دور ہو گئی تھی ۔ اس کا خیال بدل چکا تھا ۔ وہ مرنے سے

پہلے مکان کا بوجھ بھی اپنی چھاتی پر سے ہٹانا چاہتی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ آمنہ اور اس کا فضول خرچ شوہر اب سنبھل جائے گا۔ اس لیے اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "لاؤ دُلائی میرے سامنے رکھو۔ میں اس بڑے ٹکڑا کا بھی قصہ سُنا دوں، اور دُلائی لے کر بڑے ٹکڑے کو اُدھیڑتے ہوئے کہا۔ بچو! یہ ہزار جامے کی دُلائی نہیں ہے بلکہ ہزار داستان ہے (پیازی رنگ کے ٹکڑے کو الگ کر کے ہبہ نامہ ہاتھ میں لے کر) یہ اس کی قبر تھی۔ لو نانی صدقے اور نانی کا مکان تم پر صدقے لیکن دوسری جایداد کی طرح اس کی بربادی کے پیچھے نہ پڑنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سر چھپانے کا یہ جھونپڑا اور روٹی کھانے کا سہارا بھی جائے۔ اللہ تم کو اس میں آباد رکھے اور تم اپنے بچوں کا سُکھ دیکھو!

بابو مٹکینا

بابو مٹکینا اب تو جتنے مرزا پھویا سڑی سودائی کہلائیں اور اپنی بدمزاجی سے تکلیفیں اٹھائیں کم ہے۔ اس لیے کہ برسوں سے بیمار؛ بیماری بھی ایک نہیں۔ تھم گئے دست تو بخار آیا۔ طرہ یہ کہ مفلس۔ کوڑی کوڑی کو محتاج۔ دوستوں کی فیاضیوں پہ گزارہ۔ نہ موت نہ زندگی کے آثار۔ ہاتھ پاؤں نہ چلیں زبان چلے جاتی ہے۔ ہم نے ان کا لڑکپن بھی دیکھا۔ جوانی بھی دیکھی اور اب تیسرا برن بڑھاپا بُرا آیا بھی دیکھ رہے ہیں۔ یاروں میں انھیں سدا چھوئی موئی کا درخت ہی پایا۔ جہاں کوئی دل لگی میں ذرا آزاد ہوا اور ان کی تیوری پر بل پڑے۔ اسکول کا زمانہ کیا آپس میں گھس مل کر بستر ہوتا ہے۔ نہ کھانے پینے میں پرہیز نہ اٹھنے بیٹھنے میں اونچے نیچے کا خیال۔ جس کو دیکھو شرارت کا پُتلا۔ ایک دونا لیے کچھ کھا رہا ہے دوسرے نے ہاتھ مار دیا۔ تیسرا اُچکا کر لے گیا۔ پیاؤ پر کوئی پانی پینے کھڑا ہوا۔ دھکا پیلی شروع ہوگئی۔ لڑکوں کا شیطانی لشکر خدا کی پناہ۔ بابو مٹکینا اُس وقت چڑ چڑاتے رہتے۔ اوک سے پانی پینا ان کے نزدیک بدتمیزی تھی۔ ایک دن گرمی کا موسم تھا پیاس لگی۔ آخر برت سے تو تھے نہیں۔ سوفتہ دیکھ کر پیاؤ پر پہنچے۔ پیاؤ والے بامن کو ہنسی سوجھی یا کیا ہوا اُس کے ہاتھ سے لُٹیا چھوٹ گئی۔ بابو صاحب چھینم چھینٹ۔ بہت بگڑے اور جھٹ ہیڈ ماسٹر صاحب سے جا شکایت کی۔ کہیں ان کے مُنہ سے نکل گیا کہ اگر تم کو اوک سے پانی پینا نہیں آتا تو مٹکینا اپنے ہاتھ میں رکھا کرو۔ ان کے دل کو لگ گئی

اور یہ اپنی جیب میں ایک دو مٹکینے ضرور رکھتے۔ اس دن سے یہ بابو مٹکینا مشہور ہوئے اور ایسے مشہور ہوئے کہ آج پنڈت مکٹ بہاری لال ان کا اصلی نام لو تو لوگ بوجھتے بوجھتے تھک جائیں اور اتا پتا ہی نہ لگے۔ بابو مٹکینا کہہ کر دیکھ لو راہ چلتا بھی بتادے گا کہ وہی نا جو خدا کے فالتو بندوں میں ہیں۔ منڈ چڑوں کی وضع کے۔ جن کے ہُنکارے کی آواز دُور سے سُنائی دیتی ہے۔

آپ فٹ بال بھی کھیلتے تھے۔ دم درود واجبی تھا۔ آواز البتہ کراری تھی۔ دور ہی دُور سے پھُدکتے۔ گیند سے دو گز آگے یا چار گز پیچھے۔ جہاں کوئی پُش کرنے آیا اور اُنھوں نے ڈانٹا "قانون سے" چنانچہ کھیل کے میدان میں جو اُنھیں پکارتا قانون سے کہہ کر پکارتا۔ کبھی گر جاتے تو بغیر اٹھائے نہ اُٹھتے اور دنوں اس کا رونا روتے رہتے۔ اپنے ہمجولیوں پر حکومت کرنے سے بہت خوش ہوتے۔ کیا مجال کہ ان کی طرف دیکھ کر کوئی ہنسے یا بات کرے۔ کسی نے کھُسر پھُسر کی اور ان کا پارا چڑھا۔ کہیں اشارے بازی ہو یہ اپنی جانب منسوب کر لیتے۔ خفگی ناک پر دھری رہتی۔ آج اس سے ناراض تو کل اس پر۔ لال پیلے ہو رہے ہیں۔ زمانہ اچھا تھا۔ سب شریفوں کے بچے ہوتے تھے۔ گھڑی بھر کو بگڑے پھر ایک۔ ان میں کون سی سرخاب کی دُم لگی ہوئی تھی۔ لیکن کسی نے ان کے نکتوڑوں کا جواب نہیں دیا۔ اپنی جھنک میں یہ کسی کو اول فول بھی بک دیتے تو بات مذاق میں ٹل جاتی۔ کیوں؟ اس لیے کہ پنڈت میں نرالی طبیعت اور چڑچڑے مزاج کے سوا دوسرا کوئی عیب نہ تھا۔ سب کے لیے ان کے دل میں ہمدردی تھی۔

اسکول سے نکل کر ضرورت پیش آئی کہ ملازمت کریں۔ اتفاق سے فوراً ہی ملازمت مل گئی اور ایسی جگہ جسے دنیا کی جنت کہتے ہیں یعنی کشمیر میں۔ تنخواہ بھی معقول۔ اِدھر جوانی میں سب پر رُوپ ہوتا ہے اور رُوپ کے ساتھ ولولے بھی۔ مٹکینے میں سمائی نہ تھی، اُبل پڑے۔ کمزور دودھ میں جھاگوں کے سوا ہوتا کیا ہے۔ چار دن میں بجھ کر رہ گئے۔ دو برس کے بعد وطن آئے تو جھلنگا بنے ہوئے۔ پہاڑی پیچش نے ہینگ ہگوادی۔ آنتوں میں زخم۔ جگر خراب مکڑ کی صورت لیکن زندگی تھی۔ زندگی کیا پیسا تھا۔ رہنے کو گھر۔ خدمت کے لیے عزیز و اقارب۔ حکیم ڈاکٹر آموجود ہوئے۔ ڈگری تو خیر گئی ہاں مرنے سے

بچ گئے۔

بن آئی کون مرتا ہے۔ دوا درمن نہ بھی ہوتی تو کیا مرتے انھیں تو دوسروں کی چھاتی پر اپنی کھٹیا رکھ کر کو نتھنا تھا۔ کئی مہینے کے لگاتار علاج سے جی اٹھے مگر زندگی اجیرن ہوگئی۔ دو دن ذرا ٹھیک رہے تو دو مہینے پلنگ پر سوار۔ برسوں موت وحیات کی درمیانی فضا میں جھولا جھولا کیے۔ ہائے ہائے کی ایسی عادت پڑی کہ تولہ بھر دُکھ ہوتا تو دو تولے کیا دو سیر بتاتے۔ جو ملتا اس کی نہ سنتے اپنا ہی دُکھڑا روتے گو یا ساری دنیا ان کی بیماری کی ذمہ دار ہے۔ دراصل بات یہ تھی کہ جوں جوں دن گزرتے تھے پیسے کا توڑا ہوتا جاتا تھا۔ نقدی ختم ہونے کے بعد گھر کے اثاثہ کا لگا لگا پڑا۔ نے دوستوں میں بعض نے انھیں اسامی بنایا۔ آخر مجرم ہو کر رہ گئے۔ شکایتوں کے سوا کچھ نہ رہا۔ مگر ان کی اس تکلیف دہ عادت کے باوجود کچھ احباب ایسے ہیں جو ان کی خبر گیری میں کوتاہی نہیں کرتے۔

اتفاق کی بات مجھے ایک معاملے میں بابو مٹکینا کی ضرورت پڑی۔ اپنی غرض تھی ان کے گھر پہنچا اور کنڈی کھٹکھٹائی تو بڑی کراری آواز میں پوچھا کون؟ میں دانستہ خاموش رہا۔ جھلا کر بولے "بس اب گونگے ہو گئے۔ زبان بند ہو گئی۔ ارے میاں کون ہو؟ اندر آجاؤ۔ میں مردہ ہوں باہر نہیں آسکتا؟

میں : پردہ ہے آجاؤں؟

بابو : کہہ تو رہا ہوں اور کیوں کر کہوں۔ نقارے بجاؤں۔ ہرکارے دوڑاؤں۔

میں : (ذرا شرارت سے) زنانہ تو نہیں؟

بابو : (سخت لہجہ میں) بہرے ہو۔ میں دیوانہ ہوں کہ زنانے میں بلالوں گا۔

میں اندر داخل ہوا تو وہ کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔ ابے آخر یہ کیا حرکت تھی۔ مرتے کو ماریں شاہ مدار۔ مجھ میں چیخنے کا دم کہاں۔ تیرا بے تُکا پن نہیں گیا۔

میں : بھئی بیمار تو واقعی معلوم ہوتے ہو مگر آواز ابھی تک کراری ہے۔

بابو : تمھاری خوشی ہے کہ آواز بھی نہ نکلے۔ گلا گھونٹ دے۔ اچھا آج کیا جاتی دنیا دیکھی جو ادھر آنکلا۔

میں : پوچھنے آیا ہوں کہ مرگھٹ کب تک جانے کا ارادہ ہے؟

بابو : لعنت ہے تجھ پر!

میں : اچھا دل لگی تو ہو چلی۔ اب یہ بتاؤ کہ حال کیا ہے؟

حال کیا پوچھا۔ شہد کی مکھیوں کو چھیڑ دیا۔ اب جو بھنبھناہٹ شروع ہوئی تو ختم ہونے پر نہیں آئی۔ کنبے کی بُرائی ملنے والوں کا شکوہ۔ مفلسی کی داستان۔ بیماری کا رتی سے رائی تک حال کہ نبض کی رفتار یہ ہے۔ ریاحیں ایسی آتی ہیں۔ صبح سے سنتے سنتے دوپہر آ گئی تو میں نے کہا۔ کہیں ڈاکٹر نہ چلا جائے۔ مجھے نسخہ دو میں تمھیں دوا تو لا دوں۔ بابو مٹکینا نے فل اسکیپ کا پورا ایک شیٹ اپنے حال کا لکھا اور اس کے ساتھ اپنا نسخہ دیا۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا حال سنایا۔ دوائی لی۔ اور واپس آکر شیشی حوالے کر فوراً چلا آیا۔

سچ ہے کہ ان کی مصیبت کسی کے بس کی نہیں۔ لیکن جیسی پڑے اٹھائیں۔ ان کی زندگی کا درخت خشک ہو چکا ہے۔ پھل پھول دینے سے رہا۔ پھر آخر کس امید پر کوئی ان کے نخرے اٹھائے۔ رہی خدا ترسی وہ اپنے بُرے برتاؤ سے کم کرتے چلے جاتے ہیں نتیجہ دیکھ لیجیے۔ دوست آنکھیں چرانے لگے۔ میری تو خدا سے دُعا ہے کہ وہ ان کا پردہ ڈھک لے۔

ختم شد